کنز الراغبین
فی
حل تفسیر الجلالین
سورۂ بقرہ
جلد اوّل
تی محمد شاہد علی مصباحی
القضا المرکز الاسلامی دار الفکر، بہرائچ شریف (یوپی)
شعبۂ نشر و اشاعت المرکز الاسلامی دار الفکر، بہرائچ شریف یوپی

کنز الدارین

فی

حل تفسیر الجلالین

سورۂ بقرہ

جلد اوّل

مفتی محمد شاہد علی مصباحی
دار القضا المرکز الاسلامی دار الفکر، بہرائچ شریف (یوپی)

شعبۂ نشر و اشاعت المرکز الاسلامی دار الفکر، بہرائچ شریف یوپی

[سُورَةُ الْبَقَرَةِ مَدَنِيَّةٌ مِائَتَانِ وَ سِتٌّ اَوْ سَبْعٌ وَ ثَمَانُوْنَ اٰيَةً]

سورۂ بقرہ مدنی ہے جس میں دوسو چھیاسی یا دوسو ستاسی آیات ہیں۔

﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ ﴿الٓمّٓ﴾ اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِمُرَادِهٖ بِذٰلِكَ ﴿ذٰلِكَ﴾ اَیْ هٰذَا ﴿الْكِتٰبُ﴾ الَّذِیْ يَقْرَؤُهٗ مُحَمَّدٌ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ﴿لَا رَيْبَ﴾ شَكَّ ﴿فِيْهِ﴾ اَنَّهٗ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَجُمْلَةُ النَّفْیِ خَبَرٌ مُبْتَدَأُهٗ ذٰلِكَ وَ الْاِشَارَةُ بِهٖ لِلتَّعْظِيْمِ۔

ترجمہ: ﴿اللہ کے نام سے شروع جو بہت مہربان رحمت والا ہے﴾ (الٓمّٓ) اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے اس (الٓمّٓ) سے اپنی مراد کو ﴿وہ﴾ یعنی یہ ﴿ذیشان کتاب﴾ جس کو محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تلاوت فرماتے ہیں۔ ﴿اس میں ذرا بھی شک نہیں﴾ کہ وہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے اور جملۂ نفی (لا ریب فیہ) خبر ہے جس کا مبتدا (ذلک) ہے اور اس کے ذریعہ اشارہ تعظیم کے لئے ہے۔

توضیح و تشریح: قولہ اللّٰہ اعلم الخ اس تفسیر سے حضرت مفسر قدس سرہ نے مقطعات کے علم سے متعلق شوافع کے معتمد قول کی طرف اشارہ کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ مقطعات کا حقیقی اور یقینی علم اللہ تعالیٰ کو ہے۔ البتہ علماء راسخین کو بھی مقطعات کا علم حاصل ہے مگر بطور ظن جیسا کہ تلویح وغیرہ کتب شافعیہ میں یہ تصریح موجود ہے کہ متشابہات کے متعلق شوافع اور احناف کے درمیان نزاع لفظی ہے، احناف کا نظریہ ہے کہ راسخین فی العلم متشابہات کی تاویل یقینی طور پہ نہیں جانتے، یعنی احناف مطلق علم کی نفی نہیں کرتے، اور شوافع کہتے ہیں کہ راسخین متشابہات کی تاویل جانتے ہیں مگر بطور ظن نہ کہ یقینی طور پہ۔

گویا مفسر علام نے اپنی تفسیر اللہ اعلم الخ سے مقطعات کے علم یقینی کو اللہ عزوجل کے سپرد کیا ہے، لہذا یہاں یہ اعتراض نہیں کیا جا سکتا کہ مفسر علیہ الرحمہ شافعی ہیں اور شوافع کے نزدیک مقطعات کا علم علمائے راسخین کو حاصل ہے پھر یہاں مقطعات کے علم کو خدا کے سپرد کیوں کیا۔

خیال رہے کہ یہاں تفسیری عبارت "اللّٰہ اعلم" پر ایک اشکال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ لفظ اعلم اسم تفضیل ہے جو مفضل اور مفضل علیہ چاہتا ہے، یہاں مفضل تو موجود ہے مگر مفضل علیہ نہیں، نیز اسم تفضیل کے استعمال کے تین طریقے ہیں یا تو اس کا استعمال مـن کے ساتھ ہو یا "ال" کے ساتھ یا اضافت کے ساتھ یہاں مذکورہ طریقوں میں سے کوئی بھی نہیں حالانکہ اسم تفضیل کا ان طریقوں سے خالی ہونا جائز نہیں، جیسا کہ کتب نحو میں اس کی تصریح موجود ہے۔

جواب یہ ہے کہ اسم تفضیل میں کبھی معنی تفضیل ملحوظ نہیں ہوتا ہے اور اس وقت اسم تفضیل کا استعمال کے تینوں طریقوں سے خالی ہونا بھی جائز ہے جیسے قرآن پاک میں مطلقہ کے بارے میں ارشاد ہے "وَ بُعُولَتُهُنَّ أَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ" یہاں چونکہ معنی تفضیل ملحوظ نہیں کہ غیر زوج کو مطلقاً حق حاصل نہیں۔ لہذا یہاں مفضل بغیر مفضل علیہ کے استعمال ہوا اور اسم

تفصیل کے استعمال کے جو تین طریقے ہیں ان میں سے یہاں کوئی نہیں، اسی پر مفسر کے قول "اللہ اعلم" کو قیاس کیا جائے۔

قولہ ھذا۔ ذلک اسم اشارہ ہے جو عام طور پہ اس مشار الیہ کے لئے استعمال ہوتا ہے جو دور ہو لیکن کبھی اس کا استعمال ایسے مشار الیہ کے لئے بھی ہوتا ہے جو حسًا تو نزدیک ہو لیکن اپنی شان اور رتبہ کے اعتبار سے بہت بلند اور دسترس سے دور ہو گویا بُعد رتبی کو بُعد مکانی کی منزل میں اتار کر مشار الیہ قریب کے لئے اسم اشارہ ذلک استعمال کیا جاتا ہے جو موضوع ہے بعید کے لئے، تو چونکہ قرآن پاک حسًا قریب ہے مگر عظمت و شان کے لحاظ سے گویا دسترس سے دور ہے اس لئے اس کی طرف اشارہ کے لئے ہذا کی بجائے ذلک فرمایا۔

قولہ اَنَّہٗ مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ۔ یہ عبارت ایک سوال مقدر کا جواب ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ ذٰلِکَ الْکِتَابُ میں "اَلْکِتَابُ" مفرد ہے اور مفرد میں شک کا احتمال نہیں رہتا کیونکہ شک، ظن اور علم کا تعلق قضیہ سے ہوتا ہے پھر لا ریب فیہ کا کیا مطلب؟ جواب کا حاصل یہ ہے کہ یہاں الکتاب مفرد نہیں بلکہ قضیہ ہے اور تقدیری عبارت یوں ہے۔ "ذلک الکتاب من عند اللہ" لہٰذا کفار کے لئے اس میں شک کی گنجائش ہے (ترویح الارواح)

قولہ و جملۃ النفی یہ ترکیب نحوی کی طرف اشارہ ہے یعنی ذلک الکتاب اسم اشارہ مشار الیہ سے مل کر مبتداء ہے اور لا ریب فیہ پورا جملہ خبر ہے۔

فوائد:۔ (۱) تسمیہ یعنی بسم اللہ الرحمٰن الرحیم قرآن پاک کی آیت ہے مگر ہمارے نزدیک سورۂ فاتحہ یا کسی اور سورہ کا جز نہیں۔ (تفسیر خزائن العرفان)

(۲) الٓمّٓ اور اس جیسے وہ کلمات جو سورتوں کی ابتدا میں آتے ہیں مثلاً حٰمٓ، الٓرٰ وغیرہا، چونکہ علٰیحدہ علٰیحدہ پڑھے جاتے ہیں اس لئے انہیں حروف مقطعات کہتے ہیں یعنی الگ الگ پڑھے جانے والے حروف۔

(۳) متشابہ آیات کی دو قسم ہے پہلی قسم میں وہ آیات ہیں جن سے نہ مراد متکلم سمجھ میں آتی ہے نہ ان کا لغوی اور ظاہری معنی ہی متعین ہوتا ہے، ان کی مراد اللہ و رسول جل جلالہ و صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے سوا کوئی نہیں جانتا جیسے الٓمّٓ وغیرہ، اور دوسری قسم ان آیات کی ہے جن کا لغوی معنی تو معلوم ہے مگر متکلم کی حقیقی مراد معلوم نہیں جیسے الرحمن علی العرش استوٰی، ید اللہ فوق ایدیھم وغیرھما.

احناف کے نزدیک متشابہات کے متعلق قول راجح

آیات متشابہات کے علم سے متعلق علما کے مختلف اقوال ہیں آیا کہ ان کا علم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کو ہے یا نہیں، شوافع کے نزدیک اللہ تعالیٰ اور حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے علاوہ علما راسخین کو بھی متشابہات کا علم ہے، جیسا کہ علامہ نووی شافعی لکھتے ہیں:

"صحیح یہ ہے کہ علما راسخین کو آیات متشابہات کا علم ہے کیونکہ یہ بات بعید ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے

ایسے کلام کے ساتھ کلام کرے جس کا کسی کو علم نہ ہو اور ہمارے اصحاب (شافعیہ) اور دیگر محققین کا اس پر اتفاق ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کلام غیر مفید کے ساتھ کلام کرنا محال ہے۔'' (شرح مسلم للنووی جلد ۲، ص ۳۳۹، مکتبہ اشرفیہ دیوبند)

مگر علمائے احناف کے نزدیک راجح قول یہ ہے کہ متشابہات کا علم دنیا میں اللہ تعالیٰ اور حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے سوا کسی اور کو نہیں، ہمارے لئے صرف اس قدر لازم ہے کہ ہم یہ اعتقاد رکھیں کہ اس سے اللہ جل شانہ کی جو بھی مراد ہو برحق ہے۔ علامہ آلوسی حنفی اسی بحث میں تحریر فرماتے ہیں:

''جو لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ متشابہات کا علم صرف اللہ کو ہے وہ شاید اس کا انکار نہیں کریں گے کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو وحی کے ذریعہ متشابہات کی تعلیم دی گئی ہے۔'' (روح المعانی)

حضرت ملاجیون قدس سرہ لکھتے ہیں:

و حکمه اعتقادان المراد به حق و ان لم نعلمه قبل یوم القیمة و اما بعد القیامة فیصیر مکشوفا لکل احد ان شاء الله و هذا فی حق الامة و اما فی حق النبی علیه السلام فکان معلوما والا تبطل فائدة التخاطب و یصیر التخاطب بالمهمل کالتکلم بالزنجی مع العربی. (نورالانوار ص ۹۷ مطبع فاروقیہ بکڈپو، دہلی)

اور اس (متشابہ) کا حکم یہ اعتقاد رکھنا ہے کہ اس کی مراد حق ہے اگرچہ ہمیں اس کی مراد قیامت سے پہلے معلوم نہیں ہوگی، البتہ قیامت کے بعد اس کی مراد ہر شخص پر منکشف ہو جائے گی اور یہ امت کے حق میں ہے لیکن حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو اس کی مراد دنیا میں معلوم ہے ورنہ تخاطب کا فائدہ باطل ہو جائے گا۔ اور یہ تخاطب ایسے ہی بے معنی ہو جائے گا جیسے عربی شخص جبشی سے عربی میں بات کرے۔

صدر الافاضل علامہ نعیم الدین مراد آبادی اسی بحث میں تحریر فرماتے ہیں:

الٓمّ سورتوں کے اول جو حروف مقطعہ آتے ہیں ان کی نسبت قول راجح یہی ہے کہ وہ اسرار الٰہی اور متشابہات سے ہیں۔ ان کی مراد اللہ اور رسول جانیں ہم اس کے حق ہونے پر ایمان لاتے ہیں۔ (خزائن العرفان)

﴿هُدًى﴾ خَبَرٌ ثَانٍ اَیْ هَادٍ ﴿لِلْمُتَّقِیْنَ﴾ اَلصَّائِرِیْنَ اِلَی التَّقْوٰی بِامْتِثَالِ الْاَوَامِرِ وَ اجْتِنَابِ النَّوَاهِیْ لِاتِّقَائِهِمْ بِذٰلِكَ النَّارِ ﴿اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ﴾ یُصَدِّقُوْنَ ﴿بِالْغَیْبِ﴾ بِمَا غَابَ عَنْهُمْ مِنَ الْبَعْثِ وَ الْجَنَّةِ وَ النَّارِ ﴿وَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوةَ﴾ اَیْ یَاْتُوْنَ بِهَا بِحُقُوْقِهَا ﴿وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ﴾ اَعْطَیْنَاهُمْ ﴿یُنْفِقُوْنَ﴾ فِیْ طَاعَةِ اللهِ.

ترجمہ: ﴿ہدایت ہے﴾ ھدیٰ خبر ثانی ہے ھاد کے معنی میں ﴿ان پرہیزگاروں کے لئے﴾ یعنی جو تقویٰ کی طرف پلٹنے والے ہیں اوامر پر عمل پیرا ہو کر اور نواہی سے پرہیز کر کے کیونکہ وہ اسی وجہ سے جہنم سے بچتے ہیں۔ ﴿جو غیب پر ایمان لائیں﴾ تصدیق کریں ان چیزوں کی جو ان سے پوشیدہ ہیں مثلاً قیامت، جنت اور دوزخ ﴿اور نماز قائم رکھیں﴾ یعنی

اس کے حقوق کے ساتھ اسے ادا کریں ﴾اور ہماری دی ہوئی روزی میں سے خرچ کریں﴿ ہماری فرماں برداری میں

توضیح و تشریح: قوله هاد یہاں هدیً بمعنی هاد ہے تاکہ مصدر کا حمل ذات پر ہونے کا اعتراض نہ ہو، اور دوسرا جواب یہ ہو سکتا ہے کہ قرآن مجید کو "ھُدیً" کہنا بطور مبالغہ ہے کہ مبالغہ کے طور پہ مصدر کا حمل ذات پر صحیح ہے۔ جیسے زید عدل، ترکیب میں هدیً للمتقین خبر ثانی ہے ذلك الكتاب کی۔

قوله، الصائرين الى التقوى الخ یہ ایک شبہ کا جواب ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ یہاں فرمایا جا رہا ہے کہ قرآن متقیوں کے لئے ہدایت ہے اور یہ تحصیل حاصل ہے کیونکہ ہدایت کی ضرورت اسے ہوتی ہے جو متقی نہیں اور جو پہلے سے ہدایت یافتہ ہو اس کے لئے ہدایت کا کیا معنی؟ جواب کا ماحصل یہ ہے کہ یہاں مایؤول کے اعتبار سے راہ ہدایت اختیار کرنے والے کو مجازاً متقی کہا گیا ہے جیسے طالب علم کو عالم اور سفر حج پر جانے والے کو مجازاً حاجی کہا جاتا ہے۔ و لا حرج فيه (صاوی ملخصاً)

قولـه بامتثال الاوامر الخ یہ تقویٰ الخواص کی طرف اشارہ ہے چونکہ تقویٰ کے تین درجات ہیں۔ (۱) کفر و شرک سے بچنا، یہ عوام کا تقویٰ ہے (۲) اوامر پر عمل کرنا اور نواہی یعنی صغیرہ و کبیرہ گناہوں سے بچنا، یہ خواص کا تقویٰ کہلاتا ہے۔ (۳) جمیع خطرات و خیالات سے آئینۂ دل کو صاف کر کے ہمہ تن جمال جہاں آرا میں محو اور مشغول ہو جانا، یہ اخص الخواص کا تقویٰ ہے، حضرت مفسر نے بامتثال الخ سے اشارہ فرمایا کہ یہاں آیت میں دوسرے درجہ کا تقویٰ مراد ہے۔

(تفسیر حقانی و صاوی)

قولـه لاتـقـائهم بذلك النار یہاں سے حضرت مفسر نے متقی کی وجہ تسمیہ کی طرف اشارہ کیا ہے، معنی لغوی سے مناسبت اس طرح ہو جاتی ہے کہ متقی کا لفظ "وقایۃ" سے بنا ہے اور وقایہ کا معنی ہے "حفظ الشئ مما يؤذيه و يضره" کسی بھی شی کی حفاظت کرنا اس چیز سے جو اس شی کو ایذا دے اور نقصان پہنچائے۔ تو چونکہ اہل تقویٰ اوامر پر عمل کر کے اور نواہی سے پرہیز کر کے خود کو جہنم سے محفوظ کر لیتے ہیں اس لئے انہیں متقی کہا جاتا ہے۔ آگے لفظ یصدقون سے حضرت مفسر نے یہ واضح کیا ہے کہ مومن ہونے کے لئے محض اقرار باللسان کافی نہیں ہے کہ زبانی اقرار تو منافقین کو بھی تھا بلکہ ایمان کے لئے اقرار باللسان کے ساتھ تصدیق بالقلب بھی ضروری ہے کہ اس کے بغیر کوئی شخص مومن ہی نہیں ہو سکتا۔

قولـه بما غاب عنهم الخ اس میں یہ اشارہ ہے کہ آیت میں موجود لفظ غیب اسم فاعل کے معنی میں ہے۔ پھر غیب کی دو قسمیں ہیں، ایک وہ غیب ہے جس پر کوئی دلیل قائم نہ ہو، جیسے موت کا وقت، بارش کا وقت، ماں کے پیٹ مین موجود بچے کی تحقیق، یہ چیزیں دلائل سے معلوم نہیں ہو سکتیں۔ دوسرا وہ غیب جس پر دلیل قائم ہو جیسے قیامت، جنت، دوزخ، حساب، جزاو سزا وغیرہ کہ یہ چیزیں غور و فکر سے عقل میں آ جاتی ہیں اور ان پر شرعی دلائل موجود ہیں۔ (خزائن العرفان)

یہاں آیت میں غیب کی یہی دوسری قسم مراد ہے اور اسی طرف مفسر علام نے من البعث الخ کہہ کر اشارہ کیا ہے۔

قولـه: يـأتـون بـهـا — اس تفسیر سے مفسر علام نے اشارہ کیا ہے کہ یہاں نماز قائم کرنے سے مراد نماز کو مستحب اوقات میں ظاہری و باطنی آداب کی رعایت کرتے ہوئے پابندی سے پڑھنا ہے، نماز کے ظاہری آداب اس کی شرطیں

فرائض، سنن ومستحبات اور تعدیل ارکان ہیں اور باطنی آداب یہ ہیں کہ نماز میں ریا کا دخل نہ ہو از اول تا آخر خشوع وخضوع برقرار رہے لہٰذا جو شخص نماز پابندی کے ساتھ نہ پڑھے یا پابندی کرے مگر سنن ومستحبات کا خیال نہ رکھے یا ریاکاری کے لئے پڑھے تو وہ سچا نمازی نہیں۔

قوله. اعطيناهم. یہ رزق کے لغوی معنی کی طرف اشارہ ہے یعنی حصہ،عرفی معنی یعنی کسی شئی کو کسی حیوان کے ساتھ اس طرح خاص کر دینا کہ وہ اس سے نفع اٹھا سکے، مراد نہیں آگے فی طاعة الله کہہ کر اس طرف اشارہ کر دیا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک صرف وہی انفاق مقبول ہے جو اس کی رضا کے لئے ہو خواہ وہ صدقہ وزکوٰۃ ہو یا کسی اور طریقے سے خوشنودی مولیٰ کے لئے خرچ ہو۔ (صاوی)

خیال رہے کہ و ممارزقنهم میں من تبعیضیہ ہے جس سے یہ مستفاد ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے اپنی دی ہوئی روزی میں سے کچھ حصہ ہی خرچ کرنے کا حکم دے رہا ہے نہ یہ کہ بندہ اپنی ساری دولت اور گھر وغیرہ راہ خدا میں دے کر خود فقیر بن بیٹھے کہ ایسا کرنا شرعاً ممنوع ہے دوسرے لفظوں میں یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ انفاق کے تین درجے ہیں اول سخاوت کہ کچھ خرچ کرے کچھ اپنے پاس رکھے، دوسرا درجہ جود ہے کہ زیادہ خرچ کرے تھوڑا پاس رکھے، تیسرا درجہ ایثار ہے کہ جو کچھ اس کے پاس ہے وہ دوسرے کو دے ڈالے اور اپنے پاس کچھ بھی نہ رکھے، یہاں پہلا یا دوسرا درجہ مراد ہے تیسرا نہیں۔ (تفسیر نعیمی)

ایمان کا لغوی واصطلاحی معنی:

ایمان کا لغوی معنی ہے امن دینا، بھروسہ واعتماد کرنا، کسی بات کو سچ ماننا، اصطلاح شرع میں تمام ضروریات دین کو دل سے سچ ماننے اور زبان سے ان کی سچائی کے اقرار کرنے کو ایمان کہتے ہیں، یہ تصدیق واقرار خواہ تحقیقاً ہو یا تقلیداً (عمدة القاری جلد اول، ص ۱۰۳ مطبوعہ، بیروت) مگر اصل ایمان تصدیق قلبی ہے اور دنیا میں اجراء احکام کے لئے اقرار باللسان شرط ہے کہ اگر کوئی زبان سے تمام ضروریات دین کی تصدیق کرے تو اس کو مسلمان ہی کہیں گے۔ باطن کا حال خدا کے سپرد ہے۔
(فتح الباری جلد اول، ص ۶۶، مطبوعہ، کراچی)

پھر خیال رہے کہ ایمان کی تعریف میں جو ضروریات دین کا لفظ آیا ہے اس سے مراد وہ دینی باتیں ہیں جن کا دین سے ہونا ایسی قطعی یقینی دلیل سے ثابت ہو جس میں ذرہ برابر شبہ نہ ہو اور ان کا دینی بات ہونا ہر عام وخاص کو معلوم ہو خواص سے مراد علما ہیں اور عوام سے مراد وہ لوگ ہیں جو عالم نہیں مگر علما کی صحبت میں رہتے ہیں، لہٰذا وہ دینی باتیں جن کا دینی بات ہونا سب کو معلوم ہے مگر ان کا ثبوت قطعی نہیں تو وہ ضروریات دین سے نہیں جیسے عذاب قبر اور اعمال کا وزن، اسی طرح وہ باتیں جن کا ثبوت قطعی ہے مگر ان کا دین سے ہونا عوام وخواص سب کو معلوم نہیں تو وہ بھی ضروریات دین سے نہیں جیسے صلبی بیٹیوں کے ساتھ پوتی ہو تو پوتی کو چھٹا حصہ ملے گا۔ (نزہۃ القاری، جلد اول، ص ۲۳۹، دائرۃ البرکات، گھوسی)

ایمان اور اسلام کا فرق:

اس سلسلہ میں علما کے درمیان کافی اختلاف ہے کہ ایمان اور اسلام متحد ہیں یا متغائر شوافع کے نزدیک ایمان اور اسلام ایک ہی چیز کا نام ہے، تفصیل کے لئے شرح عقائد وغیرہ کا مطالعہ کیجئے، مگر علمائے احناف کی آراء بھی اس سلسلہ میں مختلف ہیں، کسی نے کہا ایمان اور اسلام متغائر ہیں، کسی نے دونوں کو متحد قرار دیا، کسی نے کہا اسلام اور ایمان مفہوماً متغائر اور مصداقاً متحد ہیں، فقیر کے نزدیک آخری قول پسندیدہ ہے کہ یہی محققین احناف کا مختار ہے۔

ایمان اور اسلام کے درمیان انور شاہ کشمیری کا خودساختہ فرق:

جلالین کی اردو شرح جمالین کے مصنف مولوی محمد جمال بلند شہری استاذ دارالعلوم دیوبند نے انور شاہ کشمیری کے حوالے سے ایمان اور اسلام کے درمیان یہ فرق نقل کیا وہ لکھتے ہیں: ''ایمان اور اسلام کی مسافت ایک ہے، فرق صرف ابتداء اور انتہا کا ہے، یعنی ایمان قلب سے شروع ہوتا ہے اور ظاہر عمل پر پہنچ کر مکمل ہوتا ہے اور اسلام ظاہر عمل سے شروع ہوتا ہے اور قلب پر پہنچ کر مکمل سمجھا جاتا ہے، اگر تصدیق قلبی اقرار باللسان تک نہ پہنچے تو وہ تصدیق معتبر نہیں، اسی طرح اگر ظاہری اطاعت و اقرار تصدیق قلبی تک نہ پہنچے تو وہ اسلام معتبر نہیں۔'' ماخوذ از معارف'' (جمالین شرح جلالین جلد اول ص ۴۳ مطبع زمزم پبلشرز کراچی)

یہ کشمیری صاحب کا خودساختہ فرق ہے جو چند وجوہ سے باطل ہے اولاً ''کشمیری جی نے کہا کہ اگر تصدیق قلبی اقرار باللسان تک نہ پہنچے تو وہ تصدیق معتبر نہیں'' اس سے یہ لازم آتا ہے کہ اگر کسی نے ایمان قبول کیا اور اسے تصدیق قلبی حاصل ہوگئی مگر اقرار باللسان کا موقعہ نہ مل سکا اور وہ فوت ہوگیا، تو وہ مومن نہیں، حالانکہ عنداللہ وہ مومن اور ناجی ہے، تفصیل کے لئے تفاسیر و احادیث کی کتابیں دیکھئے، ثانیاً کشمیری جی نے کہا اگر ظاہری اطاعت و اقرار تصدیق قلبی تک نہ پہنچے تو وہ اسلام معتبر نہیں'' یہ بھی غلط کیونکہ مسئلہ یہ ہے کہ اگر کوئی ضروریات دین کی زبانی طور پہ تصدیق کرے تو وہ شرعاً مسلمان ہے کافر نہیں کہ باطن کا حال خدا جانتا ہے۔ ثالثاً جب ظاہری اقرار کا تصدیق قلبی تک پہنچنا مسلمان ہونے کے لے ضروری ہے تو پھر کشمیری جی اور ان کی دیوبندی لابی بتائے کہ وہ اپنا مسلمان ہونا کیسے ثابت کریں گے؟ کیونکہ تصدیق قلبی ایک باطنی چیز ہے جو نظر نہیں آتی پھر یہ کیسے ثابت ہوگا کہ آپ کا ظاہری اقرار تصدیق قلبی تک پہنچ گیا؟

غیب کی لغوی و اصطلاحی تعریف:

غیب کا لغوی معنی ہے ''چھپی ہوئی چیز، اصطلاح میں غیب وہ چیز کہلاتی ہے جو ظاہری و باطنی حواس اور عقل سے چھپی ہوئی ہو، یعنی نہ آنکھ، کان، ناک وغیرہ سے معلوم ہو سکے اور نہ ہی غور و فکر سے عقل میں آسکے، پھر اس کی دو قسمیں ہیں جن کا ذکر ہم نے توضیح و تشریح کے ضمن میں کر دیا ہے۔

علم غیب کے متعلق اہلسنّت کا عقیدہ:

توضیح وتشریح کے ضمن میں گزرا کہ علم غیب کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جس پر کوئی دلیل نہ ہو، دوسرے وہ جس پر دلیل قائم ہو، ان دونوں قسموں کے علوم غیبیہ کے سلسلہ میں ہم اہلسنّت وجماعت کا یہ عقیدہ ہے کہ انبیاء کرام اور ان کے توسط سے اولیاء اللہ کو ان کا علم ہے اور وہ غیب جانتے ہیں مگر ان کا علم عطائی، حادث، ممکن ہے ذاتی نہیں، اس عقیدے کی صحت پر دلائل و براہین کا ناقابل تردید انبار موجود ہے، تفصیل کے لئے اس موضوع پر علما اہلسنّت کی تصنیفات کا مطالعہ کیجئے۔ رہیں وہ آیات اور احادیث جن میں غیر خدا سے علم غیب کی نفی کی گئی ہے تو اس سے مراد علم ذاتی، واجب قدیم ہے جو اللہ تعالیٰ کے لئے خاص ہے اور کسی دوسرے کے لئے علم ذاتی، واجب، قدیم ماننا جائز نہیں بلکہ کفر ہے، زیادہ تفصیل میں نہ جا کر ہم اپنے دعوای کے ثبوت میں بعض معتمد علما کے ارشادات عالیہ نقل کرتے ہیں۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی تحریر فرماتے ہیں:

مراد آنست کہ بے تعلیم الٰہی، بحساب عقل کس ایشاں نداند، از امور غیب اند کہ جز خدا کسے آن راندانند مگر آنکہ وے تعالیٰ از نزد خود کسے را بوحی والہام آگاہ کند۔

مراد یہ ہے کہ ان امور غیبیہ کو اللہ عزوجل کے بتائے بغیر عقل کے حساب سے کوئی نہیں جانتا سوائے اس کے جسے اللہ تعالیٰ وحی یا الہام کے ذریعہ بتادے۔

(اشعۃ اللمعات جلد اول، ص ۴۴، مطبع نوریہ سکھر، پاکستان)

علامہ سعد الدین تفتازانی تحریر فرماتے ہیں:

بالجملة العلم بالغيب امر تفرد به الله تعالىٰ لاسبيل اليه للعباد الا باعلام منه او الهام بطريق المعجزة اوالكرامة.

خلاصہ کلام یہ ہے کہ غیب جاننا ایک ایسی بات ہے جو خدا کے لئے خاص ہے بندوں کو اس تک رسائی نہیں بغیر رب کے بتائے یا الہام فرمائے معجزہ یا کرامت کے طریقہ پر۔

(شرح عقائد، ص ۱۷۰، مطبع تاج کمپنی دیوبند)

ملا احمد جیون تحریر فرماتے ہیں:

و لك ان تقول ان علم هذه الخمسة و ان كان لايملكه الا الله لكن يجوز ان يعلمها من يشاء من محبه و اوليائه بقرينة قوله تعالىٰ ان الله عليه خبير على ان يكون الخبير بمعنى المخبر.

اور تم یہ بھی کہہ سکتے ہو کہ ان پانچ چیزوں کو اگرچہ خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا ہے لیکن جائز ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے ولیوں اور محبوبوں میں جس کو چاہے سکھادے اس قرینہ سے کہ خبیر بمعنی مخبر ہے۔

(تفسیرات احمدیہ، ص ۴۰۵، مطبع اشرفیہ دیوبند)

﴿وَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ﴾ اَيِ الْقُرْآنِ ﴿وَ مَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ﴾ اَيِ التَّوْرٰةِ وِ

الاِنْجِیْلِ وَغَیْرَهُمَا ﴿وَ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ یُوْقِنُوْنَ﴾ یَعْلَمُوْنَ ﴿اُولٰٓئِكَ﴾ اَلْمَوْصُوْفُوْنَ بِمَا ذُكِرَ ﴿عَلٰی هُدًی مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ اَلْفَائِزُوْنَ بِالْجَنَّةِ النَّاجُوْنَ مِنَ النَّارِ ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا﴾ كَاَبِیْ جَهْلٍ وَ اَبِیْ لَهَبٍ وَ نَحْوِهِمَا ﴿سَوَآءٌ عَلَیْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ﴾ بِتَحْقِیْقِ الْهَمْزَتَیْنِ وَ اِبْدَالِ الثَّانِیَةِ اَلِفًا وَ تَسْهِیْلِهَا وَ اِدْخَالِ اَلْاَلِفِ بَیْنَ الْمُسَهَّلَةِ وَ الْاُخْرٰی وَ تَرْكِهٖ ﴿اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ ٥﴾ لِعِلْمِ اللّٰهِ مِنْهُمْ ذٰلِكَ فَلَا تَطْمَعْ فِیْ اِیْمَانِهِمْ وَ الْاِنْذَارُ اِعْلَامٌ مَعَ تَخْوِیْفٍ.

ترجمہ: ﴿اور وہ جو ایمان لائیں اس پر جو اے محبوب تمہاری طرف اتارا گیا﴾ یعنی قرآن ﴿اور جو تم سے پہلے اتارا گیا﴾ یعنی توریت اور انجیل وغیرہ ﴿اور آخرت پر یقین رکھیں﴾ بلا شبہ جانیں ﴿وہی لوگ﴾ مذکورہ صفات سے متصف لوگ ﴿اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر ہیں اور وہی مراد کو پہنچنے والے ہیں﴾ حصول جنت میں کامیاب اور جہنم سے نجات یافتہ ﴿بے شک وہ جن کی قسمت میں کفر ہے﴾ جیسے ابو جہل اور ابولہب اور ان جیسے کفار ﴿ان کے لئے یکساں ہے خواہ تم انھیں ڈراؤ﴾ [أأنـــذرتهـــم میں چند قرائتیں ہیں] (۱) دونوں ہمزہ باقی رکھے۔ (۲) دوسرے ہمزہ کو الف سے بدل دے۔ (۳) دوسرے ہمزہ کی تسہیل ہو اور ساتھ ہی ساتھ تسہیل شدہ ہمزہ اور دوسرے ہمزہ کے درمیان الف داخل کرے (۵) دوسرے ہمزہ کی تسہیل کے ساتھ تسہیل شدہ ہمزہ اور دوسرے ہمزہ کے درمیان الف نہ داخل کیا جائے۔ ﴿یا نہ ڈراؤ وہ ایمان نہیں لائیں گے﴾ کیونکہ اللہ تعالیٰ کو اس کا علم ہے لہٰذا آپ ان کے ایمان کی امید نہ رکھیں اور انذار خطرات سے آگاہ کرنے کو کہتے ہیں۔

توضیح وتشریح: قولہ "وغیرهما" اس سے مراد دیگر کتب سماویہ اور صحائف ہیں، مگر خیال رہے کہ قرآن پاک اور دوسری آسمانی کتابوں کے ماننے میں دو طرح فرق ہے۔ اولاً یہ کہ قرآن پاک کے احکام کی بقدر ضرورت تفصیل جاننا ہر مسلمان پر فرض عین ہے اور پورے قرآن کی تفصیل جاننا فرض کفایہ ہے مگر دیگر آسمانی کتابوں کا تفصیل سے جاننا ضروری نہیں، ثانیاً یہ کہ قرآن پاک کے ہر جز کا ماننا بھی ضروری ہے اور اس کی محکم آیتوں پر عمل کرنا بھی ضروری ہے لیکن پچھلی کتابوں کا صرف اس قدر ماننا ضروری ہے کہ "انبیاء سابقین پر جو کتابیں نازل ہوئیں وہ سب حق تھیں" یعنی ان کتابوں کے منسوخ احکام پر عمل کرنا ہم پر ضروری نہیں۔ (روح البیان)

قولہ "الفائزون" الخ اس تفسیر سے حضرت مفسر نے فلاح کا مفہوم بیان فرمایا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ "فلاح" دنیوی کامیابی کو نہیں کہتے، لہٰذا صرف دنیوی کامیابی حاصل کرنے والا فلاح یافتہ نہیں بلکہ فلاح نام ہے مکمل کامیابی کا اور مکمل کامیابی آخرت کی کامیابی ہے کہ وہاں کی کامیابی میں دوام ہے۔ اس لئے جو آخرت میں کامیاب ہو جائے وہی حقیقت میں فلاح یافتہ ہے۔

خیال رہے آیت کریمہ "اُولٰٓئِكَ عَلٰی هُدًی مِّنْ رَّبِّهِمْ" میں استعارہ تبعیہ ہے جس میں لفظ مستعار فعل یا حرف یا مشتق ہوتا ہے، مذکورہ آیت میں مستعار حرف "علی" ہے اور "التمكن من الحصول علی الهداية" (یعنی ہدایت کے حصول پر قدرت) مستعار لہ ہے یعنی مہدی اور ہدی کے درمیان مطلق ارتباط کو تشبیہ دی گئی ہے مستعلی اور مستعلی علیہ کے

درمیان مطلق ارتباط سے اور وجہ جامع ''قدرت'' ہے جیسے گھوڑے پر سوار شخص کو گھوڑے پر قابو ہوتا ہے اسی طرح متقی شخص ہدایت تامہ پر قادر ہوتا ہے گویا حصول ہدایت پر قادر ہو جانے کو تشبیہ دی گئی ہے ہدایت پر ہونے سے۔

بتحقیق الھمزتین الخ یہاں سے "أ انذرتھم" میں اختلاف قراءت کا ذکر ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ "أانذرتھم" میں ''کل'' پانچ قرائتیں ہیں۔ ''تحقیق ہمزتین'' میں دو قرائتیں ہیں: (۱) دونوں ہمزہ کو برقرار رکھ کر دونوں کے بیچ میں ''الف'' لایا جائے۔ (۲) دونوں ہمزہ برقرار رکھ کر بیچ میں ''الف'' نہ لایا جائے۔ اور ''ابدال'' میں ایک قراءت ہے کہ دوسرے ہمزہ کو تین الف کی مقدار مدلازم کے طور پر ''الف'' سے تبدیل کی جائے۔ اور ''تسہیل'' میں بھی دو قرائتیں ہیں۔ (۱) پہلے ہمزہ اور تسہیل شدہ ہمزہ کے درمیان الف لایا جائے۔ (۲) دونوں کے بیچ الف نہ لایا جائے۔ اس سے معلوم ہوا کہ مفسر کے قول "و إدخال الخ" میں واو مع کے معنی میں ہے اور اس کا تعلق ان کے قول ''تحقیق'' اور ''تسہیل'' دونوں سے ہے۔

لعلم اللہ الخ سے حضرت مفسر علیہ الرحمہ نے ایک شبہ کا ازالہ کیا ہے، شبہ یہ پیدا ہوتا تھا کہ ہمیشہ کفار نے تبلیغ کے بعد ہی اسلام قبول کیا ہے پھر یہاں یہ کیسے فرمایا جا رہا ہے کہ کفار کے لئے تبلیغ کرنا اور نہ کرنا برابر ہے وہ ایمان نہیں لائیں گے؟ جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ خبر سب کافروں کے لئے نہیں بلکہ صرف ازلی کافروں کے لئے ہے جن کے متعلق علم الٰہی میں ہے کہ وہ ایمان نہیں لائیں گے اور حالت کفر میں ہی مریں گے۔ آگے مفسر علام نے فلا تطمع سے اس امر کی طرف اشارہ فرمایا کہ یہاں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو تبلیغ سے منع کرنا مقصود نہیں بلکہ ازلی کافروں سے ایمان کی توقع نہ رکھنے کی ترغیب ہے جس میں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے لئے تسلی بھی ہے کیوں کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ابوجہل وغیرہ کے ایمان نہ لانے سے کبیدہ خاطر رہتے تھے۔

شبہات کا ازالہ: بادی النظر میں یہاں چند شبہات پیدا ہوتے ہیں، اولاً یہ کہ ازلی کفار ایمان نہ لانے میں مجبور محض ہیں کہ جب ان کی قسمت میں کفر ہی لکھا ہے اور اللہ تعالیٰ خود فرما رہا ہے کہ وہ ایمان نہیں لائیں گے تو وہ ایمان کیونکر لا سکتے ہیں؟ اور ایمان نہ لانے میں ان کا کیا قصور ہے؟ اور جب وہ اپنی قسمت سے مجبور ہو کر ایمان نہیں لائے تو پھر انہیں سزا کیوں ملے گی اور جہنم میں کیوں ڈالے جائیں گے؟ اس سے تو جبر ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خود انہیں ایمان سے باز رکھا اور پھر انہیں سزا بھی دے گا۔

ثانیاً یہ کہ جب اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دے دی کہ کفار ایمان نہیں لائیں گے تو کفار کو مزید تبلیغ کرنا گویا بے فائدہ تھا پھر حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تبلیغ کرنے سے باز کیوں نہیں آئے اور اخیر عمر شریف تک بے فائدہ تبلیغ کا کام کیوں جاری رکھا؟

ثالثاً یہ کہ جب اللہ تعالیٰ کو یہ علم تھا کہ ابوجہل اور ابولہب جیسے ازلی کافر ایمان نہ لائیں گے تو پھر دوسرے مقام پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حکم کیوں دیا گیا و انذر عشیرتك الاقربین (سورہ شعراء) اپنے قریبی رشتہ داروں کو ڈراؤ۔

پہلے شبہ کا جواب یہ ہے کہ یہاں نہ کفار کا مجبور محض ہونا ثابت ہوتا ہے اور نہ ہی جبر کا عقیدہ نکلتا ہے کیونکہ جبر انسان کی بے بسی کی اس حالت کا نام ہے جس میں وہ کسی ایک بات کے کرنے پر مجبور ہو اور اسے چھوڑ کر کوئی دوسری چیز اختیار کرنے پر

قادر نہ ہو، مگر یہاں ایسا نہیں بلکہ یہاں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے واضح دلائل اور روشن معجزات کے ذریعہ حق کو نکھار دیا اور ہدایت و گمراہی کے درمیان خط امتیاز کھینچ کر دونوں کی راہوں کو الگ الگ واضح کر دیا، اور ہدایت اختیار کرنے کے فوائد اور گمراہی اختیار کرنے کے نقصانات کو بھی بیان کر دیا، اس کے بعد بھی جس نے ہدایت قبول نہیں کیا اور کفر ہی پر قائم رہا وہ کفر اختیار کرنے پر مجبور نہ تھا بلکہ سب کچھ سمجھ لینے کے بعد بھی محض تعصب اور ہٹ دھرمی کے باعث دانستہ طور پہ اس نے حق کو ٹھکرا دیا اور اپنے کفر پر قائم رہا، اور چونکہ ازلی کافروں کی یہ حالت علم الٰہی میں تھی اس لئے جیسا ہونا تھا ویسا ہی اللہ تعالیٰ نے ان کافروں کی قسمت میں لکھ دیا، لہٰذا ثابت ہوا کہ تقدیر کی وجہ سے ازلی کفار کفر اختیار کرنے پر مجبور نہیں بلکہ انھوں نے دیدہ و دانستہ اپنی مرضی سے ہدایت پر کفر کو ترجیح دیا اور وہ مجرم ٹھہرے اس لئے انہیں ان کے جرم کی سزا ملے گی اور وہ جہنم میں ڈالے جائیں گے۔ (تفسیر ضیاء القرآن ملخصاً)

دوسرے شبہ کا جواب یہ ہے کہ تبلیغ کا بے فائدہ ہونا کفار کے لحاظ سے تھا نہ کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے لحاظ سے اسی لئے سواء علیك نہ فرما کر سواء علیهم فرمایا، رہا تبلیغ و انذار کا کام تو وہ بے فائدہ نہیں بلکہ اس کار تبلیغ پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم عند اللہ ماجور ہوں گے۔

تیسرے شبہ کا جواب یہ ہے کہ بے شک اللہ تعالیٰ کو علم تھا کہ ابوجہل اور ابولہب جیسے کفار ایمان نہ لائیں گے اس کے باوجود انہیں تبلیغ کرنے کا حکم اس لئے دیا کہ ان ازلی کافروں پر حجت قائم ہو جائے۔ اور وہ آخرت میں یہ نہ کہہ سکیں کہ ہمارے پاس کوئی ہادی نہیں آیا۔ (تفسیر کبیر)

مولوی نعیم پر تعقب

مولوی نعیم دیوبندی استاذ تفسیر دار العلوم دیوبند نے جلالین کی اردو شرح کمالین میں اسی مقام پر پہلے شبہ کا جواب دیتے ہوئے لکھا: ''ان کی (کافروں کی) بدحالی کا اندازہ کر کے اللہ نے خبر دی تھی جو صحیح نکلی'' (مکتبہ تھانوی سہارنپور)

مولوی صاحب کی مذکورہ عبارت سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا علم قدیم اور ازلی نہیں، کیونکہ ایک عامی انسان جانتا ہے کہ اندازہ کہتے ہیں اٹکل کو، اور اٹکل سے کوئی بات اس وقت کہی جاتی ہے جب کہ بات میں صدق و کذب کا احتمال ہو، اور صدق و کذب کا احتمال بندوں کے کلام میں تو ممکن ہے بلکہ واقع ہے، مگر اللہ تعالیٰ کے کلام میں کذب کا احتمال نہیں، لہٰذا اللہ تعالیٰ کی طرف اندازہ اور اٹکل جیسے کلمات کی نسبت صحیح نہیں، لیکن مولوی نعیم کی مذکورہ عبارت سے روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو جو یہ خبر دی، کہ ازلی کفار ایمان نہیں لائیں گے'' یہ محض اٹکل سے فرمایا تھا جس کا صحیح ہونا ضروری نہیں تھا بلکہ یہ خبر غلط بھی ہو سکتی تھی اور اس خبر کا واقع کے مطابق ہو جانا محض ایک اتفاق ہے، اس سے ثابت ہوا کہ دیوبندی مذہب میں علم الٰہی کا ازلی و ابدی ہونا ضروری نہیں۔ کہ جب علم الٰہی میں صدق و کذب کا احتمال ٹھہرا تو گویا اس میں تغیر کا امکان پیدا ہوا اور امکان تغیر حدوث کو مستلزم ہے اور حدوث ازلیت کے منافی ہے، حالانکہ اہل اسلام کا یہ بنیادی

عقیدہ ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ کی ذات قدیم اور ازلی ہے اسی طرح اس کی صفات بھی قدیم اور ازلی ہیں عقیدہ کی مشہور کتاب شرح عقائد میں ہے: "و لہ صفات ازلیۃ قائمۃ بذاتہ" مگر دیوبندی جو لکھتے ہیں اسے سمجھتے نہیں، اسی لئے وہ اپنی تصنیفات میں نہ مقام نبوت کا لحاظ رکھتے ہیں نہ تقدیس الوہیت کی پاس داری، مولیٰ تعالیٰ ہدایت عطا فرمائے! آمین

رضوی ترجمہ کی ایک خوبی:

آیت کریمہ "ان الذین کفروا الآیۃ" کا ترجمہ متعدد مترجمین نے مختلف انداز میں کیا ہے مگر جو گہرائی و گیرائی امام احمد رضا محدث بریلوی قدس سرہ کے ترجمہ کنز الایمان میں ہے وہ کسی اور ترجمہ میں نہیں کہ اکثر مترجمین نے سطحی و لفظی ترجمہ کر کے روح قرآن کو چوٹ پہنچایا ہے، تحت ذیل تراجم پر غور کریں۔

(۱) جن لوگوں نے انکار کر دیا ان کے لئے یکساں ہے خواہ تم انہیں خبردار کرو یا نہ کرو۔ (ابو الاعلیٰ مودودی)

یہ ترجمہ: اس لئے مقصد قرآن کے خلاف ہے کہ اولاً بہت سارے صحابہ کرام نے ایمان لانے سے انکار کر دیا تھا مگر پھر حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی پرخلوص تبلیغ کی بدولت ایمان کی دولت سے بہرہ ور ہو گئے تو ان کے لئے خبردار کرنا اور نہ کرنا برابر کیسے ہوا؟

(۲) بے شک جو لوگ کافر ہو چکے ہیں برابر ہے ان کے حق میں خواہ آپ ان کو ڈرائیں نہ ڈرائیں۔ (اشرف علی تھانوی)

(۳) کافروں کو آپ کا ڈرانا نہ ڈرانا برابر ہے۔ (مولوی محمد جونا گڑھی غیر مقلد)

(۴) بیشک وہ لوگ جو کافر ہوئے ان کو برابر ہے جو تو اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ڈراوے ان کو یا نہ ڈراوے (شاہ عبد القادر دہلوی)

مذکورہ تراجم میں مطلقاً لفظ ''کافر'' استعمال ہوا ہے جب کہ آیت کریمہ میں خاص ازلی کفار مراد ہیں، لہٰذا یہ تراجم بھی صحیح طور پہ قرآن کے اصل منشاء و مراد کو واضح نہیں کرتے، لیکن امام احمد رضا کا ترجمہ پڑھئے لکھتے ہیں:

''بے شک وہ جن کی قسمت میں کفر ہے انھیں برابر ہے چاہے تم انہیں ڈراؤ یا نہ ڈراؤ'' (کنز الایمان)

یہ ترجمہ بلاشبہ روح قرآن سے قریب تر ہے جس سے واضح ہے کہ آیت میں الذین کفروا سے ازلی کفار مراد ہیں اور ظاہر ہے ازلی کفار وہی ہیں جن کی قسمت میں کفر لکھا جا چکا ہے گویا قرآن پاک کی صحیح ترجمانی رضوی ترجمہ کی ایک نمایاں خوبی ہے۔

﴿خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوبِهِمْ﴾ طَبَعَ عَلَيْهَا وَ اسْتَوْثَقَ فَلَا يَدْخُلُهَا خَيْرٌ ﴿وَ عَلٰى سَمْعِهِمْ﴾ أَيْ مَوَاضِعِهِ فَلَا يَنْتَفِعُونَ بِمَا يَسْمَعُونَهُ مِنَ الْحَقِّ ﴿وَ عَلٰى أَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ﴾ غِطَاءٌ فَلَا يُبْصِرُونَ الْحَقَّ ﴿وَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ﴾ قَوِيٌّ دَائِمٌ.

ترجمہ: ﴿مہر لگا دی ہے اللہ نے ان کے دلوں پر﴾ ان پر مہر لگا دیا اور مضبوط کر دیا کہ اب ان میں کوئی بھلائی داخل نہیں ہوگی ﴿اور ان کے کانوں پر﴾ لہٰذا وہ حق بات سن کر اس سے کوئی فائدہ نہ اٹھا سکیں گے۔ ﴿اور ان کی آنکھوں پر گھٹا

ٹوپ ہے ﴿ پردہ ہے لہٰذا وہ حق نہیں دیکھ سکتے ﴿ اور ان کے لئے بڑا عذاب ہے ﴿ قوی اور دائمی۔

توضیح و تشریح: قوله طبع علیها الخ یہ ختم کے معنی لغوی کی طرف اشارہ ہے یعنی ختم کا معنی ہے مہر لگا کر مضبوط کر دینا، مگر یہاں حقیقی معنی مراد نہیں، یعنی ایسا نہیں ہے کہ حقیقتاً اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر اور کانوں پر اس طرح مہر لگادی ہے جیسے کسی چیز کو مہر بند کر دیتے ہیں یا سچ مچ ان کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا ہے، بلکہ اس سے مراد کفار کی وہ کج روی اور تمرد و سرکشی ہے جس کے سبب ان کے دلوں سے قبول حق کی استعداد ختم ہوگئی ہے اور وہ کفر و معصیت کی طرف بے دغدغہ دوڑتے اور امور فطرت سے دلی نفرت رکھتے ہیں، کفار کی اسی حالت کو قرآن نے ختم سے تعبیر فرمایا ہے اور یہ استعارہ ہے جس کی توضیح آگے ہے۔

خیال رہے کہ ختم اللہ سے غشاوۃ تک کی عبارت ماقبل کے دعویٰ (ازلی کفار پر ہدایت کا اثر نہ ہوگا، انہیں ڈرانا اور نہ ڈرانا برابر ہے) کی دلیل ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ معرفت حق کے تین ذرائع ہیں عقل، آنکھ، کان، عقل سے غور و فکر کر کے، آنکھ سے معجزات اور روشن دلائل دیکھ کر اور کان سے پیغام حق سن کر، مگر ازلی کفار کے دل اور کان پر مہر ہے اور آنکھ پر دبیز پردہ یعنی ان کے لئے قبول حق کے تینوں ذرائع مسدود ہیں اس لئے ان پر ہدایت کا اثر نہ ہوگا اور انہیں وعظ کرنا اور نہ کرنا برابر ہے۔ (تفسیر حقانی)

قوله. ای مواضعه: یہ حذف مضاف کی طرف اشارہ ہے چونکہ سمع ایک معنوی قوت کا نام ہے جو کانوں کے سوراخ کے اندر رکھ دی گئی ہے اور اس کی طرف ختم کی نسبت درست نہیں لہٰذا مفسر علام نے مضاف محذوف مانا اس تقدیر پر ختم کی نسبت مواضع سمع کی طرف ہوگی جن پر مہر لگ سکتی ہے۔

قوله. الغطاء الخ: یہ لفظ غشاوۃ کا معنی لغوی ہے، یعنی غشاوۃ کا معنی ہے ''وہ چیز جس سے کسی چیز کو ڈھانک دیا جائے'' اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ باہر سے کوئی چیز اندر داخل نہیں ہوسکتی یہاں غشاوۃ کا بھی لغوی معنی مراد نہیں بلکہ کفار کے دلوں تک نور اسلام کا نہ پہنچنا مراد ہے یعنی لازم بول کر ملزوم مراد لیا گیا ہے۔

قوله. قوی دائم: یہ اس شبہ کا ازالہ ہے کہ عظیم اجسام کی صفت واقع ہوتی ہے جیسے لها عرش عظیم میں عظیم عرش کی صفت ہے جو جسم ہے اور عذاب ایک معنوی چیز ہے لہٰذا عذاب کی صفت عظیم لانا درست نہیں، جواب کا حاصل یہ ہے کہ آیت میں لفظ عظیم، قوی دائم کے معنی میں ہے اور یہ معنی کی صفت واقع ہوتی ہے۔

خیال رہے مذکورہ بالا آیت میں لفظ ختم کی اسناد قلوب اور سمع کی جانب اور ایسے ہی غشاوۃ کی اسناد ابصار کی جانب کرنے میں استعارہ تمثیلیہ ہے جس میں معقول کو شئی محسوس کے ساتھ تشبیہ دی جاتی ہے، لہٰذا آیت میں کفار کے دل اور کان کو تشبیہ دی گئی ہے ایسی چیز کے ساتھ جو مہر بند ہو جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ باہر سے کوئی چیز اندر داخل نہیں ہوسکتی، اسی طرح کفار کی آنکھوں کو تشبیہ دی گئی ہے ایسی آنکھ سے جس پر کوئی دبیز پردہ ہو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس آنکھ سے سامنے کی چیزیں نظر نہیں آتیں، ایسے ہی کفار کے دل، کان اور آنکھ کا حال ہے کہ ان میں سے کسی کے ذریعہ بھی وہ اسلام و ایمان کی روشنی نہیں پاتے۔

فائدہ (۱) لفظ قلوب جمع ہے قلب کی جس کا لغوی معنی ہے "الٹنا پلٹنا" چونکہ دل سینہ کی بائیں جانب الٹا لٹکا ہوا ہے اور حرکت میں رہتا ہے اور اس کے احوال الٹتے پلٹتے رہتے ہیں کہ کبھی شر کی طرف مائل تو کبھی خیر کی طرف، کبھی خوش تو کبھی غمگین، اسی لئے دل کو قلب کہا جاتا ہے۔

(۲) قلب کا لفظ دو معنوں پر بولا جاتا ہے (۱) ایک صنوبری شکل کا (بصورت کلی) مخصوص گوشت ہے جو سینہ کی بائیں جانب رکھا گیا ہے، گوشت کا یہ مخصوص ٹکڑا اندر سے کھوکھلا ہوتا ہے اور اس میں سیاہ خون ہوتا ہے، یہی روح کا منبع و معدن ہے۔

(۲) قلب کا دوسرا معنی یہ ہے کہ وہ ایک روحانی ربانی لطیفہ ہے، یہی لطیفہ انسانی حقیقت کہلاتا ہے اور اس کا تعلق جسمانی قلب سے اس طرح ہوتا ہے جس طرح عرض کا تعلق جسم سے، صفت کا موصوف سے اور آگ کا کوئلہ سے، یہی لطیفۂ ربانی عالم اور عارف ہوتا ہے اور یہی اوامر اور نواہی کا مکلف ہوتا ہے، یہاں آیت میں قلب سے یہی ربانی لطیفہ مراد ہے بلکہ قرآن وحدیث اور تعلیمات صوفیاء میں جہاں بھی لفظ قلب آتا ہے اس سے مراد یہی ربانی لطیفہ ہوتا ہے۔ (روح البیان)

معتزلہ کارد: مذکورہ بالا آیت میں کفار کے دلوں اور کانوں پر مہر لگانے اور آنکھوں پر پردہ ڈالنے کی اسناد اللہ تعالیٰ کی طرف ہے جو اہل حق کے نزدیک اسناد حقیقی ہے مگر معتزلہ کے نزدیک یہ اسناد مجازی ہے حقیقی نہیں وہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف کفر و گمراہی پیدا کرنے کی نسبت کرنا ایسے ہی مہر لگانے کو منسوب کرنا نہایت بے ادبی اور اس کی ذات پر عیب لگانا ہے، لہٰذا اس قسم کی اسناد کو مجاز پر محمول کرنا چاہئے۔

مگر معتزلہ کا مذکورہ قول اور استدلال باطل ہے، کیونکہ یہ امر مسلمات سے ہے کہ سارے عالم کا خالق اللہ تعالیٰ ہے۔ خواہ اعیان ہوں یا اعراض، لہٰذا گمراہی و ہدایت، نیکی و بدی، حرکت و سکون ساری چیزیں اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ ہیں اور کسی چیز کے پیدا کرنے میں کوئی عیب نہیں بلکہ کسی بھی چیز کو بے محل استعمال کرنا عیب ہے، جیسے تلوار بنانا عیب نہیں بلکہ تلوار کا بے محل استعمال عیب ہے، اس لئے خالق ہونے کی وجہ سے گمراہ کرنے و ہدایت دینے کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف صحیح ہے۔ اور یہ نسبت حقیقی ہوگی مجازی نہیں کیونکہ حقیقی معنی کو جب تک کوئی مانع نہ ہو چھوڑنا جائز نہیں۔

رہا یہ سوال کہ جب ساری چیزوں کا خالق اللہ تعالیٰ ہے تو بندے کے ارادہ و افعال کا بھی خالق ہے اور جب ایسا ہے تو بندہ مجبور محض ہوا لہٰذا اسے کسی فعل بد کے ارتکاب پر مستحق سزا نہیں ہونا چاہئے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ صحیح ہے کہ بندہ کے ارادہ و افعال کا خالق اللہ تعالیٰ ہے مگر اللہ تعالیٰ نے بندہ کو یہ اختیار بھی دیا ہے کہ وہ اپنے ارادہ کو عملی جامہ پہنائے یا نہ پہنائے، جس فعل کا ارادہ کیا ہے اسے کرے یا نہ کرے، اور یہ بداہۃً ثابت ہے کہ بندہ اپنے افعال ارادیہ میں پتھر کی طرح مجبور نہیں کیونکہ اس کے ارادی افعال اس طرح از خود سرزد نہیں ہوتے جیسے رعشہ میں از خود ہاتھ ہلا کرتا ہے، اس سے ثابت ہوا کہ بندہ اپنے افعال اختیاریہ کا کاسب ہوتا ہے اور جب ایسا ہے تو امور ممنوعہ کے کسب پر بندے کا مستحق عذاب ہونا عقل کے عین مطابق ہے۔ (ماخوذ بتسہیل من تفسیر فتح المنان)

ایک شبہ کا ازالہ: مذکورہ بالا آیت کے مضمون پر یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے ازلی کافروں کے

دلوں پر اور کانوں پر مہر لگادی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردے ڈال دیئے ہیں تو ان کا ایمان لانا ممکن ہی نہ رہا پھر ان کافروں سے مطالبۂ ایمان کیوں باقی ہے؟

اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ آیت کا مطلب یہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مطالبۂ ایمان سے پہلے ہی انہیں ہوش وحواس اور فہم و ادراک سے محروم کردیا تھا، بلکہ مطلب یہ ہے کہ جب کافروں کو اللہ تعالیٰ نے دل دیا اور انھوں نے اس سے حق سمجھنے کے بعد بھی قبول نہ کیا، آنکھیں عطا فرمائی مگر انھوں نے ان سے حق دیکھنے کے بعد بھی آنکھیں موندلیں اور کان دیئے مگر انھوں نے ان سے حق سننے کے بعد بھی انگلیاں ڈال لیں تو اس ہٹ دھرمی اور سرکشی کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ نے ان کے اندر سے قبول حق کی صلاحیت ختم فرمادی اور کسی بھی اچھے برے عمل پر نتیجہ کا پیدا ہونا ایک بدیہی چیز ہے گویا قبول حق سے محرومی کافروں کی مسلسل نافرمانیوں کا نتیجہ ہے جسے خود اللہ تعالیٰ نے دوسرے مقامات پر بیان فرمایا ہے۔ مثلاً بل طبع اللہ علیها بکفرهم" (سورہ نساء) یعنی ان کے کفر کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر مہر لگادی۔ ایک جگہ ارشاد ہے: "بل ران علی قلوبهم ماکانوا یکسبون" (سورۂ مطففین) یعنی جو کرتوت وہ کرتے تھے ان کا میل ان کے دلوں پر جم گیا، اس سے معلوم ہوا کہ پہلے ہی سے کافروں کے دل مہر شدہ نہ تھے بلکہ کفر وانکار کے سبب وہ اس نعمت سے محروم کردیئے گئے۔

رہا یہ سوال کہ قبول حق سے محروم کرنے کے بعد ان سے مطالبۂ ایمان کیوں ہوتا رہا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس کا مقصد صرف حجت قائم کرنا ہے تاکہ کفار یہ نہ کہہ سکیں کہ قبول حق سے انکار کرنے کے بعد ہمارے پاس کوئی راہ ہدایت دکھانے والا نہیں آیا۔

وَ نَزَلَ فِی الْمُنَافِقِیْنَ ﴿وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ یَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ بِالْیَوْمِ الْاٰخِرِ﴾ اَیْ یَوْمِ الْقِیٰمَةِ لِاَنَّهٗ اٰخِرُ الْاَیَّامِ ﴿وَ مَاهُمْ بِمُؤْمِنِیْنَ ۝﴾ رُوْعِیَ فِیْهِ مَعْنٰی مَنْ وَ فِیْ ضَمِیْرِ یَقُوْلُ لَفْظُهَا ﴿یُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا﴾ بِاِظْهَارِ خِلَافِ مَا اَبْطَنُوْهُ مِنَ الْکُفْرِ لِیَدْفَعُوْا عَنْهُمْ اَحْکَامَهُ الدُّنْیَوِیَّةِ ﴿وَ مَا یُخْدِعُوْنَ اِلَّا اَنْفُسَهُمْ﴾ لِاَنَّ وَبَالَ خِدَاعِهِمْ رَاجِعٌ اِلَیْهِمْ فَیُفْتَضَحُوْنَ فِی الدُّنْیَا بِاِطْلَاعِ اللّٰهِ نَبِیَّهٗ عَلٰی مَا اَبْطَنُوْهُ وَ یُعَاقِبُوْنَ فِی الْاٰخِرَةِ ﴿وَ مَا یَشْعُرُوْنَ﴾ یَعْلَمُوْنَ اَنَّ خِدَاعَهُمْ لِاَنْفُسِهِمْ وَ الْمُخَادَعَةُ هُنَا مِنْ وَاحِدٍ کَعَاقَبْتُ اللِّصَّ وَ ذِکْرُ اللّٰهِ فِیْهَا تَحْسِیْنٌ وَ فِیْ قِرَاءَةٍ وَ مَا یَخْدَعُوْنَ ﴿فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ﴾ شَکٌّ وَ نِفَاقٌ فَهُوَ یُمَرِّضُ قُلُوْبَهُمْ اَیْ یُضْعِفُهَا ﴿فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا﴾ بِمَا اَنْزَلَهٗ مِنَ الْقُرْاٰنِ لِکُفْرِهِمْ بِهٖ ﴿وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ﴾ مُؤْلِمٌ ﴿بِمَا کَانُوْا یَکْذِبُوْنَ ۝﴾ بِالتَّشْدِیْدِ اَیْ نَبِیَّ اللّٰهِ وَ بِالتَّخْفِیْفِ فِیْ قَوْلِهِمْ اٰمَنَّا.

حل اللغات: ﴿المنافقین﴾ المنافق کی جمع ہے، دل میں کفر چھپا کر زبان سے ایمان ظاہر کرنے والے ﴿روعی فیه﴾ اس میں رعایت کی گئی ﴿باظهار خلاف ما ابطنوه﴾ مافی الضمیر کے خلاف ظاہر کرکے ﴿خداع﴾ بری بات چھپانا اور اس کے برعکس دکھانا تاکہ کسی کو فریب دیا جائے۔ ﴿فیفتضحون﴾ افتعال سے مضارع معروف، تو وہ رسوا ہوں گے ﴿یعاقبون﴾ مفاعلت سے مضارع مجهول مجرد عن الاشتراک، سزا دیئے جائیں گے ﴿انفس﴾ نفس کی جمع ہے

ذات، شی، روح، دل، خون، پانی، رائے پہلا معنی مراد ہے ﴿عاقبت اللص﴾ میں نے چور کو سزا دی ﴿شک﴾ شبہ جمع شکوک ﴿نفاق﴾ دل میں کفر چھپا کر زبان سے ایمان ظاہر کرنا ﴿یمرض قلوبهم﴾ ان کے دلوں کو بیمار کر دیتا ہے ﴿مولم﴾ دردناک۔

ترجمہ: اور آنے والا قول باری تعالیٰ منافقین کے متعلق نازل ہوا ﴿اور کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ہم اللہ اور آخری دن پر ایمان لائے﴾ یعنی قیامت کے دن پر کیونکہ وہ دنوں میں آخری دن ہے ﴿اور وہ ایمان والے نہیں﴾ اس (مؤمنین) اور ضمیر (هم) میں لفظ مَن کے معنی کی رعایت کی گئی ہے اور یقول کی ضمیر میں محض لفظ مَن کی رعایت کی گئی ہے ﴿فریب دینا چاہتے ہیں اللہ اور ایمان والوں کو﴾ اپنے باطنی کفر کے خلاف ظاہر کر کے تاکہ اپنی ذات سے کفر کے دنیاوی احکام کے نفاذ کو روک سکیں۔ ﴿اور حقیقت میں فریب نہیں دیتے مگر اپنی جانوں کو﴾ کیونکہ ان کے فریب کا وبال انہیں کی طرف لوٹنے والا ہے تو وہ دنیا میں یوں رسوا ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ اپنے نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو ان کے مافی الضمیر پر مطلع کر دے گا اور آخرت میں عذاب دیئے جائیں گے۔ ﴿اور انہیں شعور نہیں﴾ کہ سمجھ سکیں کہ ان کا فریب انہیں کے لئے وبال جان ہے اور مخادعت یہاں ایک جانب سے ہے جیسے عاقبت اللص " میں نے چور کو سزا دی" اور یہاں کلمہ جلالت محض تحسین کلام کے لئے ہے اور ایک قرأت میں "و ما یخدعون" آیا ہے۔ ﴿ان کے دلوں میں بیماری ہے﴾ شک اور نفاق ہے تو وہ ان کے دلوں کو بیمار کر دیتا ہے یعنی کمزور بناتا ہے ﴿تو اللہ نے ان کی بیماری اور بڑھائی﴾ نازل شدہ قرآن کے ذریعہ کیونکہ یہ قرآن کے ساتھ بھی کفر کرتے ہیں۔ ﴿اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے بدلہ ان کے جھوٹ کا﴾ یکذبون تشدید کے ساتھ بھی ہے یعنی اللہ کے نبی کو جھٹلاتے ہیں اور تخفیف کے ساتھ بھی ہے یعنی وہ اپنے قول آمنا میں جھوٹے ہیں۔

توضیح و تشریح: قولہ "و نزل فی المنافقین" اس عبارت سے حضرت مفسر علیہ الرحمہ نے آنے والی آیتوں کے شان نزول کی طرف اشارہ کیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ مدینہ منورہ میں عبداللہ بن ابی بن سلول، معتب بن قشیر، جد بن قیس اور ان کے رفقاء کی ایک ایسی جماعت تھی کہ یہ سب حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور مسلمانوں سے بغض وعداوت رکھتے تھے مگر اپنی دشمنی ظاہر کرنے سے ڈرتے تھے اس لئے بظاہر مسلمان ہو گئے اور دل میں کفر چھپائے رکھا، مسلمانوں سے ملتے تو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی تعریف کرتے اور آپس میں بیٹھتے تو مسلمانوں پر ہنستے اور ان کے خلاف سازشیں رچتے، انہیں لوگوں کے بارے میں آنے والی تیرہ آیتیں نازل ہوئیں اور اللہ تعالیٰ نے ان کے راز کو فاش کرتے ہوئے فرمادیا "و ما هم بمؤمنین" وہ ایمان والے نہیں ہیں۔

قولہ. ای یوم القیامۃ یہ اس شبہ کا جواب ہے کہ آخری دن پر ایمان لانا ضروریات دین سے نہیں پھر اس پر ایمان نہ لانے والا کافر کیوں ہے؟ جواب یہ ہے کہ آخری دن سے مراد قیامت کا دن ہے یعنی حساب و کتاب اور جزا و سزا کا دن اور اس پر ایمان لانا ضروریات دین سے ہے۔ لہٰذا اس کا منکر کافر ہے۔

قولہ. روعی فیہ الخ یہ ایک اشکال کا جواب ہے، اشکال کی تقریر یہ ہے کہ آیت میں یقول واحد کا صیغہ استعمال ہوا ہے جس میں ھو ضمیر کا مرجع مَنْ ہے اور پھر ھم اور مومنین جمع کے طریقے پر استعمال ہوئے اور ان کا بھی مرجع مَنْ ہے، تو

ایک ہی لفظ ضمیر واحد اور جمع دونوں کا مرجع بن جائے یہ کیونکر ممکن ہے؟

جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ لفظ مَـن واحد، تثنیہ اور جمع سب کے لئے بولا جاتا ہے کیونکہ یہ لفظ کے اعتبار سے واحد ہے اور معنی کے اعتبار سے جمع لہٰذا اس کی طرف واحد اور جمع دونوں قسم کی ضمیریں لوٹ سکتی ہیں۔ آیت میں مــن کی لفظی حیثیت کا اعتبار کرتے ہوئے یقول بصیغۂ واحد فرمایا اور ھم اور مؤمنین میں لفظ من کی معنوی حیثیت کی رعایت ہے کیونکہ لفظ من میں دونوں کی گنجائش ہے۔

قوله. باظهار خلاف الخ یہ نفاق کی صورت اور وجہ نفاق کا بیان ہے مگر پہلے اقسام نفاق پر ایک نظر ڈال لیں:

(۱) زبان سے ایمان ظاہر کرے مگر دل میں صاف منکر ہو۔ (۲) زبان سے ایمان ظاہر کرے مگر دل میں صاف منکر نہ ہو بلکہ مذبذب رہے۔ (۳) زبان سے اسلام ظاہر کرے اور دل میں تصدیق بھی ہو مگر دنیا کی محبت اس پر ایسی غالب ہو کہ دنیوی نفع کو ایمان پر مقدم رکھے۔ (۴) جو ایسا بے حیا تو نہ ہو مگر اس کا قال حال کے مطابق نہ ہو زبان سے کچھ کہے اور دل میں کچھ رکھے اس کا دوسرا نام تقیہ بھی ہے، اول الذکر تینوں قسم کے منافقین خدا کے نزدیک سخت کافر ہیں اور جہنم کے سب سے نچلے طبقہ میں رہیں گے اور چوتھی قسم کے منافقین اگرچہ کافر تو نہیں مگر وہ تقیہ کرتے ہیں جو سراسر ناراستی، نور ایمان اور صداقت کی روشنی ذرا بھی مکر و فریب کو گوارا نہیں ہوتی۔ (تفسیر حقانی)

یہاں آیت میں نفاق کی پہلی قسم کا بیان ہے کیونکہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے زمانۂ پاک میں اسی قسم کے منافقین تھے جو کفر کو دل میں چھپائے رکھتے اور زبان سے اسلام کا اظہار کرتے تھے، اور ایسا اس لئے تھا کہ منافقین چونکہ کھلے طور پر اسلام کا مقابلہ کرنے سے عاجز تھے اس لئے وہ ڈرتے تھے کہ عداوت ظاہر کرنے کی صورت میں مسلمان ان پر کفر کے احکام نافذ کریں گے۔ یعنی ان سے جہاد و قتال کریں گے یا ان پر جزیہ مقرر کر دیں گے، اسی تفصیل کی طرف حضرت مفسر علام نے باظهار خلاف الخ کہہ کر اشارہ فرمایا ہے۔

قـولـه. المـخـادعة هنا من واحد — یہ اس شبہ کا جواب ہے کہ "یـخـدعـون، مخادعت" سے بنا ہے، اور مخادعت باب مفاعلت کا مصدر ہے جس کی خاصیت اشتراک ہے لہٰذا آیت کا مفہوم یہ نکلے گا کہ منافقین اللہ تعالیٰ کو اور مسلمانوں کو دھوکہ دیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اور مسلمان ان کو دھوکہ دیتے ہیں حالانکہ دھوکہ دینا اللہ تعالیٰ کی شان کے خلاف ہے اور مسلمانوں کو بھی ناجائز، اس کا جواب یہ ہے کہ مفاعلت کی خاصیت اشتراک اکثری ہے کلی نہیں اس لئے کبھی باب مفاعلت معنی اشتراک سے خالی بھی ہوتا ہے جس کی مثال کلام عرب میں موجود ہے جیسے عـاقبت اللص یعنی میں نے چور کو سزا دی، اس کا معنی یہ نہیں کہ چور نے بھی مجھ کو سزا دی، لہٰذا یہاں آیت میں بھی یہی معنی مراد ہے یعنی یہ کہ مخادعت صرف منافقین کی طرف سے ہے۔

قوله. و ذکر الله فیها الخ یہ اس شبہ کے ازالہ کی طرف اشارہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ علام الغیوب ہے اور کوئی چیز اس سے مخفی نہیں، پھر منافقین کا اللہ تعالیٰ کو دھوکہ دینا کیونکر ممکن ہے؟ اور اگر اللہ تعالیٰ کو دھوکہ دینا ممکن نہیں ہے تو پھر اللہ کی طرف

خدع منافقین کی نسبت کیوں کی گئی؟

اس شبہ کے چند جوابات ہیں پہلا جواب تو وہی ہے جو حضرت مفسر نے دیا، یعنی یہ کہ یہاں کلمۂ جلالت محض تحسین کلام کے لئے ہے اور اسناد حقیقی نہیں بلکہ مجازی ہے، جیسے "و اسئل القریة" میں قریہ کی طرف اسناد مجازی ہے اور تقدیری عبارت "و اسئل اهل القریة" ہے، اسی طرح یہاں اصل عبارت "یخدعون رسول الله" ہے مضاف کو حذف کر کے مضاف الیہ کی طرف اسناد کر دی گئی، گویا اس امر پر تنبیہ مقصود ہے کہ رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو دھوکہ دینے کی کوشش حقیقت میں اللہ تعالیٰ کو دھوکہ دینے کی کوشش ہے، یا مقصد تحسین معنوی ہے اور آیت میں استعارہ تمثیلیہ ہے، اس طرح کہ ظاہری ایمان کے معاملہ میں اللہ کے ساتھ منافقین کے حال کو ایسی رعایا کے حال سے تشبیہ دی گئی ہے جو اپنے بادشاہ کو دھوکہ دیتی ہے، اور مشبہ (اللہ کے ساتھ منافقین کا حال) کے لئے مشبہ بہ (بادشاہ کو دھوکہ دینے والی رعایا کے حال) کا استعارہ کر لیا گیا ہے۔ (صاوی)

ایک اور جواب یہ ہے کہ یہاں اسناد، منافقین کے گمان کے لحاظ سے ہے، ان کا گمان یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کو دھوکہ دیا جا سکتا ہے تو وہ اپنے گمان میں اللہ تعالیٰ کو دھوکہ دینے کی کوشش کر رہے تھے اس لئے فرمایا۔ "یخدعون الله" (مدارک)

قوله. شك و نفاق الخ یہاں سے مفسر علام قدس سرہ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ آیت میں لفظ مرض مجازی معنی میں ہے کہ مرض کا معنی حقیقی جسم کا اعتدال سے ہٹ جانا ہے۔ یہاں مجازاً نفسانی عوارضات یعنی کفر و نفاق اور شک و ارتیاب کو مرض سے تعبیر فرمایا کیونکہ جس طرح جسمانی امراض انسان کو طبعی کاموں سے روک دیتے ہیں ایسے ہی نفسانی عوارضات سے نفس کے کمالات زائل ہو جاتے ہیں، اور چونکہ یہ منافقین روحانی بیماریوں کا علاج نہیں کرتے اس لئے ان کی بیماری بڑھتی ہی جاتی ہے جیسے جسمانی امراض کا علاج ابتداءً نہ کرے تو بیماری مزید بڑھتی ہی رہتی ہے۔

قوله. بما انزله من القرآن الخ یہ منافقین کے روحانی امراض میں اضافہ کی علت کی طرف اشارہ ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ زاد لازم بھی آتا ہے اور متعدی بھی، یعنی بصورت لازم ''زیادہ ہوا'' اور بصورت متعدی زیادہ کیا۔

یہاں متعدی ہے جس کا معنی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی بیماری بڑھا دی اور بیماری بڑھانے کی صورت یہ تھی کہ جس قدر شرعی احکام بڑھتے ان کا انکار بھی بڑھتا مثلاً جب تک دس احکام آئے تو وہ دس کے منکر رہے اب دس مزید آ جانے پر بیس کے منکر ہو گئے، علیٰ ہذا جیسے جیسے قرآن کا نزول ہوتا منافقین کے کفر و نفاق میں اضافہ ہوتا رہتا، گویا یکے بعد دیگرے قرآنی آیات کا نزول منافقین کی روحانی بیماریوں میں اضافے کا سبب تھا۔

قولہ: مولم لام کے فتحہ کے ساتھ اسم مفعول ہے جس کا معنی مبتلائے اَلم ہے اور یہ حقیقت میں معذّب (عذاب یافتہ) کی صفت ہوتی ہے مگر یہاں بطور مبالغہ عذاب کی صفت ہے گویا شدت کے سبب خود عذاب بھی تکلیف محسوس کرے گا۔

صاحب کمالین کی ایک فحش غلطی:

یہاں ایک تفسیری عبارت "فیفتضحون فی الدنیا باطلاع الله نبیه علی ما ابطنوه" کا ترجمہ کمالین

کے مصنف اور دارالعلوم دیوبند کے استاذ تفسیر مولوی نعیم الدین صاحب نے یوں کیا "دنیا میں تو اس طرح ذلیل ہوں گے کہ اللہ کے نبی ان کی باطنی خباثتوں سے آگاہ کردیں گے" اسے نہ ترجمہ کہا جاسکتا ہے نہ ترجمانی کیونکہ اگر حضرت مفسر قدس سرہ بھی وہی کہنا چاہتے ہیں جو مولوی صاحب نے کہا تو عبارت صرف اس قدر ہونی چاہئے۔ "باطلاع النبی علی ما ابطنوہ" نہ کلمۂ جلالت لانے کی ضرورت تھی اور نہ ہی لفظ نبی میں کلمۂ جلالت کی طرف لوٹنے والی ضمیر کی کوئی ضرورت تھی، مگر حضرت مفسر وہ کہنا نہیں چاہتے جو مولوی صاحب نے سمجھا، مفسر علام جو فرمانا چاہتے ہیں وہ ان کی عبارت سے واضح ہے جسے عربی ادب کا ایک مبتدی بھی آسانی سے سمجھ سکتا ہے کہ لفظ اطلاع کی اضافت کلمۂ جلالت کی طرف ہے اور تفسیر میں لفظ نبی اطلاع مصدر کا مفعول ہے جس کی اضافت ضمیر مجرور کی طرف ہے جو راجع بسوئے کلمۂ جلالت ہے۔ لہٰذا عبارت کا سیدھا سادا ترجمہ یہ ہوا کہ "اللہ تعالیٰ اپنے نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو ان کے مافی الضمیر پر آگاہ کردے گا" اور یہی حضرت مفسر علیہ الرحمہ کہنا چاہتے ہیں کہ اطلاع دینے والا اللہ تعالیٰ ہے نہ کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم مگر مولوی صاحب موصوف پر حیرت ہے کہ اس قدر آسان اور واضح عبارت کو نہ سمجھ سکے اور من مانی ترجمہ کرکے ایک فحش غلطی کا ارتکاب کر بیٹھے۔

کنزالایمان روح قرآن کا ترجمان:

تمام مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر کمال وخوبی کا جامع ہے اور ہر اس چیز سے جس میں عیب ونقص ہو پاک و منزہ ہے، مگر مولوی ابوالاعلیٰ مودودی، مولوی اشرف علی تھانوی اور مولوی محمد جوناگڑھی کے نزدیک اللہ تعالیٰ کے ساتھ دھوکہ و فریب کرنا اور اس کے ساتھ چال بازی کرنا واقع ہے، اور ظاہر ہے یہ عیب ہے جس کا امکان بھی تقدیس الوہیت کے منافی ہے، اب لیجئے مذکورہ حضرات کا عقیدہ انہیں کی زبانی ملاحظہ کریں آیت کریمہ: "یخدعون اللہ والذین امنوا" کا ترجمہ یوں کرتے ہیں۔

(۱) وہ اللہ اور ایمان لانے والوں کے ساتھ دھوکہ بازی کررہے ہیں۔ (مودودی)

(۲) چال بازی کرتے ہیں اللہ سے اور ان لوگوں سے جو ایمان لاچکے ہیں۔ (تھانوی)

(۳) وہ اللہ تعالیٰ کو اور ایمان والوں کو دھوکا دیتے ہیں۔ (جوناگڑھی)

مذکورہ تراجم سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ منافقین کی دھوکہ بازی نہ صرف یہ کہ ممکن ہے بلکہ واقع ہے اور یہ اسی وقت ہوسکتا ہے جب اللہ تعالیٰ منافقین کے پوشیدہ راز سے واقف نہ ہو حالانکہ وہ علام الغیوب ہے اور کسی شی کا اس سے پوشیدہ رہنا اس کے لئے عیب ونقصان ہے، لہٰذا ثابت ہوا کہ مذکورہ مترجمین نے تقدیس الوہیت پر حملہ کرنے کی ناکام کوشش کی ہے، آیت کریمہ کا صحیح ترجمہ جو مکمل طور پہ شان الوہیت کا پاسدار ہے امام احمد رضا محدث بریلوی کا ہے آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آیت کا ترجمہ یوں کیا۔ فریب دینا چاہتے ہیں اللہ اور ایمان والوں کو، یعنی فریب دینے کی محض کوشش کرتے ہیں اس سے فریب کا وقوع یا امکان ثابت نہیں ہوتا۔

﴿وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمْ﴾ اَیْ لِهٰؤُلَآءِ ﴿لَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ﴾ بِالْكُفْرِ وَالتَّعْوِيْقِ عَنِ الْاِيْمَانِ ﴿قَالُوْٓا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ﴾ وَ لَيْسَ مَا نَحْنُ عَلَيْهِ بِفَسَادٍ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى رَدًّا عَلَيْهِمْ ﴿اَلَآ﴾ لِلتَّنْبِيْهِ ﴿اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَ لٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ﴾ بِذٰلِكَ ﴿وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ﴾ اَصْحَابُ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ﴿قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ﴾ اَلْجُهَّالُ اَیْ لَا نَفْعَلُ كَفِعْلِهِمْ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى رَدًّا عَلَيْهِمْ ﴿اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَآءُ وَ لٰكِنْ لَّا يَعْلَمُوْنَ﴾ ذٰلِكَ ﴿وَ اِذَا لَقُوْا﴾ اَصْلُهٗ لَقِيُوْا حُذِفَتِ الضَّمَّةُ لِلْاِسْتِثْقَالِ ثُمَّ الْيَاءُ لِاِلْتِقَائِهَا سَاكِنَةً مَعَ الْوَاوِ ﴿الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَ اِذَا خَلَوْا﴾ مِنْهُمْ وَ رَجَعُوْا ﴿اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ﴾ رُؤَسَائِهِمْ ﴿قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ﴾ فِی الدِّيْنِ ﴿اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ﴾ بِهِمْ بِاِظْهَارِ الْاِيْمَانِ ﴿اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ﴾ يُجَازِيْهِمْ بِاسْتِهْزَائِهِمْ ﴿وَ يَمُدُّهُمْ﴾ يُمْهِلُهُمْ ﴿فِیْ طُغْيَانِهِمْ﴾ تَجَاوُزِهِمُ الْحَدَّ بِالْكُفْرِ ﴿يَعْمَهُوْنَ﴾ يَتَرَدَّدُوْنَ تَحَيُّرًا حَالٌ ﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى﴾ اِسْتَبْدَلُوْهَا بِهٖ ﴿فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ﴾ اَیْ مَا رَبِحُوْا فِيْهَا بَلْ خَسِرُوْا لِمَصِيْرِهِمْ اِلَى النَّارِ الْمُؤَبَّدَةِ عَلَيْهِمْ ﴿وَ مَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ۝﴾ فِيْمَا فَعَلُوْا.

ترجمہ: ﴿اور جب ان سے کہا جائے﴾ یعنی ان منافقین سے ﴿زمین میں فساد نہ کرو﴾ کفر کے ذریعہ اور ایمان سے (لوگوں کو) روک کر ﴿تو کہتے ہیں ہم تو سنوارنے والے ہیں﴾ اور ہم فسادی نہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کی تردید میں فرمایا ﴿خبردار﴾ الا تنبیہ کے لئے ہے ﴿وہی فسادی ہیں مگر انہیں شعور نہیں﴾ اس فساد کا ﴿اور جب ان سے کہا جائے ایمان لاؤ جیسے اور لوگ ایمان لائے ہیں﴾ یعنی حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے اصحاب ﴿تو کہیں کیا ہم بیوقوفوں کی طرح ایمان لے آئیں﴾ یعنی جاہلوں کی طرح ہم تو ان جیسا کام نہیں کر سکتے اللہ تعالےٰ نے ان کی تردید میں فرمایا ﴿خبردار، وہی بے وقوف ہیں مگر جانتے نہیں، اور جب وہ لوگ ملتے ہیں﴾ لقوا اصل میں لقیوا تھا ثقالت کی وجہ سے ضمہ کو حذف کر دیا پھر یا اور واؤ کے درمیان اجتماع ساکنین کی وجہ سے یا کو بھی حذف کر دیا۔ (لقوا ہو گیا) ﴿ایمان والوں سے، کہتے ہیں ہم ایمان لے آئے اور جب تنہا ہوں﴾ ان سے جدا ہو کر لوٹیں ﴿اپنے شیطانوں کے پاس﴾ اپنے سرداروں کے پاس ﴿تو کہتے ہیں ہم تمہارے ساتھ ہیں﴾ دین میں ﴿ہم تو یوں ہی ہنسی کرتے ہیں﴾ ان مسلمانوں سے ایمان ظاہر کر کے ﴿اللہ ان سے استہزاء فرماتا ہے﴾ یعنی ان کے استہزاء کی انہیں سزا دے گا ﴿اور انھیں ڈھیل دیتا ہے﴾ انھیں مہلت دیتا ہے ﴿کہ اپنی سرکشی میں﴾ کفر کے ذریعہ حد سے تجاوز کرنے میں ﴿بھٹکتے رہیں﴾ حیران ہو کر سرگرداں رہیں، یہ حال ہے ﴿یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی خریدی﴾ ہدایت کو گمراہی سے تبدیل کر لیا۔ ﴿تو ان کا سودا کچھ نفع نہ لایا﴾ یعنی وہ اس میں نفع حاصل نہ کر سکے بلکہ خسارے میں رہے کہ جہنم میں انھیں جانا ہو گا جس میں انھیں ہمیشہ رہنا ہے۔ ﴿اور وہ سودے کی راہ جانتے ہی نہ تھے﴾ یعنی اپنے اس عمل میں۔

قولہ: بالکفر و التعویق عن الایمان یہ وجہ فساد کی طرف اشارہ ہے کہ منافقین خود تو کفر کے دلدل میں پھنسے

ہوئے تھے ہی دوسرے لوگوں کو بھی اسلام اور مسلمانوں سے بہکا کر ایمان لانے سے باز رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ اور یہ چیز فساد فی الارض کی جڑ تھے لہٰذا اس سے انھیں روکا گیا۔ گویا آیت "لا تفسدوا فی الارض میں فساد یہاں مجازی معنی میں ہے اور حقیقی معنی یعنی شی کا حد اعتدال سے نکل جانا مراد نہیں۔

قولہ: و لیس ما نحن علیه بفساد اس عبارت سے حضرت مفسر علیہ الرحمہ نے اس اعتراض کی طرف اشارہ کیا ہے کہ "لا تفسدوا" کے جواب میں ان کا "إنما نحن مصلحون" کہنا کیسے درست ہو سکتا ہے؟ جواب کا حاصل یہ ہے کہ جب بطور حصر اپنے لئے اصلاح ثابت کیا تو افساد کی نفی ہو گئی اب جب کہ منافقین کو فساد فی الارض سے روکا گیا تو چونکہ مفسدین کا دستور یہی رہا ہے کہ وہ اپنی ریشہ دوانیوں کو اصلاح سمجھتے ہیں اور اپنے گمان میں خود مصلح ہوتے ہیں اس لئے منافقین نے بھی یہی جواب دیا کہ ہم فسادی نہیں بلکہ مصلح ہیں۔ گویا انھوں نے فساد کو صلاح سمجھ رکھا تھا، اس توضیح سے یہ اعتراض بھی ختم ہو گیا کہ منافقین کا فساد امر محسوس تھا کہ وہ مسلمانوں کے خلاف تھے۔ اور جنگ وغیرہ میں مخالفین اسلام کی طرفداری کرتے تھے پھر انھوں نے اس محسوس فساد کو صلاح سے کیوں تعبیر کیا؟

قولہ: للتنبیه چونکہ آلاَ چند معانی کے لئے آتا ہے مثلاً عرض، تخصیص اور تنبیہ کے لئے لہٰذا مفسر علام نے واضح کیا کہ یہاں آخری معنی میں ہے یعنی مابعد کی تحقیق پر تنبیہ مقصود ہے کہ منافقین کا ہی مفسد ہونا متحقق ہے کیونکہ ہمزۂ استفہام انکاری جب نفی پر داخل ہوتا ہے تو تحقیق کا افادہ کرتا ہے کہ انکار نفی تحقیق اثبات کو مستلزم ہے۔

قولہ: اصحاب النبی اس تفسیر سے مفسر علام نے اشارہ فرمایا کہ الناس میں الف لام عہد کا ہے، آگے کی تفسیر یعنی "الجهال" الخ سے منافقین کے قول کی توضیح مقصود ہے۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ منافقین دنیا پر دین کو ترجیح دینے کی وجہ سے مسلمانوں کو بے وقوف اور جاہل کہتے تھے کہ ان کے خیال میں دنیا کا نفع نقد تھا اور دین کا ادھار اور نقد پر ادھار کو ترجیح دینے والا بے وقوف ہوتا ہے اسی لئے منافقین کہتے تھے کہ ہم بے وقوفوں کی طرح ایمان نہیں لائیں گے۔

نیز مفسر علام نے "السفہاء" کی تفسیر "جہال" سے اس لئے کی کیونکہ آگے ان کا رد کرتے ہوئے خود انھیں کو "سفہاء" کہہ کر علم کی نفی کی گئی ہے اور ظاہر ہے کہ بطور تعلیل علم کا مقابل "جہل" ہوتا ہے تو گویا بطور مجاز مرسل سفاہت (یعنی مسبب) بول کر جہالت (یعنی سبب) مراد لیا گیا ہے۔

قولہ: منہم یہ اس اعتراض کا جواب ہے کہ "خلا" کا صلہ "الی" نہیں آتا ہے۔ جواب کا حاصل یہ ہے کہ یہاں "خلا"، "رجع" کے معنی کو متضمن ہے۔ لہٰذا "الی" اسی "رجع" کا صلہ ہے اور صاحب بیضاوی نے "الی" کو "مع" کے معنی میں لے کر "خلا" کا ہی صلہ مانا ہے تب کسی تقدیر کی کوئی حاجت نہیں۔

قولہ: اصلہ لقیوا الخ یہاں سے لقوا کی تعلیل کی طرف اشارہ ہے کہ لقوا اصل میں لقیوا تھا، ی پر ضمہ بعد کسرہ دشوار تھا اس لئے ی کو ساکن کر دیا، اجتماع ساکنین ہوا یاء اور واؤ کے درمیان یاء کو حذف کر دیا، پھر واؤ کی مناسبت کے لئے "ق" کو ضمہ دے دیا لقوا ہو گیا۔

قولہ: فی الدین یہ اشارہ اس امر کی طرف ہے کہ آیت میں معیت سے معیت فی الدین مراد ہے معیت مکانی مراد نہیں کہ یہ خلاف ظاہر ہے۔

قولہ یجازیھم الخ اس عبارت سے حضرت مفسر قدس سرہ لفظ یستھزء کا معنی بیان فرماتے ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ استہزاء کا معنی ہنسی ٹھٹھا کرنا ہے اور یہ معنی مراد لینا کسی طرح درست نہیں کیوں کہ کسی کے ساتھ دل لگی کرنا یا ہنسی ٹھٹھا کرنا شان الوہیت کے منافی ہے۔

جواب کا حاصل یہ ہے کہ بطور مشاکلہ جزاء استہزاء کو بھی ''استہزاء'' سے تعبیر کر دیا گیا جیسے "جزاء سیئة سیئة مثلها" میں ہے کیونکہ برائی کا بدلہ برائی نہیں بلکہ عین انصاف ہے۔

قولہ: تجاوز ھم الحد بالکفر اس عبارت سے مفسر علام نے طغیان کا معنی بیان فرمایا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ طغیان کا لغوی معنی ہے، حد سے بڑھ جانا، اسی لئے پانی کے سیلاب کو طغیان بولتے ہیں کہ وہ بھی اپنی حد سے بڑھ جاتا ہے اور یہاں آیت میں مراد ایک مخصوص تجاوز ہے یعنی منافقین کفر و نفاق کے ذریعہ سرکشی میں تجاوز کر چکے ہیں گویا اضافت عہد کے لئے ہے تو اللہ تعالیٰ انھیں ان کی سرکشی میں اور ڈھیل دیتا ہے۔

قولہ: حال یہ اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ یہاں یعمھون، "یمدھم" یا طغیانھم کی ضمیر "ھم" سے حال واقع ہے صفت نہیں کیونکہ ضمیر موصوف نہیں بنتی۔

قولہ: ای استبدلوھا بہ. مفسر علام نے اس عبارت سے ایک سوال مقدر کا جواب دیا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوا کہ شراء نام ہے ثمن کے عوض کسی چیز کے حاصل کرنے کا اور ظاہر ہے یہاں ثمن اور مبیع کا وجود نہیں پھر یہاں شراء کا اطلاق چہ معنی دارد؟

جواب کا حاصل یہ ہے کہ آیت میں بطور استعارہ تصریحیہ تبعیہ ''شراء'' بول کر ''استبدال'' مراد لیا گیا ہے اور استبدال سے مراد ہدایت کو چھوڑ کر گمراہی اختیار کرنا ہے چونکہ ہر انسان فطرتاً دین اسلام پر پیدا ہوتا ہے۔ کما جاء فی الحدیث "کل مولود یولد علی الفطرة" منافقین نے اسی فطری ہدایت کو چھوڑ کر گمراہی اختیار کر لی جس کو قرآن نے شراء سے تعبیر فرمایا، مناسبت ظاہر ہے کہ شراء حقیقی میں بھی ایک شی یعنی ثمن کو چھوڑ کر دوسری شی یعنی مبیع کو لیا جاتا ہے،۔ اس توضیح سے یہ اعتراض بھی دفع ہو گیا کہ منافقین کے پاس ہدایت تھی ہی نہیں تو اس کے بدلے گمراہی کیسے اختیار کی۔

خیال رہے کہ یہاں "فمار بحت تجارتھم" میں استعارہ مرشحہ ہے جس میں صرف مشبہ بہ کے مناسبات ذکر کئے جاتے ہیں۔ یہاں آیت میں لفظ اشتراء مستعار منہ (مشبہ بہ) ہے اور استبدال مستعار لہ (مشبہ) ہے ربح اور تجارت مستعار منہ کے مناسبات ہیں جن کا ذکر ترشیح کہلاتا ہے۔

قولہ: فمار بحوا الخ. یہ بھی ایک سوال کا جواب ہے، سوال یہ ہے کہ آیت میں ربح کی نسبت تجارت کی طرف کی گئی ہے حالانکہ نفع و نقصان اٹھانا تاجر کی صفت ہے نہ کہ تجارت کی۔ جواب یہ ہے کہ آیت میں ربح کی اسناد تجارت کی طرف مجاز عقلی کے طور پر ہے حقیقت میں نہیں جیسے اس شعر میں

اشاب الصغیر و افنی الکبیر ۔ کر الغداۃ و مر العشی
چھوٹے کو جوان کردیا اور بوڑھے کو فنا کردیا ۔ صبح و شام کے بار بار آنے جانے نے

یہاں اشاب اور افناء کی اسناد کر الغداۃ اور مر العشی کی طرف حقیقی نہیں بلکہ بطور مجاز عقلی ہے کیونکہ جوانی عطا کرنے والا اور موت دینے والا حقیقت میں اللہ تعالیٰ ہے، اسی طرح آیت میں تجارت کی طرف ربح کی اسناد بطور مجاز عقلی ہے۔

کنزالایمان محتاط ترین ترجمۂ قرآن:

آیت کریمہ: "اَللّٰہ یستھزیٔ بھم" کا ترجمہ بہت سارے مترجمین نے لفظ استہزاء کے لغوی معنی کے ساتھ کردیا ہے اور انہیں یہ سوچنے کی قطعی توفیق نہیں ہوئی آیا کہ استہزاء کا لغوی معنی بارگاہ الوہیت کے مناسب ہے یا منافی؟ مترجمین قرآن میں صرف اعلیٰ حضرت محدث بریلوی قدس سرہ کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ آپ ترجمہ کرتے وقت تفاسیر پر بھی نظر رکھتے ہیں اور ہر لفظ کے معانی پر بھی اور پھر منتخب معنی کے ساتھ تفاسیر کے مطابق ایسا ناپا تلا اور محتاط ترجمہ کرتے ہیں کہ کسی کو انگلی رکھنے کی گنجائش نہیں ملتی، البتہ اگر کوئی لفظ ایسا آ گیا جس کے چند معانی میں سے کوئی بھی معنی بارگاہ احدیت کے مناسب نہیں ہے تو پھر آپ علیہ الرحمہ اسی قرآنی لفظ کو لے کر ترجمہ کردیتے ہیں تاکہ بارگاہ الوہیت کے منافی کوئی لفظ کلک رضا سے نہ نکل سکے اور اعتراض کے راستے مسدود رہیں۔ اب مذکورہ آیت کے تراجم پر ایک نظر۔

(۱) اللہ ان سے مذاق کر رہا ہے۔[مودودی] (۲) اللہ تعالیٰ بھی ان سے مذاق کرتا ہے۔[مولوی محمد جونا گڑھی غیر مقلد] (۳) اللہ ہنسی کرتا ہے ان کے ساتھ۔[مولوی عاشق الٰہی دیوبندی میرٹھی]

استہزاء عربی لفظ ہے جس کا اردو ترجمہ ہے مذاق اور مذاق کے معانی اردو کی مشہور لغت "فیروز اللغات" میں یوں ہیں، تمسخر کرنا، ہنسی کرنا، ٹھٹھا کرنا، دل لگی کرنا۔ ان تراجم میں سے کسی کی بھی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کرنا درست نہیں اور چونکہ مذکورہ تراجم لفظ مذاق کے مدلولات ہیں اس لئے لفظ مذاق کی نسبت بھی اللہ عزوجل کی بارگاہ کے مناسب نہیں، اب سرکار اعلیٰ حضرت کا ترجمہ دیکھئے لکھتے ہیں: "اللہ ان سے استہزاء فرماتا ہے جیسا اس کی شان کے لائق ہے۔ (کنزالایمان) چونکہ لفظ استہزاء کا اردو زبان میں کوئی ایسا معنی نہیں مل سکا جس کا استعمال یہاں درست ہوتا، اس لئے آپ نے ترجمہ میں وہی لفظ رکھا جو کلام الٰہی میں موجود ہے۔ پھر بھی آگے یہ لکھ دیا: "جیسا اس کی شان کے لائق ہے" اس طرح ترجمہ پر اعتراض کی گنجائش باقی نہیں رہتی جب کہ مذکورہ دیگر تراجم سے ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ منافقین کے ساتھ ہنسی، مذاق اور دل لگی کرتا ہے حالانکہ یہ معنی کسی طرح درست نہیں۔ اب واضح ہوگیا کہ تراجم قرآن میں محتاط ترین ترجمہ کنزالایمان ہے جس میں نازک مقامات پر بھی حضرت مترجم نے بڑی خوبی کے ساتھ اپنا فرض نبھایا ہے۔

﴿مَثَلُھُمْ﴾ صِفَتُھُمْ فِیْ نِفَاقِھِمْ ﴿کَمَثَلِ الَّذِی اسْتَوْقَدَ﴾ اَوْقَدَ ﴿نَارًا﴾ فِیْ ظُلْمَۃٍ ﴿فَلَمَّآ اَضَآءَتْ﴾ اَنَارَتْ ﴿مَاحَوْلَہٗ﴾ فَاَبْصَرَ وَ اسْتَدْفَأَ وَ اَمِنَ مَا یَخَافُہٗ ﴿ذَھَبَ اللّٰہُ بِنُوْرِھِمْ﴾ اَطْفَأَہٗ وَ جَمَعَ

الضَّمِیْرِ مُرَاعَاۃً لِمَعْنَی الَّذِیْ ﴿وَ تَرَکَھُمْ فِیْ ظُلُمٰتٍ لَا یُبْصِرُوْنَ۝﴾ مَا حَوْلَھُمْ مُتَحَیِّرِیْنَ عَنِ الطَّرِیْقِ خَائِفِیْنَ فَکَذٰلِكَ ھٰٓؤُلَاۗءِ اٰمَنُوْا بِاِظْھَارِ کَلِمَۃِ الْاِیْمَانِ فَاِذَا مَاتُوْا جَاۗءَ ھُمُ الْخَوْفُ وَ الْعَذَابُ ھُمْ ﴿صُمٌّ﴾ عَنِ الْحَقِّ فَلَا یَسْمَعُوْنَہٗ سِمَاعَ قَبُوْلٍ ﴿بُکْمٌ﴾ خُرْسٌ عَنِ الْخَیْرِ فَلَا یَقُوْلُوْنَہٗ ﴿عُمْیٌ﴾ عَنْ طَرِیْقِ الْھُدٰی فَلَا یَرَوْنَہٗ فَھُمْ ﴿لَا یَرْجِعُوْنَ۝﴾ عَنِ الضَّلَالَۃِ.

ترجمہ: ﴿ان کی کہاوت﴾ نفاق میں ان کی حالت ﴿اس کی طرح ہے جس نے آگ روشن کی﴾ تاریکی میں ﴿توجب اس سے آس پاس سب جگمگا اٹھا﴾ تو وہ دیکھنے لگا اور حرارت حاصل کی اور خوفناک چیزوں سے مامون ہوگیا ﴿اللہ ان کا نور لے گیا﴾ اسے بجھادیا، اور نورھم میں جمع کی ضمیر لانے میں الذی کے معنی کی رعایت کی گئی ہے۔ ﴿اور انھیں تاریکیوں میں چھوڑ دیا کہ کچھ نہیں دیکھتے﴾ اپنے آس پاس، راستہ کے متعلق حیران وخوفزدہ ہیں، تو یہی حال ان منافقین کا ہے کہ کلمۂ ایمان ظاہر کر کے زبانی ایمان لائے مگر جب مریں گے تو انھیں خوف اور عذاب کا سامنا ہوگا، یہ لوگ ﴿بہرے ہیں﴾ حق کی سماعت سے لہذا اسے قبول کرنے کی غرض سے نہیں سنتے ﴿گونگے ہیں﴾ بھلی بات سے لہٰذا اسے کہہ نہیں سکتے ﴿اندھے ہیں﴾ راہ ہدایت سے لہٰذا اسے نہیں دیکھتے ﴿تو وہ پھر لوٹنے والے نہیں﴾ گمراہی سے۔

توضیح و تشریح: قولہ: صفتھم فی نفاقھم. مثل لغت میں بمعنی مثل اور مانند ہے یوں ہی اس کا معنی صفت (بیان) اور قصہ بھی ہوتا ہے لہٰذا مفسر علام نے لفظ "صفتھم" کہہ کر اشارہ فرمایا کہ یہاں لفظ مثل صفت (بیان) کے معنی میں ہے جیسے اس آیت میں۔ "و للہ المثل الاعلیٰ اللہ کی صفت بہت بلند ہے۔ اور یہ معنی اس لئے راجح قرار دیا گیا ہے تا کہ "کمثل" میں کاف کو زائدہ نہ ماننا پڑے۔

عربی زبان میں مِثل، مَثَل، مَثیل اور شِبہ، شَبہ شبیہ ایک ہی معنی کے لئے آتے ہیں پھر مثل اس کہاوت کو کہنے لگے۔ جس میں کسی چیز کی غرابت (عمدگی) کی وجہ سے موقع بیان کو اصل حال کے ساتھ تشبیہ دینا منظور ہو، علماے بلاغت کے نزدیک تشبیہ اور مثل میں فرق یہ ہے کہ مثل کلام مرکب ہوتا ہے اور تشبیہ مفرد و مرکب دونوں کو شامل ہوتا ہے۔

خیال رہے [illegible] میں تشبیہ تمثیلی ہے جس کا دوسرا نام تشبیہ مرکب بمرکب ہے اور جس میں مشبہ و مشبہ بہ دونوں کی ایسی ہیئت ہوتی ہے جو [illegible] سے مل کر بنتی ہے جیسے بشّار بن بُرد کا یہ شعر

کأن مثار النقع فوق رؤوسنا
و اسیافنا لیل تهاوی کواکبه

گویا (گھوڑ[illegible]پوں سے) اڑی ہوئی گرد جو ہمارے سروں پر ہے، اور ہماری تلواریں ایک رات ہے جس کے ستارے ٹوٹ ٹوٹ کر گرتے ہیں۔

یہاں شاعر نے غبار کی اس ہیئت کو جس میں تلواریں کوندرہی ہوں مشبہ بنایا ہے اور رات کی اس ہیئت کو جس میں ستارے ٹوٹ ٹوٹ کر گررہے ہوں مشبہ بہ بنایا ہے، یعنی مشبہ اور مشبہ بہ دونوں مرکب ہیں اسی طرح یہاں آیت میں منافقین کی

حالت مشبہ ہے جو چند امور سے مرکب ہے۔ (۱) مدینہ شریف میں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی آمد سے قبل جہالت کی تاریکی تھی۔ (۲) حضور تشریف لائے تو نور اسلام سے جہالت کی تاریکی دور ہوئی لوگ حق و باطل میں امتیاز کرنے لگے۔ (۳) پھر کچھ لوگوں نے اغراض دنیا کے لئے نفاق اختیار کرلیا اور کفر کی تاریکی میں جا پھنسے یہی لوگ ہیں جنہیں قرآن نے منافق کہا۔ مذکورہ تین امور سے منافقین کی حالت منتزع ہے جسے تشبیہ دی گئی ہے ایسے شخص کی حالت سے جس نے تاریکی میں آگ روشن کی جب اس آگ سے ہر چہار جانب روشنی پھیل گئی تو وہ آگ اچانک بجھ گئی اب آگ روشن کرنے والے شخص کو تاریکی نے گھیر لیا اور اسے کچھ نظر نہیں آتا یہی مشبہ بہ ہے ظاہر ہے یہ چند امور سے منتزع ہے۔

قولہ: اوقد. یہاں استوقد کی تفسیر اوقد سے کر کے اشارہ فرمایا کہ استوقد میں باب استفعال کی خاصیت موافقت افعل پائی جاتی ہے، لہٰذا جس طرح استجاب اجاب کے معنی میں آتا ہے۔ اسی طرح یہاں استوقد اوقد کے معنی میں ہے۔

قولہ: انارت — یہاں اضاءت کی تفسیر انارت سے اس لئے فرمائی کہ اضاءت میں لازم اور متعدی دونوں کا احتمال ہے مگر یہاں متعدی ہے اور معنی ہوگا۔ جب کہ خوب چمکا دیا اس آگ نے آس پاس کی جگہ کو اور لازم ہونے کی صورت میں معنی یوں ہوتا ''جب کہ چمک گئی آس پاس کی جگہ'' اور ظاہر ہے کہ آس پاس کی جگہ از خود نہیں چمکی بلکہ آگ کی تیز روشنی نے اسے چمکایا نیز متعدی ہونے کی صورت میں اس کا فاعل "ھی" ضمیر راجع بسوئے "نار" ہوگی جب کہ لازم ماننے کی صورت میں "ماحولہ" فاعل بنے گا اور پھر فعل فاعل میں مطابقت کے لئے "ما" سے "مواضع و اماکن" مراد لینے کی تاویل کی ضرورت پڑے گی، لہٰذا مفسر علام نے واضح کیا کہ یہاں اضاءت متعدی ہے لازم نہیں۔

قولہ. اطفأہ الخ یہ ذھب اللہ کے حاصل معنی کی طرف اشارہ ہے عربی زبان میں ذھب بہ اور اذھبہ کے ایک ہی معنی ہیں یعنی اس کو لے گیا، لیکن ذھب بہ وہاں بولا جاتا ہے جہاں بالکل لے گیا ہو اور واپسی کی امید نہ ہو جب کہ اذھبہ میں یہ دونوں باتیں نہیں پائی جاتی ہیں، کہتے ہیں ذھب السلطان بمالہ بادشاہ نے اس کا سارا مال بالکل ضبط کرلیا، یعنی کچھ نہ چھوڑا اور اس کی واپسی کی امید بھی نہیں، یہاں آیت میں ذھب اللہ اسی لئے فرمایا تاکہ معلوم ہو کہ اللہ تعالیٰ نے ان کا نور بالکل ہی بجھا دیا اور اسی معنی کی طرف مفسر علام نے اطفأہ سے اشارہ فرمایا ہے۔

آگے جمع الضمیر سے یہ بتانا مقصود ہے کہ استوقد واحد کا صیغہ لانے میں الذی کی لفظی رعایت ہے اور بنورھم میں جمع کی ضمیر لانے میں الذی کے معنی کی رعایت ہے کیونکہ الذی لفظاً واحد اور معنیً جمع ہے۔ باقی آگے کی تفسیر واضح ہے۔

﴿اَوْ﴾ مَثَلُهُمْ ﴿كَصَيِّبٍ﴾ اَىْ كَاَصْحَابِ مَطَرٍ وَ اَصْلُهٗ صَيْوِبٌ مِنْ صَابَ يَصُوْبُ اَىْ يَنْزِلُ ﴿مِنَ السَّمَآءِ﴾ اَىِ السَّحَابِ ﴿فِيْهِ﴾ اَىِ السَّحَابِ ﴿ظُلُمٰتٌ﴾ مُتَكَاثِفَةٌ ﴿وَ رَعْدٌ﴾ هُوَ الْمَلَكُ الْمُوَكَّلُ بِهٖ وَ قِيْلَ صَوْتُهٗ ﴿وَ بَرْقٌ﴾ لَمَعَانُ سَوْطِهِ الَّذِىْ يَزْجُرُهٗ بِهٖ ﴿يَجْعَلُوْنَ﴾ اَىْ اَصْحَابُ الصَّيِّبِ ﴿اَصَابِعَهُمْ﴾ اَىْ اَنَامِلَهَا ﴿فِىْ اٰذَانِهِمْ مِنَ﴾ اَجْلِ ﴿الصَّوَاعِقِ﴾ شِدَّةِ صَوْتِ الرَّعْدِ لِئَلَّا يَسْمَعُوْهَا ﴿حَذَرَ﴾ خَوْفَ

﴿الموت﴾ من سماعها کذلك هؤلاء اذا نزل القرآن و فیه ذکر الکفر المشبه بالظلمات و الوعید علیه المشبه بالرعد و الحجج البینة المشبه بالبرق یسدون آذانهم لئلا یسمعوه فیمیلوا الی الایمان و ترك دینهم و هو عندهم موت ﴿و الله محیط بالکفرین﴾ علما و قدرة فلا یفوتونه ﴿یکاد﴾ یقرب ﴿البرق یخطف ابصارهم﴾ یاخذها بسرعة ﴿کلما اضآء لهم مشوا فیه﴾ ای فی ضوئه ﴿و اذا اظلم علیهم قاموا﴾ وقفوا تمثیل لازعاج ما فی القرآن من الحجج قلوبهم و تصدیقهم بما سمعوا فیه مما یحبون و وقوفهم عما یکرهون ﴿و لوشآء الله لذهب بسمعهم﴾ بمعنی اسماعهم و ابصارهم الظاهرة کما ذهب بالباطنة ﴿ان الله علی کل شیء﴾ شاءه ﴿قدیر﴾ و منه اذهاب ما ذکر.

حل اللغات: ﴿المثل﴾ مشابہ، نظیر، مانند، کہاوت، جمع امثال ﴿اصحاب مطر﴾ بارش والے ﴿السحاب﴾ بادل جمع سُحُب ﴿متکاثفة﴾ سخت تر، گنجان، دبیز ﴿لمعان﴾ چمک، روشنی، ﴿السوط﴾ کوڑا، چابک جمع اسواط و سیاط ﴿زجر یزجر [ن]﴾ ڈانٹنا، منع کرنا، چلا کر دھتکارنا ﴿الرعد﴾ بادل کی گرج۔ ﴿البرق﴾ بجلی، جمع بروق ﴿یسدون اٰذانهم﴾ وہ اپنے کانوں کو بند کرلیتے ہیں ﴿یاخذها بسرعة﴾ اسے جلدی سے اُچک لے گی۔
﴿الحجج﴾ دلیل، برہان واحد الحجة.

ترجمہ: ﴿یا﴾ ان کی کہاوت ﴿جیسے اترتا پانی﴾ یعنی بارش والوں جیسی ہے اور صیب اصل میں صیوب تھا صاب یصوب بمعنی اترنا سے بنا ہے۔ ﴿آسمان سے﴾ یعنی بادل سے ﴿کہ اس میں﴾ یعنی بادل میں ﴿اندھیریاں ہیں﴾ تہ بہ تہ ﴿اور گرج﴾ رعد وہ فرشتہ ہے جو بادل پر مقرر ہے اور بعض نے کہا کہ رعد اسی فرشتہ کی آواز ہے۔ ﴿اور چمک﴾ برق فرشتہ کے اس کوڑے کی چمک ہے جس سے وہ بادل کو ہانکتا ہے ﴿وہ ٹھونس رہے ہیں﴾ یعنی بارش والے ﴿اپنی انگلیوں کو﴾ یعنی ان کے پوروں کو ﴿اپنے کانوں میں کڑک کے سبب﴾ گرج کی آواز کی شدت سے تاکہ وہ اسے نہ سن سکیں ﴿موت کے ڈر سے﴾ اس کو سن کر (مرنہ جائیں)، یہی حالت ان کی ہے کہ جب قرآن نازل ہوا اور اس میں کفر کا ذکر ہے جس کو ظلمات سے تشبیہ دی گئی ہے، اور کفر پر وعید کا ذکر ہے جس کو رعد سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اور واضح دلائل ہیں جن کو برق سے تشبیہ دی گئی ہے تو وہ اپنے کانوں کو بند کرلیتے ہیں تاکہ اسے سن کر کہیں ایمان کی طرف اور ترک مذہب کی طرف مائل نہ ہوجائیں کہ ایسا ہونا ان کے نزدیک موت ہے ﴿اور اللہ کافروں کو گھیرے ہوئے ہے﴾ علم و قدرت کے لحاظ سے لہٰذا وہ بچ نہیں سکتے۔
﴿یوں معلوم ہوتی ہے کہ بجلی ان کی نگاہیں اچک لے جائے گی﴾ تیزی سے چھین لے گی ﴿جب کچھ چمک ہوئی اس میں چلنے لگے﴾ یعنی اس کی روشنی میں ﴿اور جب اندھیرا ہوا کھڑے رہ گئے﴾ یہ (سب یعنی (۱) گرج اور چمک سے ان کا خوف زدہ ہونا (۲) روشنی ہونے پر چلنا (۳) اندھیرا ہونے پر ٹھہر جانا علی الترتیب) تمثیل ہے۔ (۱) قرآنی دلائل کے ان کے دلوں کو دہلا دینے (۲) اور اپنی پسندیدہ چیزوں کو سن کر تصدیق کرنے (۳) اور ناموافق چیزوں کو سن کر توقف کرنے کی ﴿اور اللہ چاہتا تو ان کے کان اور آنکھیں لے جاتا﴾ مراد ظاہری کان اور آنکھ ہیں جیسے باطنی سلب کرلئے ﴿بیشک اللہ ہر چیز پر﴾ جس کا

ارادہ فرمالے ﴿قادر ہے﴾ منجملہ اس کے مذکورہ چیزوں کا سلب بھی ہے۔

توضیح و تشریح: شان نزول: منافقوں میں سے دو شخص حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے پاس سے مشرکین کی طرف بھاگے، راستے میں بارش آگئی جس کا اس آیت میں ذکر ہو رہا ہے، اس میں سخت گرج اور چمک تھی، ان کا یہ حال ہوا کہ جب گرج ہوتی تو کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے کہ کہیں اس سے ہمارے کان نہ پھٹ جائیں، اور جب چمک ہوتی تو چلنے لگتے، جب اندھیری ہو جاتی ٹھہر جاتے، آپس میں کہنے لگے کہ شاید اس گناہ سے ہم پر مصیبت آئی ہے، خدا خیر سے سویرا کردے۔ تو ہم حضور کی خدمت میں واپس جا کر ان کے ہاتھ میں ہاتھ دے دیں گے، رب نے ان پر فضل فرمایا اس مصیبت سے نجات دی تو انھوں نے ایسا ہی کیا کہ سچے مسلمان بن گئے اور پھر اسلام پر ہمیشہ قائم رہے۔ اس موقع پر یہ آیت کریمہ اتری، حق تعالیٰ نے ان کے اس واقعہ کو باقی منافقین کے لئے کہاوت بنا دیا اور اس قصے کو ان کی روش پر منطبق فرمایا۔ (خزائن العرفان)

قولہ: مثلهم — او کے بعد مثلهم سے حضرت مفسر قدس سرہ نے واضح فرمایا کہ "کصیب" کا عطف "کمثل الذی" پر ہے۔ لہٰذا یہاں بھی مبتدا "مثلهم" ملحوظ رہے گا۔ واضح رہے کہ کلمہ "او" چند معانی کے لئے آتا ہے اور یہاں محض تسویہ بین الشیئین کے لئے ہے یعنی دونوں مثالیں منافقین پر منطبق ہونے میں برابر ہیں۔

قولہ: ای کاصحاب مطر — اس تفسیر سے اشارہ فرمایا کہ یہاں صیب بمعنی بارش ہے جس کا مضاف محذوف ہے، اور صیب بنا ہے صاب یصوب سے جس کا معنی ہے اترنا، اصل میں صیوب تھا واؤ اور یاء ایک کلمہ میں جمع ہوئے اور ان میں کا پہلا ساکن تھا لہٰذا "سید" کے قاعدہ سے واؤ کو یاء سے بدل دیا دو حرف ایک جنس کے جمع ہوئے ایک کو دوسرے میں ادغام کر دیا صیّب ہو گیا۔

قولہ: السحاب. السماء کی تفسیر السحاب سے کر کے حضرت مفسر علیہ الرحمہ نے اشارہ فرمایا ہے کہ یہاں آیت میں سماء سے مراد سحاب یعنی بادل ہے، وجہ یہ ہے کہ عربی میں سماء ہر اس چیز کو بولتے ہیں جو اوپر ہو چونکہ آسمان اور بادل دونوں اوپر ہیں اس لئے سماء بول کر کبھی آسمان اور کبھی بادل مراد لیتے ہیں۔ یہاں سماء سے مراد بادل ہے کیونکہ بارش بادل سے ہی اترتی ہے۔ آگے فیہ کے بعد سحاب مقدر مان کر مرجع کی طرف اشارہ فرمایا ہے مگر یہ بھی صحیح ہے کہ فیہ کی ضمیر کا مرجع صیب کو بنایا جائے اور بارش کی تاریکی مراد لی جائے۔

قولہ: هو الملك المؤكل به الخ رعد کی یہ تفسیر اور آگے برق کی تفسیر ایک مرفوع حدیث سے ماخوذ ہے جسے ترمذی نے حضرت ابن عباس سے نقل کی ہے اور تفسیر روح البیان میں بھی اسی مقام پر منقول ہے کہ ایک دفعہ یہودیوں نے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ رعد اور برق کیا چیز ہے؟ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ رعد اس فرشتے کا نام ہے جو بادلوں پر مقرر ہے اور یہ آواز اسی فرشتہ کی ہے جو بادلوں کو جھڑکنے سے پیدا ہوتی ہے اور برق اس کا آتشی کوڑا ہے جس سے بادلوں کو ہانکتا ہے۔

اسی حدیث کے پیش نظر بعض مفسرین نے فرمایا کہ رعد اسی فرشتے کا نام ہے جیسا کہ یہاں مفسر علام کی رائے بھی یہی

ہے اور بعض حضرات نے فرشتے کی آواز کو رعد کہا ہے جیسا کہ یہاں مفسر علیہ الرحمہ نے قیل سے اس کی طرف اشارہ فرمایا، اسی طرح برق کے متعلق بعض مفسرین نے فرمایا کہ یہ اسی فرشتے کا کوڑا ہے جیسا کہ مذکورہ حدیث سے ظاہر ہے اور بعض نے کہا کہ اس فرشتے کے کوڑے کی چمک ہے جیسا کہ یہاں مفسر قدس سرہ نے بھی یہی کہا۔

مگر فلاسفہ کہتے ہیں کہ پانی گرمی سے بخار بن جاتا ہے جو زمین سے بھاپ بن کر اوپر کی طرف اڑتا ہے اسی طرح زمین سے دھواں بھی اوپر کی طرف اڑتا ہے، یہ زمین کا دھواں جب ہوا کی حرکت سے آگے بڑھ کر کرۂ آگ تک پہنچتا ہے اور وہاں جاکر روشن ہو جاتا ہے تو کبھی تو چند روز تک روشن رہتا ہے اور دم دار ستارے اور نیزے کی شکل میں نمودار ہوتا ہے اور کبھی روشن ہو کر جلد بجھ جاتا ہے جس کو شہاب کہتے ہیں یعنی تارہ ٹوٹنا، اور کبھی روشن نہیں ہوتا بلکہ جل جاتا ہے اور آسمان کی سرخی یا سیاہی بن کر نظر آنے لگتا ہے۔

اسی طرح بخار زمین سے اٹھ کر چند صورتیں اختیار کر لیتا ہے، ایک یہ کہ زیادہ اونچا ہو کر جم جاتا ہے اور قطرہ قطرہ ہو کر زمین پر گر پڑتا ہے، اس جمے ہوئے بخار کو بادل اور ان قطروں کو بارش کہتے ہیں، اور کبھی یہ بخار زیادہ اونچا نہیں جاتا بلکہ زمین کے قریب ہی سردی سے جم کر گر جاتا ہے، اس کو شبنم یا اوس کہتے ہیں۔ اور کبھی سخت سردی کی وجہ سے یہ بخار راستہ ہی سے جم کر زمین پر گر پڑتا ہے اس کو اولہ کہتے ہیں۔ یہ بخار اور دھواں کے الگ الگ حالات ہوئے مگر کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ آفتاب کی گرمی پاکر بخار، دھواں اور غبار مخلوط ہو کر زمین سے اوپر اٹھتے ہیں اور وہاں پہنچ کر الگ الگ ہو جاتے ہیں غبار الٹا واپس ہوتا ہے اس کا نام آندھی ہے، لیکن بخار اور دھواں ٹھنڈک کی حد کو پہنچتے ہیں جہاں بخار ٹھنڈا ہو کر بادل بن جاتا ہے اور دھواں اس کو چیر کر اوپر جانا چاہتا ہے جس سے سخت آواز پیدا ہوتی ہے، اسی آواز کا نام اردو میں گرج اور عربی میں رعد ہے، اور کبھی یہ دھواں تیز حرکت کی وجہ سے بھڑک کر روشن ہو جاتا ہے، اسی کو اردو میں بجلی اور عربی میں برق کہتے ہیں، اور کبھی بہت سردی کی وجہ سے یہ دھواں بھی جم کر زمین کی طرف لوٹتا ہے، یہ جما ہوا دھواں جب بادل کو چیرتا ہے تو اس سے سخت آواز پیدا ہوتی ہے اور یہ دھواں زمین پر گر کر بہت سی چیزوں کو فنا کر دیتا ہے۔ اسی کو اردو میں بجلی گرنا اور عربی میں صاعقہ کہتے ہیں۔ (تفسیر نعیمی، حقانی)

قولہ: ای اناملھا. اصابع کی تفسیر انامل سے کر کے حضرت مفسر نے اس کے مجازی معنی مراد ہونے کی طرف اشارہ کیا اور مقصود خوفناک گرج کے عدم سماع میں مبالغہ پیدا کرنا ہے یعنی وہ خوف اور دہشت سے گویا ساری انگلیاں کانوں میں ٹھونسنے کی کوشش کرتے ہیں۔

قولہ: شدت صوت الرعد. یہ صواعق کی تفسیر ہے، صواعق صاعقہ کی جمع ہے، اس بجلی کو کہتے ہیں جو کسی چیز پر گر کر اس کو جلا ڈالتی ہے، چونکہ مفسر علام نے رعد کے متعلق دو قول نقل کئے ہیں اس لئے یہاں تفسیری عبارت میں اضافت کی دو صورتیں نکلیں گی، اگر رعد سے مراد فرشتہ کی ذات ہے تو اضافت حقیقیہ ہے، اور اگر رعد سے مراد فرشتہ کی آواز ہے تو اضافت بیانیہ ہے۔ (صاوی)

قولہ: کذلک ھؤلاء الخ. یہاں سے حضرت مفسر قدس سرہ مشبہ کا حال بیان کر کے تشبیہ مفرد بالمفرد کی وضاحت

کرنا چاہتے ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ کصیب من السماء سے جو تمثیل بیان کی گئی ہے یہ چند تشبیہات کا مجموعہ ہے وہ اس طرح کہ قرآن میں کفر کا ذکر ہے جو مشبہ ہے اور اس کو تشبیہ دی گئی ہے ظلمت یعنی تاریکی سے لہٰذا یہاں ظلمت مشبہ بہ ہوا۔ قرآن میں کفر اختیار کرنے پر جو وعید ہے وہ مشبہ ہے جس کو تشبیہ دی گئی ہے رعد سے لہٰذا یہاں رعد مشبہ بہ ہوا۔ قرآن میں جو واضح دلائل ہیں وہ مشبہ ہیں جن کو تشبیہ دی گئی ہے برق سے لہٰذا برق مشبہ بہ ہوا۔

قوله علماً و قدرةً الخ یہ دفع دخل مقدر ہے جس کی قدرے تفصیل یہ ہے کہ محیط بنا ہے احاطہ سے جس کا معنی ہے کسی چیز کے ارد گرد اس طرح گھیرا ڈال لینا کہ وہ چیز بالکل درمیان میں آ جائے۔ لہٰذا و اللّٰہ محیط کا لفظی معنی ہوگا ''اللہ کافروں کو گھیرے ہوئے ہے'' اور یہ معنی اللہ تعالیٰ کے حق میں محال ہے کہ جسم و جسمانیت کو مستلزم ہے، جواب کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ علم و قدرت کے لحاظ سے کفار کو گھیرے ہوئے ہے یعنی کفار اللہ تعالیٰ کے علم و قدرت سے باہر نہیں فلا اعتراض۔

قوله: شائه — شیٔ کا لغوی معنی ہے چاہنا اور اس کی تفسیر "شاء ہ" سے کر کے یہ اشارہ کیا کہ مصدر اسم مفعول کے معنی میں ہے تو شی سے مراد ہر وہ ہے جس کا تعلق چاہنے سے ہو، واضح ہو کہ شی کا معنی چیز بھی ہوتا ہے تو اس آیت کا ترجمہ ہوگا بیشک اللہ ہر چیز پر قادر ہے، اور چیز اسے کہتے ہیں جو موجود ہو، لہٰذا یہاں ایک اشکال پیدا ہوا کہ اللہ تعالیٰ بھی موجود ہے لہذا اس کی ذات اور صفات بھی تحت قدرت ہوں گی۔ حالانکہ ذات اور صفات میں تغیر حدوث کو مستلزم ہے جو اللہ تعالیٰ کے لئے عیب ہے۔ حضرت مفسر قدس سرہ نے شائه کہہ کر اسی اشکال کو دفع کیا ہے اور واضح کیا کہ یہاں شی مصدر، اسم مفعول کے معنی میں ہے لہٰذا آیت کا معنی ہوگا کہ اللہ تعالیٰ ہر اس چیز پر قادر ہے جو اس کے چاہنے اور ارادے میں آ سکے۔ اور وہ چیزیں ممکنات ہیں کیونکہ واجب اور محال خدا کے ارادے میں نہیں آ سکتے لہٰذا وہ تحت قدرت بھی نہیں ہیں۔ اور چونکہ اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کی صفات واجب ہیں اس لئے اللہ تعالیٰ اپنی ذات و صفات پر قادر نہیں۔ اب چونکہ محالات اور واجب سے ارادۂ باری متعلق ہی نہیں ہوتا ہے، لہٰذا اس پر عدم قدرت سے ہرگز نقص اور عاجزی لازم نہیں ہے۔ نقص اور بے بسی اس صورت میں لازم آتی جب کہ ارادہ متعلق ہوتا اور حسب ارادہ نہ ہوتا۔

﴿يَـٰٓأَيُّهَا النَّاسُ﴾ اَیْ اَهْلَ مَكَّةَ ﴿اُعْبُدُوْا﴾ وَحِّدُوْا ﴿رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ﴾ اَنْشَأَكُمْ وَ لَمْ تَكُوْنُوْا شَیْئًا وَ خَلَقَ ﴿وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ o﴾ بِعِبَادَتِهٖ عِقَابَهٗ وَ لَعَلَّ فِی الْاَصْلِ لِلتَّرَجِّیْ وَ فِیْ كَلَامِهٖ تَعَالٰی لِلتَّحْقِيْقِ ﴿اَلَّذِیْ جَعَلَ﴾ خَلَقَ ﴿لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا﴾ حَالٌ بِسَاطًا يُفْتَرَشُ لَا غَايَةَ لَهَا فِی الصَّلَابَةِ اَوِ اللُّيُوْنَةِ فَلَا يُمْكِنُ الْاِسْتِقْرَارُ عَلَيْهَا ﴿وَ السَّمَآءَ بِنَآءً﴾ سَقْفًا ﴿وَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ﴾ اَنْوَاعِ ﴿اَلثَّمَرَاتِ رِزْقًا لَّكُمْ﴾ تَاْكُلُوْنَهٗ وَ تَعْلِفُوْنَهٗ بِهٖ دَوَابَّكُمْ ﴿فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا﴾ شُرَكَآءَ فِی الْعِبَادَةِ ﴿وَ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ o﴾ اَنَّهُ الْخَالِقُ وَ لَا يَخْلُقُوْنَ وَ لَا يَكُوْنُ اِلٰهًا اِلَّا مَنْ يَّخْلُقُ.

ترجمہ: ﴿اے لوگو!﴾ اے مکہ والو! ﴿عبادت کرو﴾ توحید بجالاؤ ﴿اپنے رب کی جس نے تمہیں پیدا کیا﴾ حالانکہ تم کچھ بھی نہیں تھے ﴿اور تم سے اگلوں کو یہ امید کرتے ہوئے کہ تم بچ جاؤ﴾ اس کی عبادات کے ذریعہ اس کے عذاب

سے اور لعل اصل میں ترجی کے لئے آتا ہے مگر کلام اللہ میں تحقیق کے لئے ہے۔ ﴿جس نے بنایا﴾ پیدا کیا ﴿تمہارے لئے زمین کو بچھونا﴾ "فراشا" حال ہے، یعنی ایسا بستر جس پر لیٹا جا سکے۔ اس کو سختی یا نرمی میں آخری حد پر نہیں بنایا کہ اس پر ٹھہرنا ہی ناممکن ہو جائے۔ ﴿اور آسمان کو عمارت﴾ چھت ﴿اور آسمان سے پانی اتارا تو اس سے نکالے کچھ﴾ مختلف قسم کے ﴿پھل، تمہارے کھانے کو﴾ کہ اسے تم کھاتے بھی ہو اور اپنے جانوروں کے لئے چارہ بھی کرتے ہو۔ ﴿تو اللہ کے لئے برابر والے نہ ٹھہراؤ﴾ عبادت میں شرکاء ﴿جان بوجھ کر﴾ یعنی جانتے سمجھتے ہوئے کہ وہی خالق ہے اور یہ انداد (شرکاء) پیدا نہیں کرتے اور الٰہ وہی ہوسکتا ہے جو خالق ہو۔

توضیح و تشریح: قولہ ای اھل مکۃ: ناس کی تفسیر اہل مکہ سے اور اعبدوا کی تفسیر توحید سے کرنے میں حضرت مفسر قدس سرہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی اتباع کی ہے، یأیها الناس کی تفسیر سے ایک اکثری قاعدہ کی طرف اشارہ کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ قرآن پاک میں اکثر الناس سے مکہ والوں کو اور الذین آمنوا سے اہل مدینہ کو خطاب ہوتا ہے۔ مگر جمہور مفسرین فرماتے ہیں کہ یہاں الناس سے تمام مکلفین اور عبادت سے اطاعت مراد ہے۔ (صاوی)

قولہ: انشأکم الخ یہ خلقکم کا معنی مراد ہے۔ حاصل یہ ہے کہ خلق جس کا لغوی معنی ہے نیستی سے ہستی میں لانا، یہ دو طرح پر ہے ایک تو یہ ہے کہ کسی ایسی چیز کو وجود بخشا جس کی نہ تو کوئی اصل ہو اور نہ کوئی نمونہ، اس کی مثال قرآن میں یہ آیت ہے خلق السمٰوٰت و الارض، دوسرے یہ کہ ایک چیز کو کسی دوسری چیز سے یا ایک چیز کو کسی دوسری چیز کے مانند بنا دینا، اس کی مثال قرآن میں یہ ہے۔ "خلق الانسان من نطفة" (سورہ نحل) خلق کا پہلا طریقہ صرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے اور دوسرا طریقہ بندوں میں بھی پایا جاتا ہے۔ (روح المعانی) یہاں آیت میں خلق سے پہلا طریقہ مراد ہے اور اسی کی طرف مفسر علام نے اپنے قول انشأکم الخ سے اشارہ فرمایا ہے۔

قولہ: و لعل فی الاصل الخ یہ ایک اشکال کا جواب ہے، اشکال یہ ہے کہ لعل عربی زبان میں ترجی اور امید کے لئے استعمال ہوتا ہے جو بارگاہ احدیت کے منافی ہے، مفسر علام نے اس کا حل یہ نکالا کہ یہاں لعل تحقیق کے لئے ہے، مگر اس اشکال کا ایک عمدہ حل یہ بھی نکل سکتا ہے کہ لعل یہاں پر بندوں کے لحاظ سے ہے نہ کہ اللہ تعالیٰ کے لحاظ سے، لہٰذا ترجی کے معنی میں لیا جائے جب بھی کوئی حرج نہیں۔ امام احمد رضا قدس سرہ نے اپنے ترجمہ: "یہ امید کرتے ہوئے......" میں اسی نکتہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔

قولہ: خلق، جعل کی تفسیر خلق سے کر کے مفسر علام نے اشارہ فرمادیا کہ یہاں جعل بمعنی اوجد متعدی بیک مفعول ہے۔ لہٰذا آگے فراشاً حال واقع ہے الارض سے، گویا حضرت مفسر نے ان علما کا رد کیا ہے جنھوں نے جَعَلَ کو بمعنی صَیَّرَ متعدی بدو مفعول مانا ہے اور فراشا کو مفعول ثانی قرار دیا ہے۔

قولہ: تعلفون بہ دوابکم اس عبارت سے اشارہ فرمایا کہ آیت میں لفظ ثمرات سے صرف پھل فروٹ ہی مرا

نہیں بلکہ زمین سے پیدا ہونے والی ہر چیز مراد ہے، چاہے وہ خود اسی کی خوراک ہو یا اس کے جانوروں کی خوراک ہو۔

﴿وَ اِنْ کُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ﴾ شَکٍّ ﴿مِمَّا نَزَّلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا﴾ مُحَمَّدٍ مِنَ الْقُرْآنِ اَنَّهٗ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ﴿فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ٥﴾ اَیِ الْمُنَزَّلِ وَ مِنْ لِلْبَیَانِ اَیْ هِیَ مِثْلُهٗ فِی الْبَلَاغَةِ وَ حُسْنِ النَّظْمِ وَ الْاِخْبَارِ عَنِ الْغَیْبِ، وَ السُّوْرَةُ قِطْعَةٌ لَهَا اَوَّلٌ وَ آخِرٌ وَ اَقَلُّهَا ثَلٰثُ اٰیَاتٍ ﴿وَ ادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ﴾ اٰلِهَتَكُمُ الَّتِیْ تَعْبُدُوْنَهَا ﴿مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ اَیْ غَیْرِهٖ لِتُعِیْنَكُمْ ﴿اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ﴾ فِیْ اَنَّ مُحَمَّدًا قَالَهٗ مِنْ عِنْدِ نَفْسِهٖ فَافْعَلُوْا ذٰلِكَ فَاِنَّكُمْ عَرَبِیُّوْنَ فُصَحَاءُ مِثْلَهٗ وَ لَمَّا عَجَزُوْا عَنْ ذٰلِكَ قَالَ تَعَالٰی ﴿فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا﴾ مَا ذُكِرَ لِعِجْزِكُمْ ﴿وَ لَنْ تَفْعَلُوْا﴾ ذٰلِكَ اَبَدًا لِظُهُوْرِ اِعْجَازِهٖ اِعْتِرَاضٌ ﴿فَاتَّقُوْا﴾ بِالْاِیْمَانِ بِاللّٰهِ وَ اَنَّهٗ لَیْسَ مِنْ كَلَامِ الْبَشَرِ ﴿اَلنَّارَ الَّتِیْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ﴾ اَلْكُفَّارُ ﴿وَ الْحِجَارَةُ﴾ كَاَصْنَامِهِمْ مِنْهَا یَعْنِیْ اِنَّهَا مُفْرِطَةُ الْحَرَارَةِ تَتَّقِدُ بِمَا ذُكِرَ لَا كَنَارِ الدُّنْیَا تَتَّقِدُ بِالْحَطَبِ وَ نَحْوِهٖ ﴿اُعِدَّتْ﴾ هُیِّئَتْ ﴿لِلْكٰفِرِیْنَ٥﴾ یُعَذَّبُوْنَ بِهَا جُمْلَةٌ مُسْتَانِفَةٌ اَوْ حَالٌ لَازِمَةٌ.

ترجمہ: ﴿اور اگر تمہیں کچھ شک ہو اس میں جو ہم نے اپنے بندے پر اتارا﴾ محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر، قرآن کے کلام الٰہی ہونے میں ﴿تو اس جیسی ایک سورت تو لے آؤ﴾ یعنی نازل شدہ سورت جیسی اور من بیانیہ ہے یعنی وہ سورت بلاغت، حسن نظم اور غیب کی خبر دینے میں قرآنی سورۃ کی طرح ہو اور سورت نام ہے اس چھوٹے ٹکڑے کا جس کا اول وآخر ہو اور اس میں کم سے کم تین آیتیں ہوں، ﴿اور بلا لو اپنے سب حمایتیوں کو﴾ اپنے ان معبودوں کو جنھیں تم پوجتے ہو۔ ﴿اللہ کے سوا﴾ یعنی غیر خدا کو تاکہ وہ تمہاری اعانت کریں ﴿اگر تم سچے ہو﴾ اس بیان میں کہ محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے قرآن کو اپنی جانب سے گڑھ لیا ہے تو تم بھی ایسا کر لو کہ تم بھی تو انہیں کی طرح فصیح عرب ہو۔ جب وہ ایسا کرنے سے عاجز ہو گئے تو اللہ جل شانہ نے ارشاد فرمایا ﴿پھر اگر نہ لا سکو﴾ مذکورہ مطالبہ اپنے عجز کی وجہ سے (پورا نہ کر سکو) ﴿اور ہرگز نہ لا سکو گے﴾ کبھی اس مطالبہ کو پورا نہ کر سکو گے قرآن کے معجز ہونے کی وجہ سے، یہ جملہ معترضہ ہے ﴿تو ڈرو﴾ اللہ پر ایمان لا کر اور یہ تسلیم کرتے ہوئے کہ قرآن انسانی کلام نہیں ﴿اس آگ سے جس کا ایندھن آدمی﴾ کفار ﴿اور پتھر ہیں﴾ مثلاً پتھر کے بت یعنی جہنم کی آگ مذکورہ چیزوں سے روشن کرنے کی وجہ سے انتہائی گرم ہوگی دنیاوی آگ کی طرح نہ ہوگی جو لکڑی وغیرہ سے جلائی جاتی ہے ﴿تیار کی گئی ہے کافروں کے لئے﴾ جس میں انھیں عذاب دیا جائے گا، یہ جملہ مستانفہ یا حال لازمہ ہے۔

توضیح و تشریح: قوله و من للبیان الخ یہاں سے اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ من مثله میں من بیانیہ ہے اور مثل سے مراد لفظاً اور معنیً قرآن کی طرح ہونا ہے، چونکہ کفار کہتے تھے کہ "و لو نشاء لقلنا مثل هذا" یعنی اگر چاہیں تو ایسا قرآن ہم بھی کہہ لیں، لہٰذا کفار کے دعویٰ کے مطابق ہی یہاں مطالبہ ہے یعنی تم ایسی سورت لاؤ جس کی عبارت اور مضمون فصاحت و بلاغت اور غیب کی خبریں دینے میں قرآن کی مثل ہو، مطالبہ کے اس انداز سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ قرآن ہر طرح بے مثل ہے۔

قولہ و السورة الخ یہ سورت کی تعریف ہے، کہ اصطلاح میں سورت قرآن کے اس حصے کو کہتے ہیں جس کا اول و آخر ہو اور اس میں کم از کم تین آیتیں ہوں۔ دوسرے مفسرین نے سورت کی تعریف یوں کی ہے، کہ سورت قرآن کے اس حصے کو کہتے ہیں جس میں پورا ایک مضمون بیان ہو، اس کا کوئی نام بھی ہو اور اس میں کم از کم تین آیات ہوں۔

مذکورہ دونوں تعریفیں درست ہیں فرق صرف یہ ہے کہ حضرت مفسر قدس سرہ نے سورة کو سؤر سے ماخوذ مانا ہے یعنی اس میں واؤ اصلی نہیں بلکہ ہمزہ سے بدل کر آیا ہے، اور اس کا معنی ہوتا ہے ٹکڑا، بچی ہوئی چیز، چونکہ سورة بھی قرآن کا ایک جز ہے اور ہر جز دوسرے سے علیحدہ ہے اس لئے اس کو سورت کہتے ہیں۔

دوسرے مفسرین سورت کو سور سے مشتق مانتے ہیں یعنی اس کا واؤ اصلی ہے جس کا معنی شہر پناہ، منزل اور قوت ہے اسی سے سور البلد، سور الاسد اور اساور وغیرہ ہیں، شہر کی فصیل کو سور البلد اسی لئے کہتے ہیں کہ وہ شہر کے چھوٹے بڑے مکانات کو گھیر لیتی ہے تو چونکہ سورت بھی ایک مضمون کو گھیرے ہوتی ہے اس لئے اسے سورت کہتے ہیں۔

قولہ الھتکم الخ شھداء کم کی تفسیر الھتکم سے اس لئے فرمایا کہ شہید کا لغوی معنی ہے: حاضر، گواہ، مددگار اور چونکہ کفار کا یہ عقیدہ تھا کہ وہ جن معبودان باطل کی پرستش کرتے ہیں وہ قیامت کے دن ان کی مدد کریں گے اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ان کی سفارش کر کے اس کے عذاب سے بچالیں گے، اس لئے گویا یوں فرمایا کہ اے کافرو! تم اپنی مدد کے لئے اپنے فرضی معبودوں کو بلاؤ۔ (مدارک)

قولہ: ای غیرہ چونکہ دون کا لغوی معنی ہے: "پاس، قریب اور یہ معنی مراد لینا یہاں ممکن نہیں کہ اللہ تعالیٰ جسم و جسمانیت سے پاک ہے اور پاس ہونا یا قریب ہونا مکان و جسم کے لحاظ سے ہوتا ہے، لہٰذا یہاں بطور استعارہ دون بمعنی غیر ہے۔

قولہ: فافعلوا ذلك اس عبارت سے جواب شرط کی طرف اشارہ ہے کہ یہاں دو شرطیں مذکور ہوئیں۔ پہلی شرط "و ان کنتم فی ریب الخ" ہے جس کا جواب "فأتوا بسورة الخ ہے، دوسری شرط ان کنتم صادقین ہے جس کے جواب محذوف کی طرف مفسر علام نے فافعلوا ذلك سے اشارہ کیا ہے۔

قولہ ابدآ - یہ اشارہ اس امر کی طرف ہے کہ یہ عاجزی دائمی ہے اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ کفار قرآن پاک کی مثل لانے سے ماضی حال مستقبل ہر زمانہ میں عاجز ہیں، یہ مفہوم مفسر علام نے یا تو سیاق آیت سے اخذ کیا ہے یا کلمہ "لن" سے۔ آگے لفظ اعتراض سے مفسر علام نے اشارہ فرمایا کہ و لن تفعلوا ماقبل پر عطف نہیں بلکہ شرط و جزاء کے درمیان جملہ معترضہ ہے، جس سے یہ فائدہ مقصود ہے کہ جملہ شرطیہ یعنی فان لم تفعلوا میں بظاہر شک اور تردد کا جو شائبہ ہے وہ دور ہو جائے۔

قولہ: ھیئت - اس اضافہ کا مقصد "أعدت" کے معنی کی توضیح کے ساتھ یہ افادہ کرنا ہے کہ جہنم بن چکا ہے، نہ یہ کہ قیامت کے بعد اس کا وجود ہوگا جیسا کہ بعض فرقہ ہائے ضالہ کا عقیدہ ہے، آگے مفسر علام نے جملة مستانفه الخ سے اعدت للكفرين میں ترکیب کے دو احتمال کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اولاً یہ کہ اعدت للکفرین جملہ مستانفہ ہو، اس صورت میں سوال مقدر کا جواب ہوگا کیونکہ جملہ مستانفہ ہمیشہ کسی سوال مقدر کا جواب ہوتا ہے، گویا یہاں یوں کہا گیا" ھذه النار

التی وقودها الناس و الحجارة لمن" جواب میں واقع ہوا "اعدت للکفرین" بصورت دیگر پورا جملہ النار سے حال واقع ہوگا مگر یہاں لازمۃ کی قید ایک شبہ کے ازالہ کے لئے ہے، یعنی یہ کہ جب دوزخ کی آگ صرف کافروں کے لئے ہے تو مسلمانوں کے لئے دوزخ سے ڈرنا نہ ڈرنا برابر ہے۔ حالانکہ معاملہ ایسا نہیں۔

جواب کا حاصل یہ ہے کہ یہ حال لازمہ ہے جو ذوالحال کے لئے لازم تو ہے مگر اس کے ساتھ خاص نہیں جیسے ابوک عطوفا میں باپ کی شفقت بیٹے کے لئے لازم تو ہے مگر خاص نہیں کہ بیٹے کے علاوہ کسی اور پر باپ کی شفقت ممنوع ہو، اور ایسا اس لئے ہے کہ حال لازمہ بمنزلہ صفت ہوتا ہے تو جیسے زید عالم میں مثلاً علم زید کے لئے لازم ہے مگر خاص نہیں کہ زید کے علاوہ کوئی اور شخص عالم نہ ہو، اسی طرح یہاں حال لازمہ کا مطلب یہ ہوا کہ جہنم کی آگ کافروں کے لئے لازم تو ہے مگر خاص نہیں کہ جہنم میں کسی اور کا داخلہ ممنوع ہو۔

فوائد نافعه (۱) بت وغیرہ اگرچہ مکلف نہیں ہیں کفار محض اپنی نادانی سے ان کی پرستش کرتے ہیں مگر انہیں جہنم میں ان کی اہانت اور کافروں کی مایوسی کے لئے ڈالا جائے گا، علاوہ ازیں جہنم میں بتوں کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی بلکہ وہ صرف کافروں کے عذاب میں شدت کا آلہ بنیں گے۔

(۲) آیت میں اگرچہ حجارۃ کے لفظ سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ صرف پتھر کے بت ہی جہنم میں جائیں گے مگر حق یہ ہے کہ جہنم میں ہر قسم کے بت جائیں گے خواہ وہ پتھر کے ہوں یا کسی اور دھات کے چونکہ کفار عموماً پتھر ہی کا بت تراش کرتے ہیں اس لئے لفظ حجارۃ کا ذکر اتفاقی ہے۔ (صاوی)

(۳) جہنم کی ہر آگ کا ایندھن آدمی اور پتھر نہیں بلکہ یہ صرف اسی آگ کے ایندھن ہیں جس میں کافر انسان ڈالے جائیں گے، رہی وہ آگ جس میں کافر جنات ڈالے جائیں گے تو اس کا ایندھن جنات ہوں گے، اور جس میں گنہگار مسلمان ڈالے جائیں گے اس کا ایندھن ان کے اعمال بد ہوں گے۔ (تفسیر کبیر)

﴿وَ بَشِّرْ﴾ اَخْبِرْ ﴿الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا﴾ صَدَّقُوْا بِاللّٰهِ ﴿وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ﴾ مِنَ الْفُرُوْضِ وَ النَّوَافِلِ ﴿اَنَّ﴾ اَیْ بِاَنَّ ﴿لَهُمْ جَنّٰتٍ﴾ حَدَائِقَ ذَاتَ شَجَرٍ وَ مَسَاكِنَ ﴿تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا﴾ اَیْ تَحْتَ اَشْجَارِهَا وَ قُصُوْرِهَا ﴿الْاَنْهٰرُ﴾ اَیِ الْمِیَاهُ فِیْهَا وَالنَّهْرُ الْمَوْضَعُ الَّذِیْ یَجْرِیْ فِیْهِ الْمَاءُ لِاَنَّ الْمَاءَ یَنْهَرُهٗ اَیْ یَحْفِرُهٗ وَ اِسْنَادُ الْجَرْیِ اِلَیْهِ مَجَازٌ ﴿كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا﴾ اُطْعِمُوْا مِنْ تِلْكَ الْجَنَّاتِ ﴿مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا قَالُوْا هٰذَا الَّذِیْ﴾ اَیْ مِثْلُ مَا ﴿رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ﴾ اَیْ قَبْلَهٗ فِی الْجَنَّةِ لِتَشَابُهِ ثِمَارِهَا بِقَرِیْنَةِ ﴿وَ اُتُوْا بِهٖ﴾ جِیْئُوْا بِالرِّزْقِ ﴿مُتَشَابِهًا﴾ یُشْبِهُ بَعْضُهٗ بَعْضًا لَوْنًا وَ یَخْتَلِفُ طَعْمًا ﴿وَ لَهُمْ فِیْهَا اَزْوَاجٌ﴾ مِنَ الْحُوْرِ وَ غَیْرِهَا ﴿مُطَهَّرَةٌ﴾ مِنَ الْحَیْضِ وَ كُلِّ قَذَرٍ ﴿وَ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ۝﴾ مَاكِثُوْنَ اَبَدًا لَا یَفْنَوْنَ وَ لَا یَخْرُجُوْنَ.

ترجمہ: ﴿اور خوش خبری دے﴾ خبر دو ﴿انہیں جو ایمان لائے﴾ اللہ کی تصدیق کی ﴿اور اچھے کام کئے﴾ فرائض اور نوافل ادا کئے ﴿کہ ان کے لئے باغات ہیں﴾ ایسے باغات جن میں درخت اور رہنے کے مکانات ہیں ﴿بہتی ہیں ان کے

نیچے﴾ یعنی ان درختوں اور محلات کے نیچے ﴿نہریں﴾ یعنی نہروں میں پانی بہتا ہوگا اور نہر اس جگہ کو کہتے ہیں جس میں پانی جاری ہو اس لئے کہ پانی اسے کھودتا ہے لہٰذا نہر کی طرف جاری ہونے کی نسبت بطور مجاز ہے۔ ﴿جب انھیں ان باغات سے دیا جائے گا﴾ انہیں ان باغات سے پھل کھلایا جائے گا ﴿کھانے کے لئے کوئی پھل، کہیں گے یہ تو وہی رزق ہے﴾ یعنی اسی کے مثل ہے ﴿جو ہمیں پہلے ملا تھا﴾ یعنی اس سے پہلے جنت میں، یہ کہنا پھلوں کی مشابہت کی وجہ سے ہوگا اور قرینہ اتوبہ متشابھا ہے ﴿اور وہ انھیں دیا گیا﴾ انھیں رزق دیا گیا ﴿ملتا جلتا﴾ کہ رنگ میں بعض بعض کے مشابہ ہوگا مگر ذائقہ میں مختلف ﴿اور ان کے لئے ان باغوں میں بیویاں ہیں﴾ حور وغیرہ ﴿ستھری﴾ حیض اور ہر قسم کی گندگی سے ﴿اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے﴾ ہمیشہ رہائش پذیر ہوں گے، نہ فنا ہوں گے نہ نکلیں گے۔

توضیح و تشریح: قوله: اخبر، بشر کی تفسیر اخبر سے کرنے میں یہ اشارہ ہے کہ بشارت کا معنی ہے مطلقاً خبر دینا، کہ بشارت بنا ہے بَشرۃٌ سے جس کا لغوی معنی ہے ''ظاہری کھال'' چونکہ ہر اچھی اور بری خبر کا اثر چہرہ پر ظاہر ہوتا ہے کہ خبر اگر اچھی ہے تو چہرے پہ رونق آجاتی ہے اور اگر بری ہے تو چہرہ فق پڑ جاتا ہے، لہٰذا ہر خبر بشارت ہے، اور اگر بشارت کا معنی صرف خوش خبری ہو جیسا کہ بعض حضرات کا خیال ہے تو "فبشرهم بعذاب اليم" جیسی آیتوں کی تاویل کرنی پڑے گی، جب کہ تاویل خلاف اصل ہے۔

قوله: صدقوا بالله اس تفسیری عبارت پر بظاہر ایک اعتراض ہوسکتا ہے کہ حضرت مفسر علیہ الرحمہ نے یہاں صرف توحید کو مدار ایمان قرار دیا جب کہ صرف "لا الـه الا الله" کہنے سے آدمی مومن نہیں ہوتا جب تک کہ محمد رسول الله پڑھے، یعنی مومن ہونے کے لئے توحید ورسالت دونوں کی تصدیق ضروری ہے۔ جواب یہ ہے کہ مفسر علام نے صرف توحید پر اقتصار اس لئے فرمایا کہ توحید تام ہی اس وقت ہوتی ہے جب آدمی اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کے ساتھ بما جاء به النبی پر ایمان لاتا ہے گویا مفسر قدس سرہ نے صدقوا بالله سے تمام ضروریات دین کے ماننے کے طرف اشارہ فرمایا ہے۔ (صاوی ملخصاً)

قولـه: ای بان لهم. یہ اشارہ اس امر کی طرف ہے کہ ان بتقدیر حرف جر منصوب بنزع الخافض ہے، یعنی حرف جر کے واسطہ سے بشر کا معمول ثانی ہے، لہٰذا یہ اعتراض نہیں کیا جاسکتا ہے کہ لفظ بشر متعدی بدو مفعول نہیں ہوتا پھر ان لهم محل نصب میں کیوں ہے؟ (ترویح الارواح)

قولـه: ای قبله فی الجنة چونکہ رزقنا من قبل میں دو احتمال نکلتے ہیں ایک یہ کہ قبلیت فی الدنیا مراد ہو یعنی جنتی جب کوئی پھل پائیں گے تو کہیں گے یہ ویسا ہی پھل ہے جیسا ہم کو دنیا میں ملتا تھا، کیونکہ جنتی پھل دنیاوی پھل کے ہم شکل و ہم رنگ ہوں گے، دوسرا احتمال یہ نکلتا ہے کہ یہاں قبلیت فی الجنۃ مراد ہو، یعنی جنت کا ہر پھل شکل وصورت میں پہلے پھلوں کی طرح ہوگا اس لئے جنتی جب بھی کوئی پھل پائیں گے تو کہیں گے یہ تو ہمیں پہلے بھی مل چکا ہے حالانکہ کھانے کے بعد لذت دوسری ہوگی، لہٰذا مفسر علام نے دوسرے احتمال کو پسند فرمایا اور قبله فی الجنة کہہ کر اسی کو راجح قرار دیا کیونکہ یہ جنات النعیم کی بے شمار نعمتوں پر زیادہ دلالت کرتا ہے اور اس میں قدرت خداوندی کا زیادہ ظہور ہے۔

قوله من الحيض و كل قذر اس سے مراد تمام ظاہری و باطنی عیوب اور گندگیوں سے پاک ہونا ہے یعنی جنت میں تمام عورتیں خواہ حوریں ہوں یا دنیا کی عورتیں ہوں، ظاہری گندگی کے ساتھ بد خلقی اور نافرمانی وغیرہ سے بھی دور ہوں گی۔

وَ نَزَلَ رَدًّا لِقَوْلِ الْيَهُوْدِ لَمَّا ضَرَبَ اللّٰهُ الْمَثَلَ بِالذُّبَابِ فِيْ قَوْلِهٖ تَعَالٰى وَ اِنْ يَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْئًا وَ الْعَنْكَبُوْتِ فِيْ قَوْلِهٖ تَعَالٰى كَمَثَلِ الْعَنْكَبُوْتِ مَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِذِكْرِ هٰذِهِ الْاَشْيَاءِ الْخَسِيْسَةِ ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖۤ اَنْ يَّضْرِبَ﴾ يَجْعَلَ ﴿مَثَلًا﴾ مَفْعُوْلٌ اَوَّلُ ﴿مَّا﴾ نَكِرَةٌ مَّوْصُوْفَةٌ بِمَا بَعْدَهَا مَفْعُوْلٌ ثَانٍ اَىْ اَىَّ مَثَلٍ كَانَ اَوْ زَائِدَةٌ لِتَاكِيْدِ الْخِسَّةِ فَمَا بَعْدَهَا الْمَفْعُوْلُ الثَّانِىْ ﴿بَعُوْضَةً﴾ مُفْرَدُ الْبَعُوْضِ وَهُوَ صِغَارُ الْبَقِّ ﴿فَمَا فَوْقَهَا﴾ اَىْ اَكْبَرَ مِنْهَا اَىْ لَايَتْرُكُ بَيَانَهٗ لِمَا فِيْهِ مِنَ الْحِكَمِ ﴿فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ﴾ اَىِ الْمَثَلُ ﴿الْحَقُّ﴾ اَلثَّابِتُ الْوَاقِعُ مَوْقِعَهٗ ﴿مِنْ رَّبِّهِمْ وَ اَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَيَقُوْلُوْنَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا﴾ تَمِيْزٌ اَىْ بِهٰذَا الْمَثَلِ وَ مَا اِسْتِفْهَامُ اِنْكَارٍ مُبْتَدَأٌ وَ ذَا بِمَعْنَى الَّذِىْ بِصِلَتِهٖ خَبَرُهٗ اَىْ اَىُّ فَائِدَةٍ فِيْهِ قَالَ تَعَالٰى فِىْ جَوَابِهِمْ ﴿يُضِلُّ بِهٖ﴾ اَىْ بِهٰذَا الْمَثَلِ ﴿كَثِيْرًا﴾ عَنِ الْحَقِّ لِكُفْرِهِمْ بِهٖ ﴿وَ يَهْدِىْ بِهٖ كَثِيْرًا﴾ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لِتَصْدِيْقِهِمْ بِهٖ ﴿وَ مَا يُضِلُّ بِهٖۤ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ۝﴾ اَلْخَارِجِيْنَ عَنْ طَاعَتِهٖ ﴿اَلَّذِيْنَ﴾ نَعْتٌ ﴿يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ﴾ مَا عَهِدَهٗ اِلَيْهِمْ فِى الْكُتُبِ مِنَ الْاِيْمَانِ بِمُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ﴿مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ﴾ تَوْكِيْدِهٖ عَلَيْهِمْ ﴿وَ يَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖۤ اَنْ يُّوْصَلَ﴾ مِنَ الْاِيْمَانِ بِالنَّبِىِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَالرَّحِمِ وَغَيْرِ ذٰلِكَ وَ اَنْ بَدَلٌ مِّنْ ضَمِيْرِ بِهٖ ﴿وَ يُفْسِدُوْنَ فِى الْاَرْضِ﴾ بِالْمَعَاصِىْ وَ التَّعْوِيْقِ عَنِ الْاِيْمَانِ ﴿اُولٰٓئِكَ﴾ اَلْمَوْصُوْفُوْنَ بِمَا ذُكِرَ ﴿هُمُ الْخٰسِرُوْنَ۝﴾ لِمَصِيْرِهِمْ اِلَى النَّارِ الْمُؤَبَّدَةِ عَلَيْهِمْ.

ترجمہ: یہ آیت نازل ہوئی یہود کے اس قول کے رد میں کہ جب اللہ تعالٰی نے آیت کریمہ "و ان يسلبهم الذباب شيئا" اور کمثل العنكبوت میں مکھی اور مکڑی سے مثل بیان فرمائی، تو کہنے لگے کہ ان خسیس چیزوں کے ذکر سے اللہ تعالٰی کا مقصود کیا ہو سکتا ہے؟ ﴿بے شک اللہ حیا نہیں فرماتا اس سے کہ ذکر کرے کوئی مثال﴾ "مثلاً" مفعول اول ہے اور ما نکرہ موصوفہ اپنے مابعد سے مل کر مفعول ثانی ہوا یعنی "ای مثل کان" یا ما زائدہ ہے تاکید خست کے لئے اور اس کا مابعد "بعوضة الخ" مفعول ثانی ہے۔ ﴿مچھر کی ہو﴾ بعوضہ بعوض کا مفرد ہے، معنی ہے چھوٹا مچھر ﴿یا اس سے بھی حقیر چیز کی﴾ یعنی اس سے بھی بڑھ کر مطلب یہ ہے کہ ان کا بیان نہیں چھوڑتا ہے کیونکہ اس میں حکمتیں ہیں ﴿تو وہ جو ایمان لائے وہ خوب جانتے ہیں کہ یہ مثال حق ہے﴾ واقعی برمحل ہے ﴿ان کے رب کی طرف سے ہے اور جنھوں نے کفر کیا سو وہ کہتے ہیں کیا قصد کیا اللہ نے اس مثال کے ذکر سے﴾ مثلاً تمیز ہے بهذا المثل کے معنی میں ہے اور ما استفہام انکاری مبتدا ہے اور ذا بمعنی الذی اسم موصول اپنے صلہ سے مل کر اس کی خبر ہے، یعنی اس میں کون سا فائدہ ہے؟ اللہ تعالٰی نے ان کے جواب میں فرمایا ﴿اللہ تعالٰی اس سے گمراہ کرتا ہے﴾ یعنی اس مثل سے ﴿بہتیروں کو﴾ حق سے ان کے کفر کی وجہ سے ﴿اور ہدایت دیتا ہے اس سے

بہتیروں کو﴾ یعنی مؤمنین کو ان کی تصدیق کی وجہ سے ﴿اور نہیں گمراہ کرتا اس سے مگر نافرمانوں کو﴾ جو اس کی اطاعت سے نکل جاتے ہیں ﴿وہ جو اللہ کے عہد کو توڑ دیتے ہیں﴾ جو اللہ نے آسمانی کتابوں میں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر ایمان لانے کا ان سے عہد لیا تھا ﴿اسے پختہ ہونے کے بعد﴾ ان پر اس کی تاکید کے باوجود ﴿اور کاٹتے ہیں اس چیز کو جس کے جوڑنے کا خدا نے حکم دیا ہے﴾ یعنی حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر ایمان لانے اور صلہ رحمی وغیرہ کو اور ان یوصل بدل ہے بہ کی ضمیر سے ﴿اور زمین میں فساد پھیلاتے ہیں﴾ گناہوں کے ذریعہ اور ایمان لانے سے روک کر ﴿وہی لوگ﴾ جو مذکورہ صفات سے متصف ہیں ﴿نقصان میں ہیں﴾ کیونکہ ابدی جہنم ان کا ٹھکانا ہے۔

توضیح و تشریح: قولہ و نزل ردا الخ یہ آنے والی آیتوں کے شان نزول کی طرف اشارہ ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں مکھی اور مکڑی کے ذریعہ مثل بیان فرمائی تو یہود نے کہا کہ اگر قرآن پاک کلام الٰہی ہوتا تو اس میں ان حقیر چیزوں کا ذکر نہ ہوتا کیونکہ ایسی حقیر و ذلیل چیزوں کا ذکر خدا کی شان کے خلاف ہے۔ اس کے رد میں یہ آیتیں نازل ہوئیں۔

قولہ ای مثل کان — یہ ما بعوضۃ الخ کا معنی ہے، اس کا حاصل یہ ہے کہ ضرب جب بیان مثل کے معنی میں ہوتا ہے تو دو مفعول چاہتا ہے اور یہاں اس کا مفعول اول تو "مثلاً" ہے اور مفعول ثانی میں دو احتمال ہیں۔ (۱) ما نکرہ موصوفہ اپنی صفت سے مل کر دوسرا مفعول ہو جائے اور اس تقدیر پر معنی ہوگا کہ اللہ بیان مثل ترک نہیں فرماتا جیسی بھی مثل ہو۔ اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ ما زائدہ ہے جو "مثلاً" کی نکارت میں اضافہ کے لئے لایا گیا ہے۔ اور مفعول ثانی "بعوضۃ الخ" ہے اور معنی یہ ہے کہ اللہ جل شانہ کوئی بھی مثل بیان کرنا ترک نہیں فرماتا چاہے مچھر ہوں یا اس سے خسیس ہوں۔

قولہ: ای اکبر منها. فما فوقها۔ اس کے معنی مراد میں دو احتمال ہے ایک یہ کہ اس سے مچھر سے بڑی چیزیں مراد ہوں مثلاً مکھی، مکڑی وغیرہ تو آیت کا معنی یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ مچھر اور اس سے بڑی چیزوں کے ذریعہ مثال بیان کرنے سے حیا نہیں فرماتا، مفسر علام کے قول ای اکبر منها سے ظاہر یہی ہے کہ یہاں یہی معنی مراد ہے۔ دوسرا معنی یہ ہے کہ مچھر سے بھی بڑھ کر حقیر اور چھوٹی چیزیں مراد ہوں، تو آیت کا معنی یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ مچھر اور اس سے بھی کم تر چیزوں کے ذریعہ مثل بیان کرنے سے حیا نہیں فرماتا، خازن نے کہا کہ یہاں یہی معنی مراد لینا انسب ہے۔

قولہ ای لایترک بیانہ الخ یہ لایستحی کا مفہوم ہے، جس کی قدرے تفصیل یہ ہے کہ لایستحی حیا سے بنا ہے جس کے معنی ہیں شرم و غیرت، جب بدنامی اور برائی کے خوف سے دل میں کسی کام سے رکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے تو اسی رکاوٹ کا نام ہے حیا یہ ایک درمیانی حالت ہے اس کے نیچے ہے خجالت یعنی شرمندگی اور اس کے اوپر ہے وقاحت جس کا معنی ہے بے غیرتی بے شرمی، ان تینوں میں فرق یہ ہے کہ حیا کی وجہ سے انسان وہ کام ترک کر دیتا ہے۔ خجالت میں کام کر کے شرمندہ ہوتا ہے، وقاحت میں بے غیرتی کے کام پر دلیری اور جرأت کرتا ہے، لہٰذا حیا کے حقیقی معنی مراد لینا شان الوہیت کے منافی ہے کیونکہ یہ دل کی صفت ہے اور دل جسم میں ہوتا ہے اور اللہ عزوجل جسم و جسمانیت سے پاک ہے، اس لئے یہاں حیا سے مراد

اس کا نتیجہ ہے یعنی کام کا چھوڑ دینا گویا ملزوم بول کر لازم مراد لیا گیا ہے یعنی حیا نہ فرمانے کا معنی ہے ان مثالوں کو نہ چھوڑنا
(تفسیر نعیمی، صاوی ملخصاً)

قولہ: تمیز الخ لفظ تمیز کے اضافہ کی وجہ اس امر پر تنبیہ کرنا ہے کہ لفظ مثلاً کا نصب تمیز ہونے کی وجہ سے ہے نہ کہ حال ہونے کی وجہ سے جیسا کہ بعض نے اسے حال قرار دیا ہے۔ حالانکہ اس کا حال قرار دینا ضعیف ہے کیونکہ مثلاً اسم جامد ہے اور اسم جامد کا حال واقع ہونا مختلف فیہ ہے مگر اس کے تمیز واقع ہونے میں کسی کا اختلاف نہیں لہٰذا مثلاً کا تمیز واقع ہونا راجح ہے۔ (ترویح الارواح)

قولہ: ما استفهام انکار — یہ ایک سوال مقدر کا جواب ہے، سوال یہ ہے کہ ماذا اراد الله بهذا مثلاً کہہ کر ظاہر ہے کہ کفار نے مثل بیان کرنے کی حکمت معلوم کی تھی اور کسی قول وفعل کی حکمت دریافت کر لینا مذموم نہیں مگر یہاں کفار کے استفہام کو مذموم قرار دیا، حاصل جواب یہ ہے کہ کفار کا استفہام حکمت معلوم کرنے کی غرض سے نہیں تھا بلکہ بطور انکار تھا، اس لئے مذموم قرار پایا۔ (ایضاً)

قولہ: الخارجين عن طاعته — یہ الفسقین کی تفسیر ہے جس سے اس امر کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ فسق کا لغوی معنی خروج ہے کہا جاتا ہے "فسق الرطب عن القشرة" یعنی کھجور چھلکے سے نکل آیا تو نافرمان بندوں کو فاسق اس لئے کہا جاتا ہے کیونکہ وہ طاعت سے باہر نکل جاتے ہیں۔ پھر جاننا چاہئے کہ آیت میں فاسق سے فاسق کامل مراد ہیں یعنی کفار و مشرکین کہ یہی کلی طور پہ اللہ کی اطاعت سے خارج ہوتے ہیں، یہاں گنہگار مسلمان مراد نہیں، اس مقام پر قدرے تفصیل یہ ہے کہ فسق کے تین درجے ہیں، تغابی، انہماک، جحود، تغابی یہ ہے کہ انسان اتفاقیہ کسی گناہ کبیرہ کا مرتکب ہو جائے مگر اس کو برا ہی جانتا ہے، انہماک یہ ہے کہ گناہ کبیرہ کا عادی ہو جائے اور اس سے بچنے کی پرواہ نہ کرے مگر اس کو گناہ جانے، جحود یہ ہے کہ حرام کام کو اچھا جاننے لگے اور اس کی حرمت کا انکار کر دے، یہ درجہ کفر کا ہے اور آیت میں فسق کا یہی درجہ مراد ہے۔ (روح البیان)

قولہ توكيده عليهم — یہ بھی دفع دخل مقدر ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ عہد اور میثاق دونوں ہم معنی ہیں اور آیت کریمہ "ينقضون عهد الله من بعد ميثاقه" میں میثاق کی ضمیر عہد کی طرف لوٹتی ہے لہٰذا آیت کا معنی ہوا۔ "وہ اللہ کے عہد کو توڑ دیتے ہیں اس کے عہد کے بعد" اور اس سے کوئی مطلب نہیں نکلتا، جواب یہ ہے کہ آیت میں لفظ میثاق بمعنی تاکید اور پختگی ہے لہٰذا آیت کا معنی ہوا: "وہ اللہ کے عہد کو اس کے پختہ کرنے کے بعد توڑ دیتے ہیں اور بلاشبہ یہ معنی درست ہے۔
(ترویح الارواح)

خیال رہے آیت کریمہ: "ينقضون عهد الله" میں استعارہ مکنیہ ہے جس میں مشبہ بہ کو حذف کر کے اس کی طرف اسی کے لوازم میں سے کسی چیز سے اشارہ کر دیا جاتا ہے۔، یہاں آیت میں عہد کو مضبوط رسی سے تشبیہ دی گئی ہے یعنی العهد مشبہ ہے اور الحبل المبرم مشبہ بہ ہے پھر الحبل المبرم کو حذف کر کے اس کی طرف اس کے لوازم میں سے ایک چیز یعنی نقض (بل اور اینٹھن ختم کرنے) سے اشارہ کر دیا گیا۔

قولہ: و ان بدل من ضمیر بہ — اس عبارت سے ترکیب نحوی کی طرف اشارہ ہے حاصل یہ ہے کہ یہاں ان یوصل میں دو احتمال نکلتے ہیں اولاً یہ کہ اَن، بہ کی ضمیر سے بدل ہو، اس صورت میں ان یوصل بتاویل مصدر ہو کر محل جر میں ہوگا اور تقدیری عبارت یوں ہوگی ما امر اللہ بوصلہ ثانیاً یہ کہ ان یوصل ماموصولہ سے بدل واقع ہو اس صورت میں وہ محل نصب میں ہوگا کیونکہ ما اپنے مابعد سے مل کر یقطعون کا مفعول واقع ہوگا مگر احتمال اول اقرب ہے اس لئے مفسر علام نے اسی کو اختیار فرمایا۔

ایک شبہ کا ازالہ: یہاں ایک شبہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے گمراہ کرنے کی نسبت اپنی طرف کی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں کو گمراہ کرتا ہے حالانکہ گمراہ کرنا شیطان کا کام ہے یا سرداران کفار کا۔

جواب اس شبہ کا یہ ہے کہ یہاں چند صورتیں نکلتی ہیں اولاً گمراہی پیدا فرمانا، ثانیاً گمراہی کے اسباب جمع کرنا یا گمراہی کی طرف رغبت دلانا، ثالثاً گمراہی اختیار کرنا، شیطان یا سرداران کفار گمراہی کی رغبت دیتے اور اس کے اسباب جمع کرتے ہیں، انسان ان اسباب کو اختیار کر لیتا ہے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ اس میں گمراہی پیدا فرما دیتا ہے اور گمراہی پیدا کرنا برا نہیں بلکہ گمراہی کی رغبت دلانا اور اسے اختیار کرنا برا ہے لہٰذا یہاں آیت میں گمراہ کرنے کا معنی ہے ان کے اندر گمراہی پیدا کرنا۔
(تفسیر کبیر ملخصاً)

سنبھلی پر چوٹ: دیوبندیوں کے شیخ المفسرین سلطان حسن سنبھلی نے بھی اپنی تفسیر ''عرفان القرآن'' میں مذکورہ شبہ کے چند جوابات دیئے ہیں۔ سب سے عمدہ جواب سنبھلی کے نزدیک یہ ہے کہ اضلال باب افعال سے ہے جس کا خاصہ وجدان ماخذ بھی ہے لہٰذا یہاں یضل بہ کا معنی گمراہ کرنا نہیں بلکہ گمراہ پانا ہے۔

مگر تفسیر کبیر نے اس تاویل کو دو طرح سے رد فرمایا اولاً یہ کہ اس تاویل کی صحت پر کوئی دلیل نہیں۔ ثانیاً یہ کہ یہاں اضلال کو حرف با کے ذریعہ متعدی بنایا گیا ہے جب کہ اضلال بمعنی وجدان حرف با کے ذریعہ متعدی نہیں ہوتا، لہٰذا آنجہانی کی تاویل غلط ہے۔

﴿كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ﴾ يَا اَهْلَ مَكَّةَ ﴿بِاللهِ وَ﴾ قَدْ ﴿كُنْتُمْ اَمْوَاتًا﴾ نُطَفًا فِي الْاَصْلَابِ ﴿فَاَحْيَاكُمْ﴾ فِي الْاَرْحَامِ وَالدُّنْيَا بِنَفْخِ الرُّوْحِ فِيْكُمْ وَ الْاِسْتِفْهَامُ لِلتَّعَجُّبِ مِنْ كُفْرِهِمْ مَعَ قِيَامِ الْبُرْهَانِ اَوِ التَّوْبِيْخِ ﴿ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ﴾ عِنْدَ اِنْتِهَاءِ اٰجَالِكُمْ ﴿ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ﴾ بِالْبَعْثِ ﴿ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ﴾ تُرَدُّوْنَ بَعْدَ الْبَعْثِ فَيُجَازِيْكُمْ بِاَعْمَالِكُمْ وَ قَالَ تَعَالٰى دَلِيْلًا عَلَى الْبَعْثِ لَمَّا اَنْكَرُوْهُ ﴿هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَا فِي الْاَرْضِ﴾ اَيِ الْاَرْضَ وَ مَافِيْهَا ﴿جَمِيْعًا﴾ لِتَنْتَفِعُوْا بِهٖ وَ تَعْتَبِرُوْا ﴿ثُمَّ اسْتَوٰى﴾ بَعْدَ خَلْقِ الْاَرْضِ اَيْ قَصَدَ ﴿اِلَى السَّمَآءِ فَسَوّٰهُنَّ﴾ اَلضَّمِيْرُ يَرْجِعُ اِلَى السَّمَاءِ لِاَنَّهَا فِيْ مَعْنَى الْجَمْعِ الْاٰئِلَةِ اِلَيْهِ اَيْ صَيَّرَهَا كَمَا فِيْ اٰيَةٍ اُخْرٰى فَقَضٰهُنَّ ﴿سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ﴾ مُجْمَلًا وَ مُفَصَّلًا اَفَلَا تَعْتَبِرُوْنَ اَنَّ الْقَادِرَ عَلٰى خَلْقِ ذٰلِكَ اِبْتِدَاءً وَ هُوَ اَعْظَمُ مِنْكُمْ قَادِرٌ عَلٰى اِعَادَتِكُمْ.

ترجمہ: ﴿کیوں کر تم انکار کرتے ہو﴾ اے مکہ والو! ﴿اللہ کا حالانکہ تم مردہ تھے﴾ صلبوں میں بشکل نطفہ ﴿اس نے تمہیں زندہ کیا﴾ ماؤں کے رحموں میں روح پھونک کر اور دنیا میں یہاں استفہام ان کے کفر پر تعجب کے لئے ہے قوی دلائل قائم ہونے کے باوجود یا زجر و توبیخ کے لئے ہے۔ ﴿پھر تمہیں مارے گا﴾ تمہاری عمر ختم ہونے پر ﴿پھر تمہیں زندہ کرے گا﴾ قبروں سے اٹھنے کے وقت ﴿پھر اسی کی طرف تم پلٹائے جاؤ گے﴾ یعنی قبروں سے اٹھا کر خدا کی طرف لے جائے جاؤ گے تو وہ تمہیں تمہارے اعمال کا بدلہ دے گا۔ اور جب کفار نے بعث بعد الموت کا انکار کیا تو اللہ تعالیٰ نے بطور دلیل فرمایا ﴿وہی ہے جس نے تمہارے لئے پیدا کیا جو کچھ زمین میں ہے﴾ یعنی زمین اور جو کچھ زمین میں ہے ﴿سب کا سب﴾ تاکہ تم اس سے نفع حاصل کرو اور عبرت پکڑو ﴿پھر توجہ فرمائی﴾ یعنی زمین پیدا فرمانے کے بعد قصد فرمایا ﴿آسمان کی طرف تو ٹھیک انھیں بنادیا﴾ ھن ضمیر سماء کی طرف راجع ہے کیونکہ سماء مایؤل کے لحاظ سے معنیً جمع ہے یعنی انھیں بنادیا جیسا کہ دوسری آیت میں فقضھن آیا ہے ﴿سات آسمان، اور وہ سب کچھ جانتا ہے﴾ اجمالاً بھی اور تفصیلاً بھی تو کیا تم سمجھتے نہیں کہ جب وہ تم سے بڑی چیزوں کو ابتداءً پیدا کرنے پر قادر ہے تو وہ تمہیں دوبارہ پیدا کرنے پر بھی قادر ہے۔

توضیح و تشریح: قولہ قد — اس لفظ سے حضرت مفسر نے ایک سوال مقدر کا جواب دیا ہے سوال یہ ہے کہ آیت میں کنتم اگرچہ ماضی کا صیغہ ہے مگر حال واقع ہے، حالانکہ ماضی کا بغیر قد کے حال واقع ہونا صحیح نہیں، جواب یہ ہے کہ یہاں صیغہ ماضی بتقدیر قد ہے لہٰذا اس کا حال واقع ہونا صحیح ہے۔ (صاوی)

قولہ نطفاً فی اصلاب. اس عبارت سے اموات کے معنی مراد کی طرف اشارہ ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ اموات بنا ہے میت سے جس کی دو معانی ہیں (۱) بے جان ہونا (۲) زندہ ہو کر مر جانا۔ یہاں پہلا معنی مراد ہے یعنی یہاں انسان کی اس حالت کا بیان ہے جب وہ اپنے باپ کے صلب میں بشکل نطفہ ہوتا ہے اور چونکہ مطلقاً بے جان جسم کو مردہ بول دیتے ہیں جیسے خشک زمین کو اردو میں بول دیتے ہیں کہ زمین مردہ ہوگئی، اسی طرح یہاں نطفہ کو میت فرمایا۔

قولہ فی الارحام و الدنیا الخ اس تفسیر سے حضرت مفسر علیہ الرحمہ کا اشارہ اس امر کی طرف ہے کہ یہاں زندگی سے مراد صرف وہ زندگی نہیں ہے جو ماں کے پیٹ میں بچے کو ملتی ہے، جیسا کہ بعض مفسرین کا خیال ہے بلکہ یہاں رحم کی زندگی اور دنیا کی زندگی دونوں مراد ہیں، البتہ مفسر کے قول بنفخ الروح کا تعلق صرف الارحام سے ہے کیونکہ روح ماں کے رحم میں پھونکی جاتی ہے۔

قولہ: و الاستفهام للتعجب الخ یعنی یہاں آیت میں استفہام تعجب کیلئے ہے یا توبیخ کے لئے، اگر تعجب کے لئے ہے تو یہ تعجب بندوں کے لحاظ سے ہے کہ تعجب کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ممکن نہیں اور اگر توبیخ کیلئے ہے تو معنی واضح ہے۔

قولہ: ای الارض الخ اس عبارت سے حضرت مفسر قدس سرہ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ یہاں مافی الارض سے صرف وہ چیزیں مراد نہیں جو زمین کے اندر ہوں بلکہ زمین اور جو کچھ زمین پر یا زمین میں پیدا کیا گیا ہے سب مراد ہے خواہ کسی چیز کا نفع سمجھ میں آئے یا نہ آئے مگر ہیں ساری چیزیں انسان کے فائدہ ہی کے لئے، آگے مفسر علام نے لتنتفعوا بہ سے

اشارہ فرمایا کہ آیت میں لکم کالام مطلق نفع کے لئے ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے دنیا کی ساری چیزوں کو اس لئے پیدا فرمایا کہ انسان ان چیزوں سے دینی اور دنیاوی دونوں طرح کا فائدہ حاصل کرے، دنیوی فائدہ تو ظاہر ہے، دینی فائدہ یہ ہے کہ انسان دنیا کی چیزوں میں غور وفکر کر کے قدرت خداوندی کو تسلیم کرے اور عبرت حاصل کرے وغیرہ ذلک۔

قولہ: ای بعد خلق الارض — حضرت مفسر قدس سرہ اس تفسیری عبارت سے اشارہ کرنا چاہتے ہیں کہ یہاں آیت میں لفظ ثم جو ترتیب مع التراخی کے لئے آتا ہے اپنے معنی موضوع لہ میں ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے زمین پیدا فرمانے کے بعد آسمان بنایا۔ اس تفسیر پر اشکال پیدا ہوا کہ آیت کریمہ [والارض بعد ذلک دحھا اور زمین کو اس (آسمان پیدا کرنے) کے بعد پھیلایا] سے ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین سے پہلے آسمان پیدا فرمایا، لہٰذا دونوں آیتوں میں تعارض پیدا ہو گیا۔

اس اشکال کو رفع کرنے کے لئے علامہ شیخ احمد بن محمد صاوی علیہ الرحمہ نے دونوں آیتوں میں تطبیق کی یہ صورت نکالی کہ زمین کی پیدائش آسمانوں سے پہلے ہے مگر اس کا پھیلاؤ آسمانوں کے بعد ہے، اور یہی صحیح ہے۔

قولہ: ای قصد — یہ دفع دخل مقدر ہے۔ جس کی قدرے تفصیل یہ ہے کہ استویٰ، سوی سے بنا ہے۔ جس کے معنی ہیں، برابری اور مساوات اور ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حق میں یہ معانی مراد لینا ممکن نہیں لہٰذا مفسر علام نے ای قصد کے ذریعہ اس کے حل کی طرف اشارہ فرمایا کہ یہاں استویٰ برابری کے معنی میں نہیں بلکہ قصد کے معنی میں ہے کیونکہ استویٰ کا صلہ جب الی ہو تو اس کا معنی ہوتا ہے قصد کرنا۔

قولہ: الضمیر یرجع الخ یہاں چونکہ یہ اعتراض واقع ہو رہا تھا کہ آیت میں لفظ السماء واحد ہے۔ اور اس کی طرف لوٹنے والی ضمیر ھن جمع ہے۔ لہٰذا ضمیر اور مرجع میں مطابقت نہ رہی، حضرت مفسر نے اسی اعتراض کا جواب دیا ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہاں اگرچہ السماء مفرد ہے مگر مایؤل کے لحاظ سے جمع ہے کہ پیدائش کے بعد سات آسمان ہوئے۔

ای صیر الخ یہاں سے یہ اشارہ کیا کہ "سوّی" "صیّر" کے معنی میں ہے، لیکن چونکہ یہ غیر معروف معنی تھا لہٰذا "فقضاھن الآیۃ" سے استشہاد فرمایا۔ اور ممکن ہے کہ لفظ فسوھن اپنے معنی حقیقی میں ہو۔ یعنی برابر کرنے اور ٹھیک کرنے کے معنی میں لہٰذا آیت کا معنی یہ ہوا کہ آسمانوں کو ایسا ٹھیک بنایا کہ اس میں کہیں بھی سوراخ یا شگاف یا ٹیڑھا پن نہ رہا۔

مودودی صاحب کی گمراہ کن تفسیر:

جماعت اسلامی کے بانی مولانا مودودی نے آیت کریمہ فسوّٰھن سبع سمٰوٰت کی تفسیر میں لکھا کہ "سات آسمانوں کی حقیقت کیا ہے، اس کا تعین مشکل ہے، انسان ہر زمانے میں آسمان یا بالفاظ دیگر ماورائے زمین کے متعلق اپنے مشاہدات یا قیاسات کے مطابق مختلف تصورات قائم کرتا رہا ہے جو برابر بدلتے رہے ہیں، لہٰذا ان میں سے کسی تصور کو بنیاد قرار دے کر قرآن کے ان الفاظ کا مفہوم متعین کرنا صحیح نہ ہوگا۔ بس مجملاً اتنا سمجھ لینا چاہئے کہ یا تو اس سے مراد یہ ہے کہ زمین سے

ماوراء جس قدر کائنات ہے، اسے اللہ نے سات محکم طبقوں میں تقسیم کر رکھا ہے، یا یہ کہ زمین اس کائنات کے جس حلقہ میں واقع ہے وہ سات طبقوں پر مشتمل ہے۔ (تفہیم القرآن جلد اول ص ٦١، مطبع مکتبہ اسلامی، دہلی)

مودودی صاحب کی مذکورہ تفسیر نہ صرف یہ کہ جمہور مفسرین کے خلاف ہے بلکہ اس سے قرآن پاک کی متعدد آیات اور دیگر کتب سماویہ کا انکار لازم آتا ہے کیونکہ قرآن پاک سمیت ہر الہامی کتاب سے آسمان کا وجود ثابت ہوتا ہے جب کہ مودودی صاحب کی تفسیر کا ماحصل یہ ہے کہ آسمان کا اپنا کوئی وجود نہیں ہے حالانکہ قرآن پاک کی اسی آیت سے جس کی تفسیر میں مودودی نے آسمان کے وجود کا انکار کیا ہے، واضح ہے کہ آسمان موجود ہے، آسمان مجسم ہیں اور سات ہیں۔ اسی طرح توریت اول کے پہلے باب میں ارشاد ہوا کہ ''ابتداء میں خدا نے زمین و آسمان کو پیدا کیا۔'' انجیل کے اٹھارہویں باب میں ہے کہ ''اتنا بھی نہ چاہا کہ آسمان کی طرف آنکھ اٹھائے'' مکاشفات یوحنا کے آٹھویں باب سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ آسمانوں پر تارے ہیں، یہاں تک کہ ہندوؤں کے وید اور پارسیوں کے وساطیر سے بھی آسمانوں کے متعلق اس قسم کے مضامین ثابت ہیں۔

(تفسیر نعیمی ملخصاً)

دراصل مودودی صاحب پر موجودہ سائنس کا بھوت سوار تھا کہ انھوں نے یوروپ کی ذہنی غلامی اور ایک دیوانہ فلسفی ''فیثاغورث'' کی ناروا تقلید کا ثبوت فراہم کیا ہے اور اپنی گمراہ کن تفسیر کے ذریعہ ایک حقیقت کو جھٹلانے کی سعی لاحاصل کی ہے۔

﴿وَ﴾ اُذْکُرْ یَا مُحَمَّدُ ﴿اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً﴾ یَخْلُفُنِیْ فِیْ تَنْفِیْذِ اَحْکَامِیْ فِیْهَا وَ هُوَ اٰدَمُ ﴿قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا﴾ بِالْمَعَاصِیْ ﴿وَ یَسْفِكُ الدِّمَآءَ﴾ یُرِیْقُهَا بِالْقَتْلِ کَمَا فَعَلَ بَنُو الْجَانِّ وَ کَانُوْا فِیْهَا فَلَمَّا اَفْسَدُوْا اَرْسَلَ اللّٰهُ اِلَیْهِمُ الْمَلَائِکَةَ فَطَرَدُوْهُمْ اِلَی الْجَزَائِرِ وَ الْجِبَالِ ﴿وَ نَحْنُ نُسَبِّحُ﴾ مُتَلَبِّسِیْنَ ﴿بِحَمْدِكَ﴾ اَیْ نَقُوْلُ سُبْحَانَ اللّٰهِ وَ بِحَمْدِهٖ ﴿وَ نُقَدِّسُ لَكَ﴾ نُنَزِّهُكَ عَمَّا لَا یَلِیْقُ بِكَ فَاللَّامُ زَائِدَةٌ وَ الْجُمْلَةُ حَالٌ اَیْ فَنَحْنُ اَحَقُّ بِالْاِسْتِخْلَافِ ﴿قَالَ﴾ تَعَالٰی ﴿اِنِّیْ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝﴾ مِنَ الْمَصْلَحَةِ فِی اسْتِخْلَافِ اٰدَمَ وَ اَنَّ ذُرِّیَّتَهٗ فِیْهِمُ الْمُطِیْعُ وَ الْعَاصِیْ فَیَظْهَرُ الْعَدْلُ بَیْنَهُمْ فَقَالُوْا لَنْ یَّخْلُقَ رَبُّنَا خَلْقًا اَکْرَمَ عَلَیْهِ مِنَّا وَ لَا اَعْلَمَ لِسَبْقِنَا لَهٗ وَ رُؤْیَتِنَا مَا لَمْ یَرَهٗ فَخَلَقَ تَعَالٰی اٰدَمَ مِنْ اَدِیْمِ الْاَرْضِ اَیْ وَجْهِهَا بِاَنْ قَبَضَ مِنْهَا قَبْضَةً مِنْ جَمِیْعِ اَلْوَانِهَا وَ عُجِنَتْ بِالْمِیَاهِ الْمُخْتَلِفَةِ وَ سَوَّاهُ وَ نَفَخَ فِیْهِ الرُّوْحَ فَصَارَ حَیَوَانًا حَسَّاسًا بَعْدَ اَنْ کَانَ جَمَادًا.

﴿اور﴾ یاد کرو اے محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ﴿جب تمہارے رب نے فرشتوں سے فرمایا میں زمین میں اپنا نائب بنانے والا ہوں﴾ جو زمین میں میرے احکام نافذ کرنے میں میری نیابت کرے، اور وہ آدم ہیں ﴿بولے کیا ایسے کو نائب کرے گا۔ جو اس میں فساد پھیلائے گا﴾ نافرمانیاں کر کے ﴿اور خون ریزیاں کرے گا﴾ قتل وغارت کے ذریعہ خون ریزی کرے گا جیسا کہ جناتوں نے کیا، اور وہ زمین پر آباد تھے پھر جب انھوں نے فساد برپا کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف فرشتوں کو بھیجا جنھوں نے ان کو جزیروں اور پہاڑوں کی طرف ہنکا دیا ﴿حالانکہ ہم تیری تسبیح کرتے ہیں﴾ اور ہماری یہ تسبیح

مربوط ہوتی ہے۔ ﴿تیری حمد کے ساتھ﴾ یعنی ہم سبحان اللہ وبحمدہ کہتے رہتے ہیں ﴿اور ہم تیری پاکی بیان کرتے ہیں﴾ جو تیری شان کے منافی ہے اس سے ہم تجھ کو پاک سمجھتے ہیں، لِلّٰه لك میں لام زائد ہے۔ اور جملہ حال ہے یعنی ہم خلافت کے زیادہ حق دار ہیں۔ ﴿اللہ تعالیٰ نے فرمایا بے شک میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے﴾ یعنی نیابت آدم کی مصلحت اور یہ کہ ان کی اولاد میں بعض فرمانبردار ہوں گے بعض نافرمان تو ان کے درمیان عدل ظاہر ہوگا، تو فرشتوں نے کہا، ہمارا رب ہم سے زیادہ معظم اور ذی علم کسی مخلوق کو نہ بنائے گا کیونکہ ہمیں اس پر سبقت حاصل ہے اور ہم وہ دیکھتے ہیں جو اس نے نہیں دیکھا، پھر اللہ تعالیٰ نے آدم کو زمین کی مٹی سے پیدا فرمادیا، اس طرح کہ ہر رنگ کی زمین سے ایک مشت مٹی لے کر مختلف قسم کے پانیوں سے گوندھا اور پتلا بنا کر اس میں روح پھونک دی تو وہ حساس جاندار بن گئے بعد اس کے کہ محض بے جان چیز تھے۔

توضیح و تشریح: قوله اذكر يا محمد — حضرت مفسر قدس سرہ نے اس تقدیری عبارت سے اشارہ فرمایا ہے کہ یہاں اذ مفعول بہ ہونے کی وجہ سے محل نصب میں ہے۔ جس کا عامل اذکر مقدر ہے اور خطاب حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے ہے۔

یہاں ایک لطیف نکتہ کا ذکر برمحل ہوگا، وہ یہ ہے کہ مفسر کی تقدیری عبارت کی روشنی میں اذ قال ربك کا معنی ہے "اے محبوب یاد کرو جب آپ کے رب نے فرمایا" اور یہ بات واضح ہے کہ مخاطب کو وہی چیز یاد دلائی جاتی ہے جو پہلے سے اس کے علم میں ہو یا تو اسے بتادی گئی ہو یا دکھادی گئی ہو اس سے ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے تخلیق آدم کے تمام مراحل اور فرشتوں کی نیازمندی وگزارش اور پھر ان کی آزمائش وغیرہ کے مناظر سب اپنے محبوب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو دکھادیا تھا، جبھی تو فرمارہا ہے کہ اے محبوب! ذرا اس واقعہ کو تو یاد کرو، لہٰذا یہاں سے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے لئے علم غیب ثابت ہوتا ہے۔ (تفسیر نعیمی ملخصا)

قوله كما فعل بنو الجان الخ یہ ایک سوال مقدر کا جواب ہے، سوال یہ ہے کہ انسان کی پیدائش سے پہلے ہی ملائکہ نے انسان پر محض ظن وتخمین سے فساد پھیلانے اور خون ریزی کرنے کا حکم لگادیا اور یہ بات عصمت ملائکہ کے خلاف ہے، حاصل جواب یہ ہے کہ فرشتوں کا یہ حکم لگانا قیاس کے سبب سے تھا کہ انھوں نے انسان کو جنات پر قیاس کیا تھا اور مقیس ومقیس علیہ کے درمیان علت جامعہ عدم عصمت ہے، ظاہر ہے کہ قیاس عصمت کے خلاف نہیں۔

قوله: متلبسين اس لفظ سے حضرت مفسر نے اشارہ فرمایا ہے کہ بحمدك، نسبح کی ضمیر سے حال واقع ہے اور اس میں باملابست کے لئے ہے جس کا دوسرا نام بائے مصاحبت بھی ہے اور جس کا متعلق ہمیشہ متلبس یا اس کا ہم معنی کوئی لفظ ہوتا ہے۔

قوله: ننزهك عمالا يليق — یہ ایک اعتراض کا جواب ہے، اعتراض یہ ہے کہ نسبح اور نقدس دونوں ہم معنی ہیں لہٰذا یہاں بے فائدہ تکرار لازم آتا ہے، جواب یہ ہے کہ تسبیح کا معنی ہے زبانی تسبیح بیان کرنا اور تقدیس کا معنی ہے دل سے پاکی کا اعتقاد رکھنا، اس طرح دونوں کے معنی مختلف ہو گئے لہٰذا تکرار لازم نہیں آیا۔ (ترویح الارواح)

قوله: من اديم الارض یہ آدم کی وجہ تسمیہ کی طرف اشارہ ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ آدم مشتق ہے ادیم الارض

سے جس کا معنی ہے ''ظاہری زمین'' چونکہ حضرت آدم علیہ السلام کا جسم مبارک ظاہری زمین کی مختلف مٹیوں سے بنا تھا اس لئے آپ کا نام آدم ہوا۔

لفظ ملائکہ کی تحقیق اور وجہ تسمیہ:

ملائکہ ملک کی جمع ہے جس کا معنی ہے فرشتہ، اور ملک مشتق ہے اُلوکہ بمعنی پیغام رسانی سے، اُلوکہ سے مألك بنا پھر خلاف قیاس قلب کر کے ملاك ہوا بعدہ یسئل کے قاعدہ سے ہمزہ کو تخفیفاً گرا دیا گیا ملک ہو گیا، اسی لئے اس کی جمع ملائکہ آتی ہے کہ ساقط شدہ ہمزہ جمع میں واپس آ گیا اور تاء جمع کی تانیث کے لئے ہے، چونکہ فرشتے اللہ عزوجل اور اس کے پیغمبروں کے مابین پیغام رسانی کا کام انجام دیتے ہیں اس لئے انھیں ملك اور ملائكه کہتے ہیں۔

فرشتوں کی حقیقت:

فرشتے جسم نوری علوی رکھتے ہیں، مختلف شکل بدلنے کی قدرت رکھتے ہیں اور بہت طاقتور ہوتے ہیں۔ مختلف کاموں پر مامور ہیں کچھ معرفت الٰہی میں مستغرق ہیں، کچھ عالم کا نظام چلانے پر، اللہ کی مخلوق میں سب سے زیادہ تعداد فرشتوں کی ہے۔

﴿وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ﴾ اَیْ اَسْمَاءَ الْمُسَمِّیَاتِ ﴿كُلَّهَا﴾ حَتّٰی الْقَصْعَةَ وَ الْقُصَیْعَةَ وَ الْفَسْوَةَ وَ الْفُسَیَّةَ وَ الْمِغْرَفَةَ بِاَنْ اَلْقٰی فِیْ قَلْبِهٖ عِلْمَهَا ﴿ثُمَّ عَرَضَهُمْ﴾ اَیِ الْمُسَمِّیَاتِ وَ فِیْهِ تَغْلِیْبُ الْعُقَلَاءِ ﴿عَلَی الْمَلَائِكَةِ فَقَالَ﴾ لَهُمْ تَبْكِیْتًا ﴿اَنْبِئُوْنِیْ﴾ اَخْبِرُوْنِیْ ﴿بِاَسْمَاءِ هٰٓؤُلَآءِ﴾ الْمُسَمِّیَاتِ ﴿اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ o﴾ فِیْ اَنِّیْ لَا اَخْلُقُ اَعْلَمَ مِنْكُمْ اَوْ اَنَّكُمْ اَحَقُّ بِالْخِلَافَةِ وَ جَوَابُ الشَّرْطِ دَلَّ عَلَیْهِ مَا قَبْلَهٗ ﴿قَالُوْا سُبْحَانَكَ﴾ تَنْزِیْهًا لَكَ عَنِ الْاِعْتِرَاضِ عَلَیْكَ ﴿لَا عِلْمَ لَنَا اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا﴾ اِیَّاهُ ﴿اِنَّكَ اَنْتَ﴾ تَاكِیْدٌ لِلْكَافِ ﴿الْعَلِیْمُ الْحَكِیْمُ﴾ اَلَّذِیْ لَا یَخْرُجُ شَیْءٌ عَنْ عِلْمِهٖ وَ حِكْمَتِهٖ ﴿قَالَ﴾ تَعَالٰی ﴿یٰۤاٰدَمُ اَنْبِئْهُمْ﴾ اَیِ الْمَلٰٓئِكَةَ ﴿بِاَسْمَآئِهِمْ﴾ اَیِ الْمُسَمِّیَاتِ فَسَمّٰی كُلَّ شَیْءٍ بِاِسْمِهٖ وَ ذَكَرَ حِكْمَتَهُ الَّتِیْ خُلِقَ لَهَا ﴿فَلَمَّاۤ اَنْبَاَهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ قَالَ﴾ تَعَالٰی لَهُمْ مُوَبِّخًا ﴿اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّیْۤ اَعْلَمُ غَیْبَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ﴾ مَا غَابَ فِیْهِمَا ﴿وَ اَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ﴾ تُظْهِرُوْنَ مِنْ قَوْلِكُمْ اَتَجْعَلُ فِیْهَا اَلَخْ ﴿وَ مَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ﴾ تُسِرُّوْنَ مِنْ قَوْلِكُمْ لَنْ یَّخْلُقَ رَبُّنَا خَلْقًا اَكْرَمَ عَلَیْهِ مِنَّا وَ لَا اَعْلَمَ.

ترجمہ: ﴿اور اللہ تعالیٰ نے آدم کو نام سکھائے﴾ یعنی تمام چیزوں کے نام ﴿تمام اشیاء کے﴾ یہاں تک کہ پیالہ، پیالی، ریح، پھسکی اور چمچہ کے نام بھی اس طرح کہ تمام چیزوں کا علم ان کے دل میں ڈال دیا ﴿پھر انہیں پیش کیا﴾ یعنی ان چیزوں کو اور (ھم ضمیر لانے میں) اس میں عقلاء کی تغلیب ہے ﴿فرشتوں کے سامنے اور فرمایا﴾ از روئے عتاب کے ﴿بتاؤ تو

مجھے ﴾ مجھے خبر دو ﴿ ان چیزوں کے ناموں کی اگر تم سچے ہو ﴾ اس خیال میں کہ میں تم سے زیادہ علم والا نہیں پیدا کروں گا یا تم ہی خلافت کے زیادہ حق دار ہو۔ اور جواب شرط محذوف ہے جس پر ماقبل دلالت کرتا ہے۔ ﴿ بولے پاکی ہے تجھے ﴾ تجھے پاکی ہے اس سے کہ تجھ پر اعتراض کیا جائے ﴿ ہمیں کچھ علم نہیں مگر جتنا تو نے ہمیں سکھایا ﴾ بس اسی قدر ﴿ بے شک تو ہی ﴾ لفظ انت کاف خطاب کی تاکید کے لئے ہے۔ ﴿ علم و حکمت والا ہے ﴾ کہ جس کے علم و حکمت سے کوئی چیز باہر نہیں ﴿ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے آدم! بتادو انھیں ﴾ یعنی فرشتوں کو ﴿ ان کے نام ﴾ یعنی ان چیزوں کے نام تو آدم علیہ السلام نے ہر چیز کا نام بتادیا اور ہر چیز کی تخلیق کی حکمت بھی ذکر کر دیں۔ ﴿ پھر جب آدم نے بتادیئے فرشتوں کو ان کے نام تو اللہ نے فرمایا ﴾ از روئے عتاب ﴿ میں نہ کہتا تھا کہ میں جانتا ہوں آسمانوں اور زمین کی سب چھپی چیزیں ﴾ جو ان میں پوشیدہ ہیں ﴿ اور میں جانتا ہوں جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو ﴾ جو باتیں تم ظاہر کررہے ہو یعنی اتجعل الخ ﴿ اور جو کچھ تم چھپاتے ہو ﴾ جن باتوں کو تم چھپا رہے ہو یعنی یہ کہ ہمارا رب ہم سے زیادہ معظم اور ہم سے زیادہ علم والا کسی کو پیدا نہ کرے گا۔

توضیح و تشریح: قوله ای اسماء المسمیات اس عبارت سے حضرت مفسر قدس سرہ نے اشارہ فرمایا کہ یہاں الاسماء میں آلُ مضاف الیہ کے عوض میں ہے، یعنی اصل میں و علم اٰدم اسماء المسمیات تھا مضاف الیہ کو حذف کر کے اس کے عوض مضاف پر ال بڑھا دیا گیا۔ اور مسمیات سے مراد اسماء کے مدلولات ہیں خواہ جواہر ہوں یا اعراض و معانی۔

قوله: حتی القصعة الخ یہاں سے کلھا کے مصداق کی طرف اشارہ ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو قیامت تک پیدا ہونے والی تمام چیزوں کے نام ان کی حقیقتیں اور خاصیتیں، ان کا نفع و نقصان اور ان کا طریقۂ استعمال نیز بنانے کے طریقے، غرضیکہ ساری چیزوں کے سارے حالات بتادیئے وہ چیزیں خواہ بڑی ہوں یا چھوٹی شریف ہوں یا خسیس یہاں تک کہ پیالہ اور پیالی اور گوز مارنے کے نام بھی بتادیئے۔ والفسوة هو الريح الخارج من الدبر بلا صوت فان كان شديدا سمي فسوة و ان كان خفيفاً سمي فسية و ان كان بصوت سمي ضراطاً، هكذا في الصاوی

قوله: بان القی الخ یہ طریقۂ تعلیم کی طرف اشارہ ہے یعنی حضرت آدم علیہ السلام ساری چیزوں کے اسماء ان کی صفات ان کے افعال و خواص اور اصول علوم و صناعات کی تعلیم کے لئے کسی مدرسہ میں نہیں گئے نہ آپ پر کوئی اتالیق مقرر کیا گیا بلکہ سارے علوم آپ کو بطریق الہام عطا فرمائے گئے۔

قوله: فيه تغليب العقلاء - اس عبارت سے ایک شبہ کا ازالہ مقصود ہے، وہ یہ کہ عرضهم میں جمع مذکر عاقل کی ضمیر لائی گئی ہے حالانکہ بہت سی اشیاء مونث اور غیر عاقل بھی ہیں۔ جواب یہ ہے کہ یہاں مونث اور غیر عاقل پر مذکر عاقل کی تغلیب کی گئی ہے جیسے ماں باپ کے لئے ابوان اور شمس و قمر کے لئے قمرین بول دیتے ہیں۔

قوله: جواب الشرط الخ یہ اشارہ ہے جواب شرط کے محذوف ہونے کی طرف جس پر ماقبل کا جملہ انبئونی دلالت کرتا ہے یعنی تقدیری عبارت ہے ان كنتم صادقين فانبئوني لہٰذا شرط پر جواب شرط کی تقدیم لازم نہیں آئی۔

مولوی نعیم دیوبندی پر تعقب:

مولوی نعیم صاحب مذکورہ آیت کے تحت لکھتے ہیں: ''عدم قابلیت کی وجہ سے آدم کی طرح فرشتوں پر ان اسماء کو پیش کرنے کے باوجود بھی وہ امتحان میں ناکام رہے'' آگے ایک شاہی سرخی دے کر لکھتے ہیں'' حق تعالیٰ کا معلم اول ہونا اور حضرت آدم کا متعلم اول ہونا اور علم اللغات کا اول علم ہونا معلوم ہو گیا'' (کمالین شرح اردو جلالین، حصہ اوّل، ص ۵۳)

مولوی صاحب کی مذکورہ خامہ فرسائی پر گفتگو تو بہت کی جا سکتی ہے مگر قلت وقت اور قلت صفحات دامن گیر ہے سردست موصوف کی تحریر کا ایک تحلیلی جائزہ پیش ہے اسی سے ان کی علمی حیثیت کا اندازہ ہو جائے گا۔

اقول: اولاً حضرت آدم علیہ السلام کی طرح فرشتوں پر اسماء نہیں پیش کئے گئے بلکہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کو پہلے اسماء مسمیات سکھا دیئے تھے کما قال و علم آدم الاسماء کلھا مگر فرشتوں کو اسماء کا علم عطا نہیں فرمایا تھا بلکہ ان کے سامنے صرف مدلولات پیش فرما کر ان کے اسماء کے متعلق سوال فرمایا تھا جیسا کہ آیت ثم عرضھم کی تفسیر ای المسمیات سے واضح ہے، لہٰذا مولوی صاحب کا یہ لکھنا کہ آدم کی طرح الخ صحیح نہیں، ثانیاً معلم، پیشہ ور تعلیم دینے والے کو کہتے ہیں اور معلم پہلے خود کسی سے علم حاصل کرتا ہے، اسی طرح عرف عام میں متعلم وہ کہلاتا ہے جو کسی استاذ سے سبقاً سبقاً علم حاصل کرتا ہے، لہٰذا مولوی نعیم کا یہ کہنا کہ حق تعالیٰ کا معلم اول ہونا اور حضرت آدم کا متعلم اول ہونا ثابت ہو گیا، صحیح نہیں کہ ذات باری تعالیٰ پر لفظ معلم کا اطلاق شرعاً درست نہیں یوں ہی حضرت آدم علیہ السلام نے سبقاً سبقاً علم حاصل نہ کیا بلکہ انھیں سارے علوم بطور الہام حاصل ہوئے لہٰذا وہ متعلم نہ ہوئے۔ ثالثاً: اول علم اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات اور ایمانیات کا علم ہے جو حضرت آدم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے ان کی پیدائش سے پہلے عطا فرمایا تھا اسی لئے حضرت آدم علیہ السلام کے قالب میں روح کے داخل ہوتے ہی جب انھیں چھینک آئی تو الحمد اللہ کہا جس میں خدا کی ذات وصفات کا ذکر ہے۔ لہٰذا مولوی موصوف کا یہ کہنا کہ علم اللغات کا اول علم ہونا معلوم ہو گیا، غلط ہے۔

سنبھلی کی ایک غلط فہمی:

دیوبندی جماعت کے شیخ المفسرین مفتی سلطان حسن سنبھلی نے اس مقام پر" و ماکنتم تکتمون" کے تحت لکھا کہ ''یعنی انسان کا فساد اور خونریزی کرنا تو ظاہر کیا اور فرشتوں نے پوشیدہ کیا انسان کے علم اور کمالات کو'' (عرفان القرآن پارہ الم، ص ۴۲)

بے چارے شیخ المفسرین صاحب آیت کا مفہوم ہی نہ سمجھ سکے پھر بھی ہیں مفسر۔ سارے مفسرین اس بات پر متفق ہیں کہ فرشتوں نے جو بات چھپائی تھی وہ یہ تھی کہ مستحق خلافت وہ خود ہیں اور اللہ تعالیٰ ان سے افضل واعلم کوئی مخلوق پیدا نہ کرے گا۔

مگر دیوبندیوں کے سلطان فرماتے ہیں کہ فرشتوں نے انسان کے علم اور کمالات کو چھپایا یعنی فرشتے یہ جانتے تھے کہ انسان ہم سے زیادہ علم وکمال والا ہو گا اس کے باوجود وہ خلافت کے مدعی تھے، حاشا اگر ایسا ہوتا تو یہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں

جرأت ہوتی جس کا صدور فرشتوں سے محال اور ان کی عصمت کے منافی ہے فرشتے دیو بندی نہیں، کہ وہ اللہ و رسول کی بارگاہوں میں گستاخیاں کرتے پھریں بلکہ وہ معصوم ہیں اور ہر حال میں اپنے رب کے فرمانبردار۔

﴿وَ﴾ اذْكُرْ ﴿اِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ﴾ سُجُوْدَ تَحِيَّةٍ بِالْاِنْحِنَاءِ ﴿فَسَجَدُوْا اِلَّا اِبْلِيْسَ﴾ وَهُوَ اَبُو الْجِنِّ كَانَ بَيْنَ الْمَلٰئِكَةِ ﴿اَبٰى﴾ اِمْتَنَعَ مِنَ السُّجُوْدِ ﴿وَ اسْتَكْبَرَ﴾ تَكَبَّرَ عَنْهُ وَ قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ﴿وَ كَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ۝﴾ فِيْ عِلْمِ اللّٰهِ تَعَالٰى ﴿وَ قُلْنَا يٰۤاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ﴾ تَاكِيْدٌ لِلضَّمِيْرِ الْمُسْتَتِرِ لِيُعْطَفَ عَلَيْهِ ﴿وَ زَوْجُكَ﴾ حَوَّاءُ بِالْمَدِّ وَ كَانَ خَلَقَهَا مِنْ ضِلْعِهِ الْاَيْسَرِ ﴿الْجَنَّةَ وَ كُلَا مِنْهَا﴾ اَكْلًا ﴿رَغَدًا﴾ وَاسِعًا لَا حَجْرَ فِيْهِ ﴿حَيْثُ شِئْتُمَا وَ لَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ﴾ بِالْاَكْلِ مِنْهَا وَهِيَ الْحِنْطَةُ اَوِ الْكَرْمُ اَوْ غَيْرُهُمَا ﴿فَتَكُوْنَا﴾ فَتَصِيْرَا ﴿مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝﴾ اَلْعَاصِيْنَ ﴿فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ﴾ اِبْلِيْسُ اَذْهَبَهُمَا وَ فِيْ قِرَاءَةٍ فَاَزَالَهُمَا اَيْ نَحَّاهُمَا ﴿عَنْهَا﴾ اَيِ الْجَنَّةِ بِاَنْ قَالَ لَهُمَا هَلْ اَدُلُّكُمَا عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَ قَاسَمَهُمَا بِاللّٰهِ اِنَّهٗ لَهُمَا لَمِنَ النّٰصِحِيْنَ فَاَكَلَا مِنْهَا ﴿فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ﴾ مِنَ النَّعِيْمِ ﴿وَ قُلْنَا اهْبِطُوْا﴾ اِلَى الْاَرْضِ اَيْ اَنْتُمَا بِمَا اشْتَمَلْتُمَا عَلَيْهِ مِنْ ذُرِّيَّتِكُمَا ﴿بَعْضُكُمْ﴾ بَعْضُ الذُّرِّيَّةِ ﴿لِبَعْضٍ عَدُوٌّ﴾ مِنْ ظُلْمِ بَعْضِهِمْ بَعْضًا ﴿وَ لَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ﴾ مَوْضِعُ قَرَارٍ ﴿وَ مَتَاعٌ﴾ مَا تَمَتَّعُوْنَ بِهٖ مِنْ نَبَاتِهَا ﴿اِلٰى حِيْنٍ ۝﴾ وَقْتِ انْقِضَاءِ اٰجَالِكُمْ.

ترجمہ: ﴿اور﴾ یاد کرو ﴿جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کرو﴾ مراد ہے جھک کر سجدۂ تحیت بجالانا ﴿تو سب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے﴾ یہ ابو الجن تھا جو فرشتوں کے درمیان رہتا تھا ﴿منکر ہوا﴾ سجدہ کرنے سے رک گیا ﴿اور غرور کیا﴾ اس سے تکبر کیا اور کہا کہ میں اس سے بہتر ہوں ﴿اور کافر ہو گیا﴾ اللہ تعالیٰ کے علم میں ﴿اور ہم نے فرمایا اے آدم! رہو تم﴾ ضمیر منفصل انت اسکن میں ضمیر مستتر کی تاکید کے لئے ہے تاکہ اس پر عطف (زوجک کا) کیا جاسکے ﴿اور تمہاری بیوی﴾ یعنی حواء جو مد کے ساتھ ہے اور انھیں اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کی بائیں پسلی سے پیدا فرمایا تھا ﴿جنت میں اور دونوں کھاؤ اس سے جتنا چاہو﴾ حسب منشا اس میں کوئی روک ٹوک نہیں ﴿جہاں سے چاہو، مگر اس درخت کے قریب نہ جانا﴾ اس سے کھانے کی غرض سے اور وہ گیہوں یا انگور یا اور کوئی درخت تھا ﴿ورنہ ہو جاؤ گے حد سے بڑھنے والوں سے﴾ حکم کے مطابق عمل نہ کرنے والوں سے ﴿پھر لغزش دی انھیں شیطان نے﴾ یعنی ابلیس ان کو جنت سے لے گیا اور ایک قرأت میں فازالھما ہے۔ یعنی ان کو جنت سے دور کر دیا ﴿اس سے﴾ یعنی جنت سے اس طرح کہ ان سے کہا کیا میں تمہیں بتادوں دائمی زندگی کا درخت اور ان سے قسم کھائی کہ وہ ان دونوں کا خیر خواہ ہے لہٰذا دونوں نے درخت سے کچھ کھالیا ﴿اور جہاں رہتے تھے وہاں سے ان کو الگ کر دیا﴾ جنت سے ﴿اور ہم نے فرمایا اتر جاؤ﴾ زمین کی طرف یعنی تم اور تمہاری ذریت جو تمہارے صلب میں ہے ﴿تم میں سے بعض﴾ بعض ذریت ﴿بعض کی دشمن ہوگی﴾ ایک دوسرے پر ظلم کر کے ﴿اور تمہارا زمین میں ٹھکانا ہے﴾ ٹھہرنے کی جگہ ﴿اور فائدہ اٹھانا ہے﴾ یعنی اس کے نباتات جس سے تم فائدہ اٹھاؤ ﴿وقت مقررہ تک﴾ یعنی تمہاری

زندگی ختم ہونے تک۔

قوله: بالانحناء۔ انحناء کا معنی ہے جھکنا اس لفظ سے مفسر علام اشارہ کرنا چاہتے ہیں کہ آیت میں لفظ اسجدوا معنی اصطلاحی میں نہیں بلکہ یہاں سجدہ کا لغوی معنی مراد ہے، یعنی یہ کہ فرشتوں کو آدم علیہ السلام کے سامنے جھک کر محض آداب بجالانے کا حکم تھا، معروف سجدہ یعنی پیشانی کا ٹیکنا مراد نہیں۔ لیکن یہ تفسیر محل نظر ہے۔ کما سیاتی۔

قوله: کان بین الملائکة اس عبارت سے اشارہ ہے اس امر کی جانب کہ آیت میں استثناء متصل نہیں بلکہ استثناء منقطع ہے اور ابلیس فرشتہ نہیں بلکہ جنات تھا، اب یہاں یہ اعتراض پیدا ہوتا ہے کہ جب حکم سجود ملائکہ کے لئے تھا تو پھر تو ابلیس اس حکم کا مامور ہی نہ تھا، تو اس کے جواب کی طرف اشارہ کیا کہ چونکہ فرشتوں کی جماعت میں رہتا تھا۔ اور فرشتوں کو دیئے گئے احکام کا وہ بھی مامور ہوتا تھا، لہٰذا تغلیباً فرشتوں کے ساتھ اسے بھی سجدہ کا حکم ہوا۔ (صاوی)

مگر اکثر مفسرین کی رائے یہ ہے کہ یہاں استثناء منقطع نہیں کہ وہ خلاف اصل ہے بلکہ استثناء متصل ہے اور ابلیس باعتبار نوع فرشتہ تھا اس لئے اسجدوا کے حکم میں داخل تھا مگر افعال کے لحاظ سے جنات تھا اس لئے کان من الجن فرمایا، مدارک نے اسی قول کو مقدم کیا اور خازن نے اسی کو اصح کہا، مگر دلائل کی مضبوطی کے لحاظ سے پہلا قول صحیح ہے۔ کما سیاتی۔

قوله: امتنع من السجود اس تفسیر سے مقصود یہ بیان کرنا ہے کہ ابلیس سجدہ نہ کرنے میں معذور نہیں تھا کیونکہ ابیٰ بنا ہے اِبَاءٌ سے جس کا معنی ہے "دیدہ ودانستہ بلاوجہ انکار کردینا" تو معنی یہ ہوا کہ ابلیس نے اپنے قصد وارادہ سے بلا عذر سجدہ کرنے سے انکار کردیا۔

قوله: تکبر و قال، استکبر کی تفسیر لفظ تکبر سے کر کے حضرت مفسر نے اشارہ فرمایا کہ استکبر میں باب استفعال کا خاصہ طلب ماخذ نہیں ہے بلکہ یہاں س اور ت مبالغہ کے لئے ہے۔ و قال سے ابلیس کے قیاس کی طرف اشارہ ہے، یعنی وجہ تکبر یہ ہوئی کہ ابلیس نے خود کو آدم علیہ السلام سے بڑا سمجھا اور کہا کہ میں آدم سے بہتر ہوں کیونکہ میں آگ سے پیدا ہوا وہ مٹی سے۔ آگ مٹی سے افضل ہے اور جو افضل سے پیدا ہو وہ بھی افضل لہٰذا میں آدم علیہ السلام سے افضل ہوں۔ مگر شیطان کا یہ قیاس فاسد تھا کیونکہ آدم علیہ السلام عناصر اربعہ سے پیدا کئے گئے اور ابلیس عنصر واحد یعنی صرف آگ سے پیدا کیا گیا، لہٰذا حضرت آدم علیہ السلام ہی افضل ہوئے، دوسرے یہ کہ ہر مخلوق کو پیدا کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے لہٰذا وہ جسے چاہے جس پر چاہے فضیلت عطا کرے اور جب اس نے آدم علیہ السلام کو افضل قرار دیا تو ملائکہ اور اجنہ سے افضل وہی ہوئے۔ (صاوی)

قوله: فی علم اللہ یہ دفع دخل مقدر ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ یہاں کان بمعنی صار ہے۔ لہٰذا آیت کا معنی یہ ہوگا کہ ابلیس پہلے کافر نہیں تھا سجدہ سے انکار کے سبب کافر ہوگیا، حضرت مفسر قدس سرہ نے اس احتمال کو رد کیا اور تقدیری عبارت فی علم اللہ مقدر مان کر اشارہ فرمایا کہ یہاں کان اپنے ہی معنی میں ہے۔ لہٰذا آیت کا مفہوم یہ ہے کہ ابلیس اللہ تعالیٰ کے علم میں پہلے ہی سے کافر تھا اب سجدہ نہ کرنے کی وجہ سے کافروں کی جماعت میں شامل ہوگیا۔ (صاوی ملخصاً)

قوله: بالاکل منها الخ اس عبارت سے اشارہ اس طرف ہے کہ حضرت آدم وحوا کو محض درخت کے قریب جانے

کی ممانعت نہیں تھی بلکہ اس درخت سے کھانے کی ممانعت تھی، اور درخت کے قریب نہ جانے کا جو حکم ہے اس سے قرب استعمال مراد ہے جس سے ممانعت میں شدت پیدا کرنا مقصود ہے، یعنی اس درخت سے کھانا تو کیا، کھانے کے قریب بھی نہ جانا، یہ ایسے ہی ہے جیسے فرمایاو لاتقربوھن [حائضہ عورتوں کے پاس نہ جاؤ] ظاہر ہے یہاں پاس جانے سے ممانعت نہیں بلکہ جماع کرنے کی ممانعت ہے۔

خیال رہے کہ جس درخت سے ممانعت تھی اس کے متعلق مفسرین کا اختلاف ہے، اکثر نے اسے گیہوں کا درخت کہا، بعض نے انگور اور بعض نے انجیر کا درخت کہا مگر صحیح یہ ہے کہ چونکہ اس کی تعیین پر کوئی نص قطعی نہیں اس لئے اس کا صحیح علم اللہ تعالیٰ کو ہے۔ اسی طرف مفسر علام نے بھی أو غیرھما کہہ کر اشارہ فرمایا ہے۔

قولہ: العاصین — یہ الظالمین کا التزامی ترجمہ ہے، کہ ظلم کا معنی ہے کسی شئی کو بے محل وضع کرنا جس کے لئے نافرمانی لازم ہے، لیکن یہاں ظلم کا لغوی یا التزامی معنی مراد نہیں، کیونکہ انبیاء کرام معصوم ہیں ان سے گناہ کا سرزد ہونا محال ہے۔ لہٰذا یہاں ظلم خلاف اولیٰ کے معنی میں ہے۔ اس مقام پر صاحب مدارک نے بڑی اچھی بات کہی آپ فرماتے ہیں: "و الحاصل أن العصیان وقوع الفعل علی خلاف الأمر و النهی و قد یکون عمداً فیکون ذنباً، و قد لایکون عمداً فیکون زلة" (مدارک ج ۳، ص ۶۸)

قولہ: بان قال لھما الخ — اس سلسلہ میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے کہ ابلیس کی ملاقات حضرت آدم علیہ السلام سے کیسے ہوئی اور اس نے یہ گفتگو کس مقام پر کی، ایک قول یہ ہے کہ ابلیس خارج جنت تھا اور حضرت آدم وحواء جنت کے اندر تھے، ابلیس نے باب جنت پر آکر ان سے گفتگو کی۔ دوسرا قول یہ ہے کہ ابلیس جنتی جانوروں میں سے کسی جانور کی شکل میں جنت کے اندر داخل ہو گیا جس سے خازن جنت غافل رہے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ ابلیس سانپ کے منہ میں بیٹھ کر جنت میں داخل ہوا، چوتھا قول یہ ہے کہ ابلیس نے زمین پر رہ کر ہی انھیں وسوسہ میں ڈال دیا۔ بہر حال شیطان نے کسی طرح حضرت آدم وحوا علیہما السلام کے پاس پہنچ کر مذکورہ گفتگو کی، انھیں خیال ہوا کہ اللہ پاک کی جھوٹی قسم کون کھا سکتا ہے بایں خیال حضرت حوا نے اس میں سے کچھ کھایا پھر حضرت آدم کو دیا انھوں نے خیال کیا کہ لاتقربا کی نہی تنزیہی ہے تحریمی نہیں اس لئے کچھ انھوں نے بھی کھالیا، یہاں حضرت آدم علیہ السلام سے اجتہاد میں خطا ہوئی اور خطائے اجتہادی معصیت نہیں ہوتی۔ (صاوی، تفسیر خزائن العرفان)

قولہ: ای انتما بما الخ یہ دفع دخل مقدر ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ جنت سے صرف حضرت آدم وحوا علیہما السلام کو نکلنے کا حکم دیا جا رہا ہے جس کے لئے اھبطوا جمع کا صیغہ استعمال ہوا حالانکہ دو کے لئے عربی زبان میں تثنیہ کا صیغہ استعمال ہوتا ہے۔ مفسر علام نے اس کا جواب دیا کہ یہاں جمع کا صیغہ اس اعتبار سے ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کے صلب مین قیامت تک پیدا ہونے والی ان کی ذریت بھی تھی گویا آدم وحوا علیہما السلام کے ساتھ ان کی ذریت کو بھی اترنے کا حکم ہوا، ایک احتمال یہ بھی ہے کہ یہاں اھبطوا جمع کا صیغہ لانے کی وجہ یہ ہے کہ حضرت آدم وحوا کے ساتھ ابلیس اور سانپ کو بھی جنت سے نکلنے کا حکم ملا تھا، چنانچہ حضرت آدم علیہ اسلام کو ہندوستان میں سراندیپ پہاڑ پر، حضرت حوا کو ساحل عرب پر جدہ میں، ابلیس کو بصرہ

سے قریب مقام ابلہ یعنی میسان کے جنگل میں، اور سانپ کو اصفہان میں اترنے کا حکم ہوا۔ (خازن وصاوی)

قولہ: بعض الذریۃ اس تقدیری عبارت سے مفسر علام نے اشارہ فرمایا کہ یہاں عداوت کی خبر اصول کے لئے نہیں بلکہ ان کی ذریت کے لئے ہے یعنی آدم وحوا علیہما السلام ایک دوسرے کے دشمن نہ ہوں گے بلکہ ان کی اولاد میں بعض بعض کے دشمن ہوں گے جیسا کہ آج ہے، دوسرا احتمال یہ بھی ہے کہ بعضکم کا خطاب جنت سے نکلنے والوں کے لئے ہو، یعنی انسان اور شیطان ایک دوسرے کے دشمن ہیں اور سانپ انسان کا دشمن ہے اسی طرح انسان سانپ کا دشمن ہے۔

سجدۂ آدم کی حقیقت:

سجدہ کا لغوی معنی ہے تذلل اور خضوع، اور شرعی معنی ہے وضع الجبھۃ علی الارض یعنی زمین پر پیشانی رکھنا یہاں سجدۂ آدم کے متعلق مفسرین کے چار اقوال ہیں، پہلا قول یہ ہے کہ یہاں لغوی سجدہ مراد ہے یعنی فقط تعظیم وتکریم بجالانا، اسے تفسیر حسینی میں کمال الملۃ والدین حسین بن علی کاشفی ہروی نے ذکر کیا۔

دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے انحناء یعنی جھکنا مراد ہے یعنی فرشتوں کو حضرت آدم کے سامنے جھک کر ان کی تعظیم بجا لانے کا حکم ہوا، یہی قول امام جلال الدین سیوطی کا ہے اور خازن نے اسی کو اصح کہا۔ مگر یہ دونوں قول ضعیف ہیں اولاً اس لئے کہ آیت کریمہ "فاذا سوّیتہ و نفخت فیہ من روحی فقعوا لہ سٰجدین" (سورہ حجر) تو جب میں اسے ٹھیک کرلوں اور اس میں روح پھونک دوں تو اس کے لئے سجدہ میں گر پڑنا۔ کے خلاف ہیں کیونکہ اس آیت سے واضح ہے کہ حضرت آدم کے لئے سجدہ میں گرنے کا حکم ہوا تھا جب کہ محض تعظیم اور انحنا میں گرنا نہیں ہوتا، ثانیاً اس لئے کہ جب شرعی معنی مراد لینا ممکن ہے تو اسے چھوڑ کر لغوی معنی مراد لینا درست نہیں کہ یہ خلاف اصل ہے۔ ثالثاً اس لئے کہ انحناء میں یہودیوں سے مشابہت ہے کہ وہ بھی اپنے بڑوں کی تعظیم جھک کر کرتے ہیں اور شریعت مطہرہ نے یہود ونصاریٰ کے تشبہ سے بچنے کا حکم دیا ہے۔ کما قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم و لا تشبھوا بالیھود و النصاریٰ۔

تیسرا قول یہ ہے کہ یہاں شرعی سجدہ ہی مراد ہے یعنی بنیت سجدہ زمین پر پیشانی ٹیکنا، مگر سجدۂ تعبدی نہیں بلکہ سجدہ تعظیمی مراد ہے مطلب یہ ہوا کہ سجدہ حقیقتاً اللہ تعالیٰ کے لئے تھا اور حضرت آدم علیہ السلام مثل قبلہ تھے جیسے ہم اللہ تعالیٰ کو سجدہ کرتے ہیں قبلہ کی طرف رخ کر کے یہی قول تفسیر عزیزی اور ابن کثیر کا ہے، مگر یہ بھی ضعیف ہے اولاً اس لئے کہ اس صورت میں لآدم میں لام کو الی کے معنی میں لینا پڑے گا اور بلاوجہ معقول حقیقی معنی کو چھوڑنا صحیح نہیں، ثانیاً اس لئے کہ اس صورت میں حضرت آدم علیہ السلام کی کما حقہ فضیلت ثابت نہ ہوگی کہ کبھی سجدہ کرنے والا افضل ہوتا ہے۔ جیسے کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کعبہ کی طرف سجدہ کرتے تھے حالانکہ آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کعبہ سے افضل ہیں۔

چوتھا قول یہ ہے کہ یہ سجدۂ تعظیمی تھا اور آدم علیہ السلام کے لئے ہی تھا جو پہلی شریعتوں میں جائز تھا مگر اسلام میں منسوخ ہوگیا، یہی قول امام رازی اور جمہور مفسرین کا ہے اور یہی صحیح ہے۔ (تفسیر کبیر)

ابلیس کی حقیقت:

ابلیس کی حقیقت کے سلسلہ میں مفسرین کا اختلاف ہے، ایک قول یہ ہے کہ ابلیس ابوالشیطان ہے، اور شیطان جناتوں کی ایک شاخ ہے جس میں کوئی مومن نہیں۔ دوسرا قول یہ ہے کہ ابلیس فرشتوں کی جماعت سے تھا، نافرمانی کی وجہ سے اسے جن فرمایا مطلب یہ کہ جنات اور فرشتوں کی جنس ایک ہے۔ اطاعت گزاروں کو ملک یا فرشتہ کہتے ہیں اور نافرمانوں کو جنات لہٰذا ابلیس فرشتوں کی جنس سے ہے، یہ قول اگرچہ اکثر مفسرین کا ہے مگر چند وجوہ سے قابل قبول نہیں، اولاً اگر ابلیس کو حقیقتاً فرشتہ مانا جائے تو فرشتوں سے صدور معصیت کا امکان لازم آئے گا، حالانکہ فرشتے معصوم ہیں اور ان کی صفت ہے یفعلون ما یومرون "کرتے ہیں وہ جس کا انہیں حکم ملتا ہے" ثانیاً احادیث صحیحہ سے فرشتوں کا نوری ہونا ثابت ہے جبکہ ابلیس ناری ہے، وہ خود کہتا ہے "خلقتنی من نار "تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا۔ ثالثاً فرشتوں میں نر اور مادہ نہیں جب کہ ابلیس اور اس کی ذریت میں نر اور مادہ ہوتے ہیں اور ان کی نسل بڑھتی ہے۔ غرض کہ ابلیس کو فرشتوں کی جنس سے ماننا روایت و درایت کے خلاف ہے، لہٰذا پہلا قول صحیح ہے یعنی یہ کہ ابلیس حقیقت میں جنات تھا جو اپنی عبادت اور ریاضت کی وجہ سے فرشتوں کے ساتھ رہتا تھا پھر سجدہ سے انکار کے سبب فرشتوں کی جماعت سے نکال دیا گیا۔

فوائد نافعہ: (۱) سجدہ کرنے کا حکم تمامی فرشتوں کیلئے تھا خواہ وہ زمین پر رہنے والے ہوں یا عالم بالا میں۔ (خازن)

(۲) سجدہ کرنے کا حکم سن کر سب سے پہلے حضرت جبرئیل علیہ السلام سجدے میں گئے پھر میکائیل پھر اسرافیل پھر عزرائیل پھر سارے فرشتے۔ (خزائن العرفان)

(۳) مدت سجدہ میں اختلاف ہے ایک قول یہ ہے کہ یہ سجدہ ظہر کے وقت سے عصر تک رہا، دوسرا قول یہ ہے کہ سو برس تک رہا۔ تیسرا قول یہ ہے کہ یہ سجدہ پانچ سو سال تک رہا۔ (روح البیان)

(۱) ابلیس کی موجودہ حقیقی ہیئت یہ ہے کہ اس کا جسم خنزیر کی طرح اور چہرہ بندر کی طرح ہے، کیونکہ جب تمام فرشتے سجدہ میں گرے تو ابلیس آدم علیہ السلام کی طرف پیٹھ کر کے اکڑ کے کھڑا ہو گیا اسی وقت اس کی صورت مسخ کر کے اس کی ہیئت بگاڑ دی گئی۔ (روح البیان)

(۲) ایک مرتبہ شیطان نے موسیٰ علیہ السلام سے عرض کیا کہ آپ اللہ کی بارگاہ میں میری شفاعت فرما دیجئے کہ اللہ تعالیٰ میری توبہ قبول فرمالے۔ موسیٰ علیہ السلام نے دعا فرمائی حکم الٰہی ہوا کہ آپ کی شفاعت مقبول ہے مگر شرط یہ ہے کہ ابلیس آدم علیہ السلام کی قبر کو سجدہ کرلے تو اس کی توبہ قبول ہے، موسیٰ علیہ السلام نے ابلیس کو خبر دی، اس نے جواب دیا کہ جب میں نے زندہ آدم کو سجدہ نہیں کیا تو مردے آدم کو سجدہ کیا کروں گا۔ (عزیزی)

(۳) اللہ تعالیٰ شیطان کو ایک لاکھ برس جہنم میں رکھ کر وہاں سے نکالے گا اور فرمائے گا کہ تو اب بھی آدم کو سجدہ کرلے، وہ انکار کرے گا اور پھر دوزخ میں واپس کر دیا جائے گا۔ (روح البیان)

(۴) ابلیس چالیس ہزار سال تک جنت کا خازن رہا، اسی ہزار سال تک فرشتوں کی جماعت میں رہا، بیس ہزار سال تک فرشتوں کا واعظ رہا۔ تیس ہزار سال تک تمام مخلوق کا سردار رہا۔ ایک ہزار سال تک فرشتوں کا سردار رہا چودہ ہزار سال تک عرش اعظم کا طواف کرتا رہا۔ پہلے آسمان پر ابلیس کا نام عابد تھا۔ دوسرے پر زاہد، تیسرے پر عارف، چوتھے پر ولی، پانچویں پر متقی، چھٹے پر خازن، ساتویں پر عزازیل، اور لوح محفوظ میں ابلیس (صاوی)

کنزالایمان عصمت انبیاء کا پاسبان:

یہ ہر صحیح العقیدہ مسلمان کا عقیدہ ہے کہ کسی بھی نبی کی اہانت اور اس کی شان میں ادنیٰ سی گستاخی کفر ہے، اور ہر نبی کی تعظیم وتوقیر اور ادب واحترام ہر مسلمان پر فرض عین ہے۔ مسلمانوں کا یہ عقیدہ اس قدر عام وتام اور مشہور ہے کہ ایک جاہل اور ان پڑھ مسلمان بھی عصمت انبیاء کے اسلامی نظریہ کو ایمان کا جز لاینفک تصور کرتا ہے، ہاں اگر عصمت انبیاء کا پاس ولحاظ نہیں ہے تو لیلائے نجد کے نامراد عاشقوں کو جو اپنے نشتر قلم سے مسلمانوں کے متوارث عقائد کو مجروح کرنا اپنا سب سے بڑا کمال تصور کرتے ہیں، ذیل میں اس کا ایک نمونہ ملاحظہ کریں۔ آیت کریمہ: "ولا تقربا هذه الشجرة فتكونا من الظالمين" کا ترجمہ شیطانی توحید کے علم برداروں نے حسب ترتیب یوں کیا ہے۔

(۱) مگر اس درخت کا رخ نہ کرنا ورنہ ظالموں میں شمار ہو گے۔ (مودودی)

(۲) لیکن اس درخت کے قریب بھی نہ جانا ورنہ ظالم ہو جاؤ گے۔ (محمد جونا گڑھی غیر مقلد)

(۳) اور نزدیک نہ جانا اس درخت کے ورنہ تم بھی انہیں میں شمار ہو جاؤ گے جو اپنا نقصان کر بیٹھتے ہیں۔ (تھانوی)

مذکورہ تراجم میں مودودی اور جونا گڑھی نے لفظی ترجمہ کرنے کی غلطی کی ہے جس سے حضرت آدم علیہ السلام کے لئے ظالم ہونے کا امکان ثابت ہو گیا جو عصمت انبیاء کے خلاف ہے کیونکہ معصوم ہونے کا تقاضہ یہ ہے کہ نبی کی ذات سے گناہ کبیرہ اور صغیرہ کا صدور عادتاً محال ہو۔

تھانوی جی کا ترجمہ بھی پہلے دونوں ترجمے سے مختلف نہیں کہ اپنا نقصان وہی کرتا ہے جو اپنے اوپر ظلم کرتا ہے گویا تھانوی جی نے بھی حضرت آدم علیہ السلام کے لئے ظالم ہونے کا امکان تسلیم کیا ہے صرف الفاظ بدل دیئے ہیں۔

لیکن مذکورہ تراجم کے مقابل اعلیٰ حضرت محدث بریلوی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ترجمہ ملاحظہ کیجئے اور داد دیجئے کہ سرکار اعلیٰ حضرت نے نزاکت مقام کا پاس ولحاظ کرتے ہوئے اس قدر محتاط ترجمہ کیا ہے کہ دامن عصمت نبوت پر کسی قسم کا دھبہ نہیں آتا۔ ترجمہ: "مگر اس پیڑ کے پاس نہ جانا کہ حد سے بڑھنے والوں میں سے ہو جاؤ گے۔" (کنزالایمان)

یہ ترجمہ تفاسیر کے عین مطابق ہے اور مطلب واضح ہے کہ مکروہ تنزیہی یا خلاف اولیٰ کا ارتکاب بھی حد سے تجاوز ہے مگر گناہ نہیں۔ لہٰذا یہاں ظلم خلاف اولیٰ کے معنی میں ہے۔ کما مرّ

سرکار اعلیٰ حضرت نے پورے ترجمۂ قرآن میں یہی روش اختیار فرمائی ہے کہ کہیں بھی شان الوہیت ورسالت میں

بے ادبی کا ادنی شائبہ بھی نہیں پایا جاتا بخلاف دوسرے تراجم کے کہ اکثر ترجمہ میں کم وبیش یہ نقص پایا جاتا ہے کہ کہیں شان الوہیت میں گستاخی ہو رہی ہے کہیں عصمت انبیاء پر دھبہ آتا ہے، اس سے واضح ہوتا ہے کہ کنز الایمان ایک ایسا ترجمہ قرآن ہے جو روح قرآن کا ترجمان اور عصمت انبیاء کا پاسبان ہے۔

﴿فَتَلَقّٰى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ﴾ اَلْهَمَهٗ اِيَّاهَا وَ فِیْ قِرَاءَةٍ بِنَصْبِ اٰدَمَ وَ رَفْعِ كَلِمَاتٍ اَیْ جَاءَتْهُ وَ هِیَ رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا الاٰيَةَ فَدَعَا بِهَا ﴿فَتَابَ عَلَيْهِ﴾ قَبِلَ تَوْبَتَهٗ ﴿اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ﴾ عَلٰى عِبَادِهٖ ﴿اَلرَّحِيْمُ o﴾ بِهِمْ ﴿قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا﴾ مِنَ الْجَنَّةِ ﴿جَمِيْعاً﴾ كَرَّرَهٗ لِيَعْطِفَ عَلَيْهِ ﴿فَاِمَّا﴾ فِيْهِ اِدْغَامُ نُوْنِ اِنِ الشَّرْطِيَّةِ فِیْ مَا الْمَزِيْدَةِ ﴿يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّیْ هُدًى﴾ كِتَابٌ وَ رَسُوْلٌ ﴿فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ﴾ فَاٰمَنَ بِیْ وَ عَمِلَ بِطَاعَتِیْ ﴿فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ o﴾ فِی الْاٰخِرَةِ بِاَنْ يَّدْخُلُوا الْجَنَّةَ ﴿وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا﴾ كُتُبِنَا ﴿اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ o﴾ مَاكِثُوْنَ اَبَداً لَا يَفْنُوْنَ وَ لَا يُخْرَجُوْنَ.

ترجمہ: ﴿پھر سیکھ لئے آدم نے اپنے رب سے کچھ کلمے﴾ اللہ نے ان کلمات کا انہیں الہام فرمایا اور ایک قرأت میں آدم کے نصب اور کلمات کے رفع کے ساتھ پڑھا گیا ہے یعنی وہ کلمات آدم کو حاصل ہوئے اور وہ کلمات ہیں ربنا ظلمنا الخ تو انھیں کلمات کے ذریعہ آدم نے دعا مانگی ﴿تو اللہ نے اس کی توبہ قبول کی بے شک وہی ہے بہت توبہ قبول کرنے والا﴾ اپنے بندوں کی اور ان پر ﴿مہربان ہم نے حکم دیا اتر جاؤ اس سے﴾ یعنی جنت سے ﴿سب کے سب﴾ اس کی تکرار اس لئے ہے کہ اگلا جملہ اس پر عطف ہو سکے ﴿پھر اگر﴾ یہاں (امّا میں) نون شرطیہ کا ما زائدہ میں ادغام ہے۔ ﴿تمہارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت آئے﴾ کتاب اور رسول ﴿تو جو میری ہدایت کا پیرو ہوا﴾ یعنی جو مجھ پر ایمان لایا اور میرا اطاعت گزار بنا ﴿انھیں نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے﴾ یعنی آخرت میں کیونکہ وہ جنت میں داخل ہوں گے۔ ﴿اور وہ جو کفر کریں گے اور میری آیتیں جھٹلائیں گے﴾ کتابوں کو ﴿وہ دوزخی ہوں گے اس میں ہمیشہ رہیں گے﴾ ہمیشہ اس طرح رہیں گے کہ نہ کبھی فنا ہوں گے نہ کبھی نکالے جائیں گے۔

توضیح و تشریح: قولہ: و فی قراءۃ الخ یہ اختلاف قرأت کا بیان ہے، ایک قرأۃ تو وہی ہے آدم کے رفع اور کلمات کے جر کے ساتھ جس کا معنی اوپر مذکور ہوا۔ دوسری قرأت میں مفعولیت کی وجہ سے آدم کو نصب اور فاعلیت کی بنا پر کلمات کو رفع ہے اس صورت میں آیت کا معنی ہوا کہ وہ کلمات حضرت آدم علیہ السلام کو حاصل ہوئے، یعنی ربنا ظلمنا الآیہ۔

نکتہ: مذکورہ دونوں قرأتوں میں ایک لطیف نکتہ یہ ہے کہ پہلی قرأت میں اشارہ ہے۔ آیت کریمہ "ربنا ظلمنا انفسنا الخ" کی جانب، کہ یہ دعا بطور الہام اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو سکھائی گئی تھی، اور دوسری قرأت میں اشارہ ہے لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی جانب، جیسا کہ تفسیر روح البیان وغیرہ نے یہ روایت نقل فرمائی کہ، جب حضرت آدم علیہ السلام بہت زیادہ پریشان ہو گئے اور آپ کی دعا قبول نہ ہوئی تو آپ کو ایک دن یاد آیا کہ میں نے اپنی پیدائش کے وقت

عرش اعظم پر لکھا دیکھا تھا "لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ" میں سمجھا تھا کہ بارگاہ الٰہی میں وہ رتبہ کسی کو میسر نہیں جو محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو حاصل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کا نام اپنے نام اقدس کے ساتھ عرش پہ مکتوب فرمایا لہٰذا آپ نے اپنی دعا میں ربنا ظلمنا الایہ کے ساتھ یہ عرض کیا، اسئلك بحق محمد ان تغفرلی یہ دعا کرنی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی مغفرت فرمائی۔ و اللہ تعالیٰ اعلم۔

قولہ: قبل توبته یہ فتاب علیه کی تفسیر ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ تاب، توب سے بنا ہے جس کا معنی ہے لوٹنا، رجوع کرنا، لہٰذا توبہ رب کی بھی صفت ہے اور بندے کی بھی مگر حیثیت مختلف ہے، کہ بندے کی توبہ ہے گناہ سے اطاعت و فرمانبرداری کی طرف رجوع کرنا، مگر رب تعالیٰ کی توبہ ہے سزا سے مغفرت کی طرف رجوع فرمانا یعنی بندوں کی توبہ قبول فرمانا، اسی معنی کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ توّاب ہے کہ بندہ ہزاروں بار توبہ کرے اور پھر غلطی سے گناہ صادر ہوتا رہے پھر بھی اس کی توبہ قبول ہوتی رہتی ہے۔ اور بندہ اس لحاظ سے توّاب ہے کہ جب جب گناہ کرتا ہے، توبہ کرتا ہے۔ البتہ توبہ کرنے والے بندے کو تائب کہا جاتا ہے مگر اللہ تعالیٰ کو تائب کہنا درست نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے اسماء توقیفی ہیں۔

قولہ: کررہ الخ یہ تکرار امر کی حکمت کی طرف اشارہ ہے یعنی نیچے اترنے کا حکم دوبار ہوا، اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلے حکم سے محض ناراضگی کا اظہار مقصود تھا، اور دوسرے حکم میں احکام شرعیہ کے مکلّف ہونے کی طرف اشارہ ہے اور بتایا جارہا ہے کہ جو دنیا میں رہ کر رب کی فرمانبرداری کرے گا وہ سعید ہوگا اور آخرت کے خوف وغم سے محفوظ ہوگا۔ اور جو بےعمل ہوگا وہ شقی ہوگا آخرت کے عذاب میں گرفتار ہوگا لہٰذا دونوں حکموں کی غرض وغایت الگ الگ ہے اس لئے یہاں تکرار حقیقتاً نہیں۔ (صاوی ملخصاً)

عصمت انبیاء: اس سلسلہ میں اہلسنت وجماعت کا مذہب یہ ہے کہ انبیاء کرام سے معصیت کا صدور ممکن بالذات ممتنع بالغیر ہے۔ ان سے کبھی کوئی گناہ قصداً اور ارادۃً صادر نہیں ہوتا، صغیرہ نہ کبیرہ، اعلان نبوت سے پہلے نہ اعلان نبوت کے بعد۔ البتہ خطائے اجتہادی وخلاف اولیٰ کا صدور انبیاء کرام سے بھی ممکن ہے بلکہ واقع ہے مگر یہ گناہ نہیں بلکہ حسنات الابرار سیئات المقربین کے قبیل سے ہے چنانچہ محقق علی الاطلاق شیخ عبدالحق محدث دہلوی قدس سرہ تحریر فرماتے ہیں:

واجب است ایمان آوردن بہمہ انبیاء بے فرق در اصل نبوت و واجب است احترام و تنزیہہ عزت ایشاں از وصمت نقص و عصمت ایشاں از جمیع گناہاں خرد و بزرگ پیش از نبوت و وپس از وے ہمیں است قول مختار و آنچہ در قرآن مجید بآدم نسبت عصیاں کردہ وعتاب نمودہ مبنی بر علوشان وقرب اوست

جملہ انبیائے کرام علیہم السلام پر ایمان لانا واجب ہے اس طرح کہ اصل نبوت میں کوئی فرق نہ کرے اور تعظیم وتوقیر کرنا اور نقص کے عیب سے ان حضرات کی بارگاہ عزت کو پاک سمجھنا اور قبل نبوت اور بعد نبوت صغیرہ وکبیرہ گناہوں سے انہیں معصوم جاننا واجب ہے، یہی قول مختار ہے اور وہ جو قرآن مجید میں حضرت آدم علیہ السلام کی طرف عصیاں کی نسبت کی گئی ہے اور عتاب فرمایا گیا ہے تو وہ ان کی شان کی بلندی اور تقرب پر مبنی ہے۔

(اشعۃ اللمعات جلد اول ص ۴۰، مکتبہ نوریہ سکھر پاکستان)

علامہ عبدالعزیز پر ہاروی حنفی تحریر فرماتے ہیں:

المذکور فی کلام الشارح هو مذهب عامة المتکلمین و خالفهم جمهور جمع من العلماء فذهبوا الی العصمة عن الصغائر و الکبائر قبل الوحی و بعده وهو مختار ابی المنتهی شارح الفقه الاکبر و الشیخ عبد الحق المحدث الدهلوی

کلام شارح (شرح عقائد) میں جو مذکور ہے (انبیاء کرام سے اعلان نبوت سے پہلے کبیرہ اور اعلان نبوت کے بعد صغیرہ کا صدور جائز ہے) وہ عام متکلمین کا مذہب ہے اور جمہور علما کی ایک جماعت نے اس کی مخالفت کی ہے اور کہا ہے کہ انبیائے کرام اعلان نبوت سے پہلے اور بعد صغیرہ وکبیرہ سے معصوم ہوتے ہیں ابوالمنتہی شارح فقہ اکبر اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی کا بھی یہی مختار ہے۔ (نبراس ۲۴۸ مکتبہ تھانوی، دیوبند)

قاضی عیاض مالکی تحریر فرماتے ہیں:

و الصحیح ان شاء الله تنزیههم من کل عیب و عصمتهم من کل مایوجب الریب

ان شاء اللہ صحیح مسلک یہی ہے کہ انبیائے کرام ہر عیب سے منزہ ہیں اور ہر اس چیز سے معصوم ہیں جس سے گناہ کا شک پیدا ہو۔ (شفا شریف جلد ۲، ص ۱۴۷ مطبوعہ پور بند، گجرات)

حضرت آدم علیہ السلام کی لغزش جیسا کہ ماقبل میں گزرا کہ گناہ نہیں بلکہ حسنات الابرار سیئات المقربین کے قبیل سے تھی، اس کی قدرے توضیح یہ ہے کہ کوئی فعل گناہ اس وقت ہوتا ہے جب کہ کسی شرعی حکم کی نافرمانی کا عزم اور قصد پایا جائے، اور اگر عزم وارادہ مفقود ہے محض بے ارادہ اور بھول چوک سے کوئی ایسا فعل سرزد ہوجائے جو بظاہر کسی حکم شرعی کے خلاف ہے تو اسے گناہ نہیں کہتے اور ایسے امور کا صدور عصمت انبیاء کے منافی نہیں، چنانچہ حضرت آدم علیہ السلام سے بھی یہی کچھ ہوا جس کی شہادت قرآن مجید نے بڑے واضح انداز میں ایک دوسرے مقام پر یوں پیش کی "فنسی و لم نجد له عزما" (سورۂ طٰہ) یعنی آدم سے یہ حرکت بھول سے ہوئی اس کا عزم وارادہ ہرگز نہ تھا، اور جب تک عزم وارادہ نہ ہو اس فعل کو گناہ نہیں کہا جاسکتا، لہٰذا حضرت آدم علیہ السلام کی لغزش حقیقتاً گناہ نہیں، مگر بظاہر خطا ہے۔ جس سے انکار کی گنجائش نہیں کیونکہ اس فعل کا خطا ہونا نص قطعی سے ثابت ہے۔ (صاوی وضیاء القرآن)

مولانا مودودی تنقیص کی وادی میں:

ابھی مذکور ہوا کہ انبیاء کرام معصوم عن الخطاء ہیں اور ان کی شان میں ادنیٰ توہین بھی موجب کفر ہے اور یہ بھی گزرا کہ حضرت آدم علیہ السلام نے خلاف اولیٰ کا ارتکاب کیا تھا جو معصیت نہیں، مگر مولانا مودودی اپنے بھرپور جذبۂ شقاوت کے ساتھ عظمت نبوت پر نشتر قلم چلاتے ہوئے فتاب علیه انه هو التواب الرحیم کے تحت یوں رقم طراز ہیں:

"اس کے معنی یہ ہوئے کہ آدم اپنی نافرمانی پر عذاب کے مستحق نہ رہے، گناہ گاری کا جو داغ ان کے دامن پر لگ گیا

تھا وہ دھوڈالا گیا۔‘‘ (تفہیم القرآن حصہ اول ص ۶۸)

کیا سمجھے آپ؟ مودودی صاحب کہنا یہ چاہتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام اپنی لغزش کے سبب نافرمان اور گنہگار ہو گئے تھے اور اس پر عذاب کے مستحق بھی تھے، مگر اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول کر کے ان کے گناہ کو دھوڈالا۔

کیا کوئی مسلمان تنقیص شان نبوت پر جذبات کی یہ ترنگ آسانی سے برداشت کرسکتا ہے؟ کہ کسی نبی کو معاذ اللہ نافرمان، گنہگار اور عذاب کا مستحق کہنے کی جسارت کرے مگر سر پیٹیے مولانا مودودی کی ملحدانہ ذہنیت اور قلم بدست کی بے لگامی پر کہ کس جرأت کے ساتھ احتیاط وادب کی تمام دیواریں پھلانگ کر توہین وتنقیص کی وادی میں قدم رکھا پھر بھی پکا موحد ہونے کا سینہ ٹھونک دعویٰ برقرار ہے۔ یہ ہے ائمہ سلف کی غلامی سے آزادی کا نتیجہ۔

دست جنوں نے ایسی اڑائی ہیں دھجیاں

چھوڑا نہ ایک جیب وگریباں کے تار کو

﴿يٰبَنِيْٓ اِسْرَآئِيْلَ﴾ اَوْلَادَ يَعْقُوْبَ ﴿اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ﴾ اَيْ عَلٰى اٰبَائِكُمْ مِنَ الْاِنْجَاءِ مِنْ فِرْعَوْنَ وَ فَلْقِ الْبَحْرِ وَ تَظْلِيْلِ الْغَمَامِ وَ غَيْرِ ذٰلِكَ بِاَنْ تَشْكُرُوْهَا بِطَاعَتِيْ ﴿وَ اَوْفُوْا بِعَهْدِيْ﴾ اَلَّذِيْ عَهِدْتُهٗ اِلَيْكُمْ مِنَ الْاِيْمَانِ بِمُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ﴿اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ﴾ اَلَّذِيْ عَهِدْتُهٗ اِلَيْكُمْ مِنَ الثَّوَابِ عَلَيْهِ بِدُخُوْلِ الْجَنَّةِ ﴿وَ اِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ ۝﴾ خَافُوْنِ فِيْ تَرْكِ الْوَفَاءِ بِهٖ دُوْنَ غَيْرِيْ ﴿وَ اٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ﴾ مِنَ الْقُرْاٰنِ ﴿مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ﴾ مِنَ التَّوْرٰةِ بِمُوَافَقَتِهٖ فِي التَّوْحِيْدِ وَ النُّبُوَّةِ ﴿وَ لَاتَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍ بِهٖ﴾ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لِاَنَّ خَلْفَكُمْ تَبَعٌ لَّكُمْ فَاِثْمُهُمْ عَلَيْكُمْ ﴿وَ لَاتَشْتَرُوْا﴾ تَسْتَبْدِلُوْا ﴿بِاٰيٰتِيْ﴾ اَلَّتِيْ فِيْ كِتَابِكُمْ مِنْ نَعْتِ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ﴿ثَمَنًا قَلِيْلًا﴾ عِوَضًا يَسِيْرًا مِنَ الدُّنْيَا اَيْ لَاتَكْتُمُوْهَا خَوْفَ فَوَاتِ مَا تَاْخُذُوْنَهٗ مِنْ سَفَلَتِكُمْ ﴿وَ اِيَّايَ فَاتَّقُوْنِ﴾ خَافُوْنِ فِيْ ذٰلِكَ دُوْنَ غَيْرِيْ.

ترجمہ: ﴿اے بنی اسرائیل﴾ یعقوب (علیہ السلام) کی اولاد ﴿یاد کرو میرا وہ احسان جو میں نے تم پر کیا﴾ یعنی تمہارے آباء واجداد پر مثلاً فرعون سے نجات، سمندر کا چاک کرنا، اور بادلوں کا سایہ فگن کرنا وغیرہ اس طرح کہ میری اطاعت کر کے ان احسانات کا شکریہ ادا کرو۔ ﴿اور میرا عہد پورا کرو﴾ جو میں نے تم سے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر ایمان لانے کا کیا تھا۔ ﴿میں تمہارا عہد پورا کروں گا﴾ جو میں نے تم سے اس پر ثواب عطا کر کے جنت میں داخل کرنے کا کیا ہے۔ ﴿اور خاص میرا ہی ڈر رکھو﴾ بدعہدی میں مجھ ہی سے ڈرو کسی اور سے نہیں ﴿اور ایمان لاؤ اس پر جو میں نے اتارا﴾ یعنی قرآن ﴿اس کی تصدیق کرتا ہوا جو تمہارے ساتھ ہے﴾ یعنی توریت کی کہ توحید ونبوت میں اس کے موافق ہے۔ ﴿اور سب سے پہلے اس کے منکر نہ بنو﴾ کتابیوں میں سے کہ تمہارے بعد کی نسل تمہاری تابع ہوگی لہٰذا ان کا گناہ بھی تم پر ہوگا۔ ﴿اور نہ خرید وتم ﴾ نہ بدلو ﴿میری آیتوں کے عوض﴾ جو تمہاری کتاب میں ہیں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی صفات کے متعلق ﴿تھوڑی سی قیمت﴾

دنیا کا تھوڑا سا معاوضہ یعنی انھیں نہ چھپاؤ اس منافع کے فوت ہونے کے خوف سے جو تم اپنی عوام سے حاصل کرتے ہو۔ ﴿اور مجھی سے ڈرو﴾ اس معاملہ میں صرف مجھ سے ہی خوف کرو کسی اور سے نہیں۔

توضیح و تشریح: قوله: اولاد یعقوب مفسر علام نے اس عبارت سے اشارہ فرمایا کہ بنی اسرائیل سے مراد اولاد یعقوب ہیں یہ حضرت اسحٰق بن ابراہیم علیہما السلام کے فرزند تھے، یعقوب عقب سے بنا ہے جس کا معنی ہے ''پیچھے'' چونکہ آپ اپنے بھائی ''عیص'' کے ساتھ جڑواں پیدا ہوئے تھے مگر آپ اپنے بھائی سے کسی قدر پیچھے پیدا ہوئے اس لئے حضرت اسحٰق علیہ السلام نے آپ کا نام یعقوب رکھا تھا، ایک مرتبہ حضرت اسحٰق علیہ السلام گوشہ نشیں ہوئے اور ان کو حجرہ کے دروازہ پر بٹھادیا کہ کسی کو اندر نہ آنے دیں، اچانک ایک مقرب فرشتہ انسانی شکل میں آیا اور حضرت اسحٰق سے ملاقات کا اشتیاق ظاہر کیا، آپ نے منع کیا مگر وہ نہ مانا، آپ نے اس کو جبراً روکنے کی کوشش کی حضرت اسحٰق علیہ السلام شور سن کر باہر آئے، دیکھا کہ حضرت یعقوب فرشتہ سے جھگڑ رہے ہیں، فرمایا بیٹے یہ مقرب فرشتہ ہے اور فرشتہ سے معذرت فرمائی، فرشتہ نے یعقوب علیہ السلام کی تعریف کی اور کہا کہ اسی طرح حق خدمت ادا کرنا چاہئے اور پھر حضرت اسحٰق علیہ السلام سے کہا کہ ہماری طرف سے ان کا نام اسرائیل رکھو۔ (تفسیر عزیزی)

اسرائیل عبرانی زبان کا کلمہ ہے جو دو لفظوں ''اسرا'' اور ''ایل'' سے مرکب ہے، اسرا کا معنی بندہ یا برگزیدہ ہے اور ایل عبرانی زبان میں اللہ تعالیٰ کا نام ہے لہٰذا اسرائیل کا معنی ہوا عبداللہ یا اللہ کا مقبول بندہ۔ (ایضاً)

خیال رہے یہاں اولاد یعقوب یعنی یہود کو خصوصی خطاب کرنے میں یہ مصلحت ہے کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے زمانۂ پاک میں تمام اقوام عالم خصوصاً جزیرۂ عرب کے باشندوں میں یہود کو ایک اہم مقام حاصل تھا، چار ہزار سال تک سلسلۂ نبوت ان میں جاری رہا، ہزاروں نبی ان میں پیدا ہوئے جس کی وجہ سے کوئی قوم علم و حکمت میں ان کی برابری کا دعویٰ نہیں کرسکتی تھی، ان کے گردونواح میں بسنے والے قبائل ان کی علمی برتری سے بہت مرعوب تھے یہاں تک کہ بعض لوگوں نے اسلام قبول کرنے کی یہ شرط لگا رکھی تھی کہ اگر یہود نے اسلام قبول کیا تو وہ بھی قبول کریں گے، اس لئے قرآن حکیم نے یہود کو خاص طور پر اسلام کی طرف بلایا تاکہ ان کے اسلام لانے سے دوسرے لوگوں کے لئے اسلام قبول کرنے کی راہ ہموار ہوجائے، اور اگر وہ اسلام قبول نہ کریں تو ان کی ہٹ دھرمی کا پردہ چاک ہوجائے اور دنیا کو پتہ چل جائے کہ یہ صرف دنیاوی اقتدار اور دولت و ثروت کے باعث اسلام کی مخالفت کررہے ہیں۔ (تفسیر ضیاء القرآن)

قوله: وغیر ذلك الخ اس سورۃ کے اندر بنی اسرائیل سے متعلق دس احسانات اور دس قبائح کا ذکر ہے، اولاً احسانات کا بیان ہے جن میں تین تو وہی ہیں جو تفسیر میں مذکور ہیں، باقی سات احسانات جن کی طرف مفسر علام نے وغیر ذلک کہہ کر اشارہ فرمایا ہے یہ ہیں: (۱) ان کی خطاؤں کو معاف کرنا، (۲) حضرت موسیٰ علیہ السلام پر توریت کا نازل فرمانا (۳) پتھر سے بارہ چشموں کا جاری کرنا، (۴) مرنے کے بعد زندہ کرنا، (۵) من و سلویٰ کا نازل کرنا، (۶) مصر کی سلطنت عطا فرمانا، (۷) دریا کا خشک کرنا۔ (صاوی)

خیال رہے کہ آیت میں خطاب زمانۂ رسالت کے یہود اور قیامت تک آنے والی ان کی ذریت سے ہے حالانکہ مذکورہ احسانات ان کے آباء واجداد پر ہوئے تھے، مگر چونکہ باپ دادا پر احسان اولاد پر احسان ہے اس لئے خطاب درست ہے اور کسی اعتراض کی گنجائش نہیں۔

قولہ: من الایمان بمحمد چونکہ یہاں عہد میں چند احتمالات ہیں اس لئے مفسر علام نے ترجیح بین الاقوال کرتے ہوئے اپنی اس تفسیر سے اشارہ فرمایا کہ یہاں نبی آخر الزماں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر ایمان لانے کا عہد مراد ہے جس کا ذکر سورہ اعراف کی اس آیت میں ہے "الذین یتبعون الرسول النبی الامی الذی یجدونہ مکتوبا عندھم فی التوراۃ و الانجیل" (وہ جو غلامی کریں گے اس رسول بے پڑھے غیب کی خبریں دینے والے کی جسے لکھا ہوا پائیں گے اپنے پاس توریت اور انجیل میں) یا مفسر علیہ الرحمہ کا اشارہ اس عہد کی طرف ہے جو خاص بنی اسرائیل سے لیا گیا تھا جس کا ذکر سورہ مائدہ کی اس آیت میں ہے۔ و لقد اخذ اللہ میثاق بنی اسرائیل و بعثنا منھم اثنی عشر نقیبا" (اور بے شک اللہ نے بنی اسرائیل سے عہد لیا اور ہم نے ان میں بارہ سردار قائم کئے۔)

قولہ: بدخول الجنۃ — اس عہد کا ذکر سورۂ مائدہ کی اس آیت میں ہے: "لاکفرن عنکم سیاتکم و لادخلنکم جنت تجری من تحتھا الانھر" (بے شک میں تمہارے گناہ اتار دوں گا اور ضرور تمہیں باغوں میں لے جاؤں گا جن کے نیچے نہریں رواں ہیں)

خیال رہے اللہ تعالیٰ پر کچھ واجب نہیں مگر اس نے محض اپنے فضل و کرم سے اپنے بندوں سے بہت سارے وعدے فرمائے ہیں مثلاً تمہارے گناہ معاف کروں گا، تم کو دنیا و آخرت کے غم سے نجات دوں گا، تم کو اپنا دیدار کراؤں گا، تمہیں جنت میں داخل کروں گا وغیرہ وغیرہ۔

قولہ: دون غیری — یہ بیان اختصاص کی جانب اشارہ ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ یہاں آیت میں ایای جو بظاہر فارھبون کا معمول مقدم ہے دراصل فعل محذوف کا معمول ہے تقدیری عبارت یوں ہوگی "ایای ارھبوا فارھبونی" گویا یہاں تکرار فعل ہے جو حصر میں ابلغ ہے بنسبت اس حصر کے جو ایاک نعبد میں ہے، کیونکہ ایاک معمول ہے نعبد کا جو تکرار فعل کی منزل میں نہیں۔

خیال رہے یہاں مفسر علام نے فارھبون کی تفسیر خافونِ سے کی ہے قریب المعنی ہونے کی وجہ سے پھر جاننا چاہئے کہ خوف اور رہب میں قدرے فرق ہے وہ یہ کہ خوف کا معنی ہے محض ڈر جانا مثلاً جب عذاب آخرت کا بیان سنا تو دل کانپ اٹھا، یہ خوف ہے اور اللہ کی پکڑ سے ڈر کر گناہوں سے توبہ کر لی اور پھر ان کے قریب نہ گیا، یہ رہب ہے۔ (تفسیر کبیر)

گویا اس آیت میں خاص طور سے علمائے بنی اسرائیل کو خطاب ہے جو اس بات سے خوف زدہ تھے کہ اگر وہ ایمان لے آئیں گے تو ان کے عقیدت مندوں سے جو مالی منفعت انہیں حاصل ہو رہی ہے وہ بند ہو جائے گی، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے انہیں متنبہ فرمایا کہ ایسی باتوں سے ہراساں مت ہو اور نقض عہد سے توبہ کر کے نبی آخر الزماں پر ایمان لے آؤ اور اپنے خدا سے ڈرو جو

روزی رساں ہے۔

قولہ: من القرآن یہ ترجیح بین القولین ہے، دوسرا قول یہ ہے کہ یہاں بما انزلت سے قرآن اور حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نیز ان کے جملہ فرامین مراد ہوں۔ (تفسیر کبیر)

قولہ: من اھل الکتاب الخ یہ دفع دخل مقدر ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ یہاں مدینہ شریف کے یہودیوں سے فرمایا جارہا ہے کہ تم قرآن کے پہلے منکر نہ بنو، حالانکہ ان سے پیشتر مشرکین مکہ قرآن اور صاحب قرآن کو ماننے سے انکار کرچکے تھے کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے بعثت کے بعد تیرہ سال تک مکہ اور نواح مکہ میں تبلیغ فرمائی اس کے بعد مدینہ تشریف لائے۔ مفسر علام نے جواب دیا کہ یہاں حقیقی اولیت مراد نہیں بلکہ مراد یہ ہے کہ تم کتابیوں میں پہلے منکر نہ بنو کہ تمہارے انکار سے گردو نواح کے اسرائیلی بھی انکار کردیں گے اور تم ان کے لحاظ سے پہلے کافر بنو گے، یا یہ مراد ہے کہ تم اپنی آیندہ نسل کے لحاظ سے پہلے کافر نہ بنو کیونکہ اولاد اکثر اپنے آباء اور اجداد ہی کے دین پر ہوتی ہے تو قیامت تک آنے والے کتابیوں کے لحاظ سے تم پہلے کافر ہوگے۔ اور ان کا گناہ بھی تمہارے سر جائے گا۔ لان من سن سنۃ سیئۃ فعلیہ وزرھا و وزر من عمل بھا الی یوم القیمۃ (صاوی، تفسیر نعیمی)

قولہ: تستبدلوا۔ یہاں مفسر علیہ الرحمہ نے اشارہ کیا کہ اس مقام پر شراء معنی حقیقی میں نہیں بلکہ مطلق استبدال اور تبادلہ کے معنی میں ہے یعنی اشتراء مستعار ہے استبدال کے لئے۔

قولہ: التی فی کتابکم الخ یہاں سے مفسر علام یہ اشارہ فرمارہے ہیں کہ بایتی سے مراد قرآن کی آیتیں نہیں ہیں بلکہ اس سے توریت وانجیل کی وہ آیات مراد ہیں جن میں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی نعت وصفت ہے۔

قولہ: ای لاتکتموھا الخ حضرت مفسر قدس سرہ اس عبارت سے آیت کا مفہوم واضح کرنا چاہتے ہیں یعنی آیت کا مقصد یہ ہے کہ اے یہودیو! حضور کی نعت دولتِ دنیا کے لئے مت چھپاؤ کہ متاع دنیا ثمن قلیل اور آخرت کے مقابل بے حقیقت ہے، تفسیر خزائن العرفان میں اس آیت کا شان نزول بیان کرتے ہوئے تحریر فرمایا کہ یہ آیت کعب بن اشرف اور دوسرے رؤسا و علمائے یہود کے حق میں نازل ہوئی جو اپنی قوم کے جاہلوں اور کمینوں سے روپے وصول کرتے اور ان پر سالانہ مقرر کرتے تھے اور پھلوں ونقد مالوں میں اپنے حق معین کرلئے تھے، انھیں اندیشہ ہوا کہ توریت میں جو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی نعت وصفت ہے اگر اس کو ظاہر کریں تو قوم حضور پر ایمان لے آئے گی اور ان کو کوئی پوچھنے والا نہ رہے گا اور یہ تمام منافع جاتے رہیں گے اس لئے انھوں نے اپنی کتابوں میں تغیر کی اور حضور کی نعت کو بدل ڈالا جب ان سے لوگ دریافت کرتے کہ توریت میں حضور کے کیا اوصاف ہیں تو وہ چھپالیتے اور ہرگز نہ بتاتے اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

ایک اشکال اور اس کا جواب: یہاں بظاہر ایک اشکال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا و لاتشتروا بایتی ثمنا قلیلا یعنی میری آیتوں کے بدلے تھوڑی قیمت نہ لو۔ حالانکہ کسی چیز سے ثمن یعنی دام نہیں خریدا جاتا بلکہ کوئی بھی چیز دام دے کر خریدی جاتی ہے کیونکہ ثمن وہ چیز کہلاتی ہے جو بذات خود کوئی فائدہ نہ دے بلکہ اس سے فائدہ مند

چیزیں حاصل کی جائیں۔ مثلاً روپیہ پیسہ نہ کھایا جا سکتا ہے اور نہ پہننے میں آ سکتا ہے البتہ اس سے غذا اور لباس وغیرہ خریدتے ہیں، لہٰذا یہاں آیت کا ظاہری مفہوم عرف اور عادت کے خلاف ہے۔

اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ جس طرح قیمت اور متاع میں مقصود بالذات متاع ہے اور قیمت متاع حاصل کرنے کا ذریعہ ہے، اسی طرح دنیا اور آخرت میں انسان کے لئے مقصود بالذات آخرت کے منافع ہیں اور دنیا منافع آخرت حاصل کرنے کا ذریعہ ہے کہ یہ خود نفع بخش نہیں بلکہ آخرت کی زندگی بنانے اور بگاڑنے کا آلہ ہے۔ اسی لئے فرمایا گیا الدنیا مزرعة الآخرة (دنیا آخرت کی کھیتی ہے) لہٰذا دنیا قیمت اور آخرت اصل مقصود یعنی متاع ہے اور بنی اسرائیل نے آیات الٰہی کے عوض دنیا کو لیا تو گویا اصل کے بدلے قیمت کو خریدا، اس لئے یہاں بطور استعارہ فرمایا۔ ولا تشتروا بایاتی ثمنا قلیلا جس میں آیت اور ثمن قلیل کا استعارہ کیا گیا ہے متاع اور قیمت سے۔ اسے استعارہ مصرحہ کہتے ہیں۔

﴿وَ لَاتَلْبِسُوْا﴾ تَخْلِطُوْا ﴿الْحَقَّ﴾ اَلَّذِیْ اَنْزَلْتُ عَلَیْکُمْ ﴿بِالْبَاطِلِ﴾ اَلَّذِیْ تَفْتَرُوْنَهٗ ﴿وَ لَاتَکْتُمُوا الْحَقَّ﴾ نَعْتَ مُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ ﴿وَ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴾ اَنَّهٗ حَقٌّ ﴿وَ اَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّکٰوةَ وَ ارْکَعُوْا مَعَ الرّٰکِعِیْنَ ○﴾ صَلُّوْا مَعَ الْمُصَلِّیْنَ مُحَمَّدٍ وَ أَصحَابِهٖ، وَ نَزَلَ فِیْ عُلَمَائِهِمْ کَانُوْا یَقُوْلُوْنَ لِاَقْرِبَائِهِمُ الْمُسْلِمِیْنَ اُثْبُتُوْا عَلٰی دِیْنِ مُحَمَّدٍ فَاِنَّهٗ حَقٌّ ﴿اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ﴾ بِالْاِیْمَانِ بِمُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ ﴿وَ تَنْسَوْنَ اَنْفُسَکُمْ﴾ تَتْرُکُوْنَهَا فَلَا تَاْمُرُوْنَهَا بِهٖ ﴿وَ اَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْکِتٰبَ﴾ اَلتَّوْرٰةَ وَ فِیْهَا الْوَعِیْدُ عَلٰی مُخَالَفَةِ الْقَوْلِ الْعَمَلَ ﴿اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ○﴾ سُوْءَ فِعْلِکُمْ فَتَرْجِعُوْنَ فَجُمْلَةُ النِّسْیَانِ مَحَلُّ الْاِسْتِفْهَامِ الْاِنْکَارِیْ ﴿وَ اسْتَعِیْنُوْا﴾ اُطْلُبُوا الْمَعُوْنَةَ عَلٰی اُمُوْرِکُمْ ﴿بِالصَّبْرِ﴾ اَلْحَبْسِ لِلنَّفْسِ عَلٰی مَا تَکْرَهُ ﴿وَ الصَّلٰوةِ﴾ اَفْرَدَهَا بِالذِّکْرِ تَعْظِیْمًا لِشَانِهَا وَ فِی الْحَدِیْثِ کَانَ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِذَا حَزَبَهٗ اَمْرٌ بَادَرَ اِلَی الصَّلٰوةِ وَ قِیْلَ الْخِطَابُ لِلْیَهُوْدِ لَمَّا عَاقَهُمْ عَنِ الْاِیْمَانِ الشَّرَهُ وَ حُبُّ الرِّیَاسَةِ فَاُمِرُوْا بِالصَّبْرِ وَ هُوَ الصَّوْمُ لِاَنَّهٗ یُکَسِّرُ الشَّهْوَةَ وَ الصَّلٰوةِ لِاَنَّهَا تُوْرِثُ الْخُشُوْعَ وَ تَنْفِی الْکِبْرَ ﴿وَ اِنَّهَا﴾ اَیِ الصَّلٰوةَ ﴿لَکَبِیْرَةٌ﴾ ثَقِیْلَةٌ ﴿اِلَّا عَلَی الْخٰشِعِیْنَ ○﴾ اَلسَّاکِنِیْنَ اِلَی الطَّاعَةِ ﴿اَلَّذِیْنَ یَظُنُّوْنَ﴾ یُوْقِنُوْنَ ﴿اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ﴾ بِالْبَعْثِ ﴿وَ اَنَّهُمْ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ ○﴾ فِی الْاٰخِرَةِ فَیُجَازِیْهِمْ.

ترجمہ: ﴿اور مت ملاؤ حق کو﴾ جسے میں نے تم پر نازل کیا ہے ﴿باطل کے ساتھ﴾ جسے تم گڑھتے ہو ﴿اور مت چھپاؤ حق کو﴾ یعنی حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے اوصاف کو ﴿حالانکہ تم جانتے ہو﴾ کہ وہ حق ہے ﴿اور نماز قائم رکھو اور زکوٰۃ دو اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو﴾ یعنی نماز پڑھو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کے ساتھ۔ اور آنے والی آیت ان یہودی علما کے متعلق نازل ہوئی ہے جو اپنے مسلمان قرابت داروں سے کہتے تھے کہ تم دین محمدی پر قائم رہو کیونکہ وہ دین حق ہے ﴿کیا لوگوں کو بھلائی کا حکم دیتے ہو﴾ یعنی حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر ایمان لانے کا ﴿اور بھلا دیتے

ہو اپنے آپ کو﴾ اپنے نفس کو چھوڑ دیتے ہو کہ اسے اس بھلائی کا حکم نہیں دیتے ﴿حالانکہ تم کتاب پڑھتے ہو﴾ یعنی توریت جس میں قول وعمل کے تضاد پر وعید موجود ہے۔ ﴿تو کیا تم سمجھتے نہیں﴾ اپنے فعل کی برائی کو کہ اس سے باز آ جاؤ، لہٰذا جملہ "تنسون" استفہام انکاری کے محل میں ہے ﴿اور مدد لو﴾ یعنی اپنے معاملات میں مدد طلب کرو ﴿صبر سے﴾ خلاف خواہش امور پر نفس کو روک کر ﴿اور نماز سے﴾ اور نماز کا الگ ذکر تعظیم شان کے لئے ہے۔ اور حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو جب کوئی دشوار امر درپیش ہوتا تو نماز کی طرف سبقت فرماتے، اور بعض حضرات نے فرمایا کہ یہاں خطاب یہود سے ہے جن کو حرص اور حبِ ریاست نے ایمان سے روکے رکھا تو انھیں صبر یعنی روزہ رکھنے کا حکم دیا گیا کیونکہ روزہ شہوت کو توڑتا ہے اور نماز کا حکم دیا گیا کیونکہ وہ عاجزی پیدا کرتی اور تکبر کو دور کرتی ہے۔ ﴿اور بے شک وہ﴾ یعنی نماز ﴿ضرور بھاری ہے مگر عاجزی کرنے والوں پر﴾ یعنی اطاعت سے سکون حاصل کرنے والوں پر ﴿جنھیں یقین ہے کہ انھیں اپنے رب سے ملنا ہے﴾ قبر سے اٹھ کر ﴿اور وہ اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں﴾ آخرت میں پھر وہ انھیں بدلہ دے گا۔

توضیح و تشریح: قوله تخلطوا یہ تلبسوا کا ترجمہ ہے جو بنا ہے لبس سے اور جس کا معنی ہے ملاوٹ کرنا اور یہ وہاں بولا جاتا ہے جہاں ملاوٹ ایسی ہو کہ اصل ونقل کی پہچان ہی ختم ہو جائے جیسے دودھ میں پانی ملانا، چونکہ علمائے یہود کی عادت یہ تھی کہ وہ کتب سماویہ میں کبھی عمداً کسی عقیدہ یا غرض کو ثابت کرنے کے لئے کچھ گھٹا یا بڑھا دیتے تھے اور کبھی شرح کے طور پہ اس میں کچھ لکھ دیتے تھے اس پر لطف یہ کہ متن اور شرح یعنی مزید علیہ اور مزید میں امتیاز کے لئے کوئی علامت اور نشانی بھی نہ رکھتے تھے، اسی طرح جو کتابیں حوادث میں تلف ہو گئی تھیں انہیں کے نام سے اپنے طور پہ کچھ تصنیف کر دیتے تھے اور اس میں بھی قدیم وجدید اور اصل ونقل کی کوئی علامت نہیں رکھتے تھے اس لے یہاں لاتلبسوا فرمایا۔ (تفسیر فتح المنان ملخصاً)

قوله: صلوا مع المصلین الخ اس تفسیر سے حضرت مفسر قدس سرہ کا اشارہ اس طرف ہے کہ یہاں آیت میں رکوع صلوٰۃ کے معنی میں ہے لغوی معنی یعنی محض جھکنا مراد نہیں، چونکہ رکوع نماز کا ایک مستقل رکن ہے اس لئے تسمیة الکل باسم جزئه کے لحاظ سے صلوٰۃ کو رکوع کہہ دیا، اور صلوٰۃ کی جگہ رکوع اس لئے فرمایا کہ بقول بعض یہودیوں کی نماز میں رکوع نہیں تھا لہٰذا یہودیوں سے ارشاد ہوا کہ ایمان لا کر مسلمان نمازیوں کے ساتھ رکوع والی نماز پڑھو۔

قوله محل الاستفهام: یہ اس وہم کا ازالہ ہے کہ آیت مذکورہ سے ثابت ہوتا ہے کہ فاسق کو شرعاً امر بالمعروف کرنے کی اجازت نہیں، حالانکہ ایسا نہیں بلکہ ہر شخص کو حسب استطاعت امر بالمعروف کرنے کا حکم ہے حاصل ازالہ یہ ہے کہ یہاں انکار کا تعلق تنسون انفسکم سے ہے نہ کہ تأمرون الناس سے فلا اعتراض علیه۔

قوله: الحبس للنفس یہ صبر کا معنی مراد ہے یعنی یہاں صبر کا لغوی معنی مراد ہے اور وہ ہے نفس کو اس کی مرغوب و مطلوب چیزوں سے روکنا اور اس میں صبر کی ساری قسمیں داخل ہیں خواہ مصیبت پر صبر ہو یا ترک معاصی پر صبر ہو یا عبادت کی مشقتوں پر صبر ہو، لہٰذا یہاں سے ان علما کا رد بھی ہو گیا جنھوں نے یہاں صبر سے اس کی ایک مخصوص قسم "روزہ" مراد لی ہے وجہ رد ظاہر ہے کہ یہ تخصیص بلا مخصص ہے۔

قولہ: افردھا بالذکر الخ یہ دفع دخل مقدر ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ نماز صبر میں داخل ہے کیونکہ نماز میں مشقت ہے اور اس مشقت کو برداشت کر لینا صبر ہے، پھر نماز کا ذکر الگ سے کیوں فرمایا؟ اس کا جواب مفسر علام نے اپنے قول تعظیما لشانھا کہہ کر دیا یعنی نماز مہتم بالشان ہے کہ متعدد عبادات مثلاً تسبیح وتکبیر، تلاوت، درود، قیام، رکوع، سجود وغیرہ پر مشتمل ہے اس لئے اس کا ذکر علیحدہ ہوا۔

قاضی بیضاوی کا استدلال:

یہاں قاضی بیضاوی نے وارکعوا مع الراکعین سے جماعت کی فرضیت پر استدلال فرمایا ہے جو دو وجہ سے ضعیف ہے اولاً اس لئے کہ ثبوت فرضیت کے لئے دلیل کا احتمال غیر سے خالی ہونا ضروری ہے حالانکہ یہاں و ارکعوا مع الراکعین میں دوسرے معانی کا بھی احتمال ہے یعنی یہاں یہ بھی ممکن ہے کہ رکوع کا لغوی معنی جھکنا مراد ہو اور آیت کا مطلب یہ ہو کہ اے یہودیو! مسلمانوں کی طرح تم بھی سر اطاعت خم کر دو وعلی ہذا اگر اصطلاحی معنی بھی مراد لیا جائے تو یہ مطلب بھی نکل سکتا ہے کہ اے یہودیو! تم ایمان لا کر مسلمانوں کے ساتھ رکوع وسجود والی نماز پڑھو، حاصل یہ کہ یہاں جماعت پر ارکعوا کی دلالت یقینی نہیں یعنی یہ یقین کے ساتھ کہنا ممکن نہیں کہ اس سے جماعت ہی مراد ہے۔ لہٰذا اس سے فرضیت کا ثبوت بھی نہیں ہو سکتا۔

ثانیاً اس لئے بھی کہ اگر اس آیت سے جماعت کی فرضیت ثابت کی جائے تو تکلیف مالا یطاق لازم آئے گا کیونکہ جماعت فرد واحد سے نہیں ہوتی بلکہ اس کے لئے دو یا دو سے زیادہ افراد کی ضرورت پڑتی ہے لہٰذا قدرت علی الجماعۃ دوسروں پر موقوف ہوگئی اور موقوف علی الغیر حقیقتاً قدرت نہیں اور بغیر حقیقی قدرت کے تکلیف، تکلیف مالا یطاق ہے جو کہ باطل محض ہے کیونکہ اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "لا یکلف اللہ نفسا الا وسعھا" اللہ قدرت سے زیادہ کسی جان کو تکلیف نہیں دیتا، لہٰذا وارکعوا مع الراکعین سے جماعت کی فرضیت ثابت کرنا صحیح نہیں، ھذا ما ظھر لی فی ضوء تفاسیر علمائنا العظام و اللہ تعالیٰ اعلم و علمہ اتم۔

﴿یٰبَنِیٓ اِسۡرَآئِیۡلَ اذۡکُرُوۡا نِعۡمَتِیَ الَّتِیٓ اَنۡعَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ﴾ بِالشُّکۡرِ عَلَیۡھَا بِطَاعَتِیۡ ﴿وَاَنِّیۡ فَضَّلۡتُکُمۡ﴾ اَیۡ اٰبَائَکُمۡ ﴿عَلَی الۡعٰلَمِیۡنَ ٥﴾ عَالَمِیۡ زَمَانِھِمۡ ﴿وَ اتَّقُوۡا﴾ خَافُوۡا ﴿یَوۡمًا لَّا تَجۡزِیۡ﴾ فِیۡهِ ﴿نَفۡسٌ عَنۡ نَّفۡسٍ شَیۡـًٔا﴾ ھُوَ یَوۡمُ الۡقِیٰمَةِ ﴿وَ لَا یُقۡبَلُ﴾ بِالتَّاءِ وَالۡیَاءِ ﴿مِنۡھَا شَفَاعَةٌ﴾ اَیۡ لَیۡسَ لَھَا شَفَاعَةٌ فَتُقۡبَلَ فَمَالَنَا مِنۡ شَافِعِیۡنَ ﴿وَ لَا یُؤۡخَذُ مِنۡھَا عَدۡلٌ﴾ فِدَاءٌ ﴿وَلَا ھُمۡ یُنۡصَرُوۡنَ ٥﴾ یُمۡنَعُوۡنَ مِنۡ عَذَابِ اللّٰهِ ﴿وَ﴾ اذۡکُرُوۡا ﴿اِذۡ نَجَّیۡنٰکُمۡ﴾ اَیۡ اٰبَائَکُمۡ وَ الۡخِطَابُ بِهٖ وَ بِمَا بَعۡدَهٗ لِلۡمَوۡجُوۡدِیۡنَ فِیۡ زَمَنِ نَبِیِّنَا صَلَّی اللّٰهُ عَلَیۡهِ وَسَلَّمَ اُخۡبِرُوۡا بِمَا اَنۡعَمَ عَلٰی اٰبَائِھِمۡ تَذۡکِیۡرًا لَّھُمۡ بِنِعۡمَةِ اللّٰهِ لِیُؤۡمِنُوۡا ﴿مِّنۡ اٰلِ فِرۡعَوۡنَ یَسُوۡمُوۡنَکُمۡ﴾ یُذِیۡقُوۡنَکُمۡ ﴿سُوۡٓءَ الۡعَذَابِ﴾ اَشَدَّهٗ وَ الۡجُمۡلَةُ حَالٌ مِّنۡ ضَمِیۡرِ نَجَّیۡنٰکُمۡ ﴿یُذَبِّحُوۡنَ﴾ بَیَانٌ لِّمَا قَبۡلَهٗ ﴿اَبۡنَآئَکُمۡ﴾ الۡمَوۡلُوۡدِیۡنَ ﴿وَ یَسۡتَحۡیُوۡنَ﴾ یَسۡتَبۡقُوۡنَ ﴿نِسَآئَکُمۡ﴾ لِقَوۡلِ

بَعْضِ الْكَهَنَةِ لَهُ اَنَّ مَوْلُوداً يُولَدُ فِى بَنِى اِسْرَائِيلَ يَكُونُ سَبَبًا لِذَهَابِ مُلْكِكَ ﴿وَ فِى ذٰلِكُمْ﴾ الْعَذَابِ اَوِ الْاِنْجَاءِ ﴿بَلَآءٌ﴾ اِبْتِلَاءٌ اَوْ اِنْعَامٌ ﴿مِنْ رَبِّكُمْ عَظِيمٌ٥﴾

ترجمہ: ﴿اے اولاد یعقوب یاد کرو میرا وہ احسان جو میں نے تم پر کیا﴾ میری اطاعت کر کے اس کا شکر بجالاؤ ﴿اور یہ کہ میں نے تمہیں فضیلت دی تھی﴾ تمہارے آباء واجداد کو ﴿سارے جہان والوں پر﴾ ان کے زمانہ کے سارے جہاں والوں پر ﴿اور ڈرو﴾ خوف کرو ﴿اس دن سے جس دن کوئی جان دوسرے کا بدلہ نہ ہو سکے گی﴾ وہ قیامت کا دن ہے ﴿اور نہ قبول کی جائے گی﴾ تا اور یا کے ساتھ یعنی "یقبل" اور "تقبل" دو قرأت ہے ﴿اس کے لئے سفارش﴾ یعنی اس (کافر) کے لئے شفاعت ہے ہی نہیں کہ قبول کی جائے جیسے دوسرے مقام پر ہے: فما لنا من شافعین ﴿اور نہ لیا جائے گا اس سے کوئی معاوضہ﴾ فدیہ ﴿اور نہ ان کی مدد کی جائے گی﴾ کہ اللہ کے عذاب سے انھیں بچا لیا جائے ﴿اور﴾ یاد کرو ﴿جب ہم نے تمہیں نجات بخشی﴾ یعنی تمہارے آباء واجداد کو، اس آیت سے اور مابعد کی آیت سے ان یہودیوں کو خطاب ہے جو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے زمانہ پاک میں موجود تھے ان کے باپ داداؤں پر کئے گئے احسانات کی خبر دی گئی تا کہ اللہ کی نعمتوں کو یاد کر کے ایمان لے آئیں۔ ﴿فرعونیوں سے جو پہنچاتے تھے تمہیں﴾ تمہیں چکھاتے تھے ﴿سخت عذاب﴾ بدتر عذاب اور یہ جملہ (یسومونکم……) نجینکم کی ضمیر سے حال واقع ہے ﴿ذبح کرتے تھے﴾ یہ ماقبل کا بیان ہے ﴿تمہارے بیٹوں کو﴾ نو مولود کو ﴿اور زندہ رہنے دیتے تھے﴾ باقی رکھتے تھے ﴿تمہاری بیٹیوں کو﴾ کیونکہ بعض کاہنوں نے فرعون سے کہا تھا کہ ایک بچہ بنی اسرائیل میں پیدا ہوگا جو تمہاری سلطنت کے زوال کا سبب بنے گا ﴿اور اس میں تمہارے لئے﴾ یعنی مصیبت میں یا نجات میں ﴿بڑی آزمائش تھی﴾ آزمائش یا انعام ﴿تمہارے رب کی جانب سے﴾

توضیح و تشریح: قولہ بالشکر علیھا بطاعتی: اس تفسیری عبارت سے اشارہ اس امر کی طرف ہے کہ آیت میں لفظ اذکروا کا مطلب یہ نہیں کہ تم اللہ کے احسانات اور اس کی نوازشات کو صرف زبانی طور پہ یاد کر لیا کرو اور اپنی بزرگی وفضیلت کی راگ الاپتے پھرو بلکہ مطلب یہ ہے کہ تم محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لا کر اور دین اسلام میں داخل ہو کر عملی طور پہ نعمتوں کا شکر یہ ادا کرو کہ یہی حقیقی یاد ہے۔

خیال رہے کہ اس سے پہلے بھی بنی اسرائیل کو یہ خطاب ہو چکا ہے اور انہیں نعمتوں کی یاد دہانی کرائی گئی ہے مگر وہاں ایفائے عہد وغیرہ کا حکم دیا گیا تھا اور یہاں نصائح اور تقویٰ وطہارت کا ذکر ہے گویا دونوں جگہ خطاب کی نوعیت مختلف ہے اس لئے حقیقتاً تکرار نہیں۔

قولہ: ای آبائکم — اس سے اشارہ اس امر کی طرف ہے کہ آیت میں فضلت کا مفعول بحذف المضاف ہے یعنی بالواسطہ نعمتوں کی یاد دہانی مقصود ہے جو موجودہ بنی اسرائیلوں کے باپ داداؤں پر کی گئیں نہ یہ کہ زمانہ رسالت میں موجود بنی اسرائیلوں کی فضیلت بتانی مقصود ہے کہ انھوں نے تو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی رسالت کا انکار کر کے گویا اپنے ہاتھوں سے اپنی فضیلت کا گلا گھونٹ دیا اور اپنی بزرگی کا جنازہ نکال کر ذلت ومسکنت کی لعنت کا طوق پہن لیا۔

قولہ: عالمی زمانھم یہ دفع دخل مقدر ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ یہاں العالمین پر اگر الُ برائے استغراق حقیقی مانا جائے تو لازم آئے گا کہ بنی اسرائیل اللہ کے ماسوا ساری مخلوق سے افضل ہوں اور یہ معنی کسی طرح درست نہیں کیونکہ ماسوا اللہ میں انبیاء و مرسلین، ملائکہ اور امت محمدیہ سب ہی داخل ہیں جن پر بنی اسرائیل کی فضیلت کا وہم بھی نہیں گزرتا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ عالمین، عالم کی جمع ہے جو مشترک ہے دو معنوں میں حقیقی معنی ہے ماسوا اللہ اور مجازی معنی ہے بڑا گروہ یا ایک زمانہ، اسی طرح استغراق کی دو قسمیں ہیں، حقیقی اور عرفی، استغراق حقیقی یہ ہے کہ مدخول کے تمام افراد مراد ہوں۔ جیسے ان الانسان لفی خسر میں انسان سے تمام افراد انسان مراد ہیں، اور استغراق عرفی یہ ہے کہ مدخول کے وہ افراد شامل ہوں جو عرف میں مراد لئے جاتے ہوں۔ جیسے و اصطفك علی نسآء العالمین میں اس عہد کے افراد مراد ہیں، یہاں آیت میں عالمین اپنے معنی حقیقی میں نہیں بلکہ مجازی معنی میں ہے اسی طرح ال استغراق عرفی کے لئے ہے اب آیت کا مطلب واضح ہو گیا کہ بنی اسرائیل کے آباء و اجداد کو ان کے زمانہ میں سارے عالم پر بزرگی اور فضیلت دی گئی تھی، لہٰذا ان کی فضیلت نہ انبیاء و مرسلین اور ملائکہ پر ثابت ہوئی اور نہ ہی امت محمدیہ پر۔

رہا یہ سوال کہ یہاں عالم کے معنی مجازی اور الُ کے استغراق عرفی کے معنی میں ہونے پر کیا قرینہ ہے؟ تو اس کا جواب بس اس قدر کافی ہے کہ یہاں عالم اور استغراق کا معنی حقیقی پر محمول کرنا روایت و درایت کے خلاف ہے کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے خود اپنے متعلق فرمایا انا سید ولد اٰدم اور امت محمدیہ کی بزرگی واضح کرتے ہوئے اللہ عز و جل نے فرمایا کنتم خیر امة اسی طرح عقل یہ باور نہیں کرتی کہ امتی کا درجہ نبی سے بڑھ جائے، لہٰذا یہی قرینہ ہے عالم کے معنی مجازی اور ال کے استغراق عرفی کے معنی میں ہونے پر۔ واللہ اعلم۔

قولہ: ای لیس لھا شفاعة یہاں نفی شفاعت کی چونکہ دو صورتیں نکلتی تھیں اولاً یہ کہ کفار کے لئے سرے سے شفاعت کا وجود ہی نہ ہو، ثانیاً یہ کہ شفاعت ہو مگر قبول نہ کی جائے، حضرت مفسر نے اپنی تفسیر سے واضح فرمایا کہ یہاں نفی شفاعت کی پہلی صورت ہے یعنی یہ کہ کافروں کے لئے شفاعت ہے ہی نہیں کہ قبولیت کا سوال پیدا ہو۔ اور اگر دوسری صورت مراد لیں تو مطلب یہ ہوگا اگر کافروں کے لئے شفاعت ہو بھی تو قبول نہ کی جائے گی اور یہاں شفاعت نکرہ تحت نفی ہے۔ لہٰذا ہر قسم کی شفاعت کی نفی ثابت ہوگی اسی لئے دوسرے مقام پر ارشاد ہوا فما لنا من شافعین۔

خیال رہے یہاں آیت میں نفس اول سے نفس مومن اور دوسرے سے نفس کافر مراد ہیں۔ لہٰذا آیت کا مطلب یہ ہوا کہ کوئی مومن متقی بھی کسی کافر کی حاجت روائی نہ کر سکے گا در اصل یہاں بنی اسرائیل کے اس دعویٰ کا رد مقصود ہے کہ وہ کہتے تھے قیامت میں ہمارے باپ دادا اور ہماری قوم میں پیدا ہونے والے انبیاء ہمیں اللہ کے عذاب سے بچا لیں گے اس لئے فرمایا کہ اے بنی اسرائیل! تم اس دھوکہ میں نہ رہو کیونکہ آخرت میں کوئی مومن یا کوئی نبی کسی کافر کو سہارا نہ دے گا۔

قولہ: ای آبائکم الخ یہاں بھی اشارہ اس امر کی طرف ہے کہ نجینا کا مفعول بحذف المضاف ہے کیونکہ نجات کا یہ واقعہ موجودہ بنی اسرائیل کے آباء و اجداد کے ساتھ پیش آیا تھا مگر نسبت موجودہ بنی اسرائیل کی طرف اس لئے کر دی گئی کہ

وہ اصول تھے اور یہ فروع لہٰذا اصول کی نجات فروع کی نجات ہے کہ اگر وہ نہ بچتے تو یہ بھی پیدا نہ ہوتے۔ (صاوی)

قوله: بیان لما قبله ـ یعنی یذبحون اپنے ماقبل یسومونکم کا بیان ہے، آگے مفسر علام نے یستحیون کی تفسیر یستبقون سے کرکے اشارہ فرمایا کہ یستحیون کا یہی معنی مراد ہے، کیونکہ "استحیاء" حیاء کرنے کے معنی میں بھی آتا ہے اور اسی معنی میں اس سے پہلے گزر چکا ہے۔

قوله: لقول بعض الكهنة الخ یہ بنی اسرائیل کے بچوں کے قتل کی علت کی طرف اشارہ ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ ایک مرتبہ فرعون نے خواب دیکھا کہ بیت المقدس کی طرف سے آگ آئی جس نے تمام فرعونیوں کو جلا ڈالا مگر اسرائیلوں کو کوئی نقصان نہ پہنچا، اور پھر دیکھا کہ بنی اسرائیل کے محلے سے ایک بڑا اژدہا نکلا جس نے اس کو تخت سے نیچے اتار دیا، اس نے کاہنوں سے خواب کی تعبیر دریافت کی، تو کاہنوں نے بتایا کہ اے فرعون! بنی اسرائیل میں ایک لڑکا پیدا ہوگا جو تیری سلطنت کے زوال کا سبب بنے گا۔ اس کے بعد فرعون نے بنی اسرائیل کے بچوں کو قتل کرنے کا حکم دے دیا۔ (صاوی)

قوله: ابتلاء او انعام ـ چونکہ ذلك کے مشار الیہ میں دو احتمال نکلے گا اس لئے یہاں بھی دو احتمال پیدا ہوئے، اگر ذلك کا مشار الیہ عذاب ہے تو یہاں بلاء آفت کے معنی میں ہے اور اگر مشار الیہ انجاء ہے تو یہاں بلا انعام کے معنی میں ہے جس کی تفسیر مفسر علام نے انعام سے کی ہے کیونکہ جس طرح آزمائش مصیبت پر ہوتی ہے اسی طرح انعامات و احسانات سے بھی ہوتی ہے۔

آخرت کی بھلائیاں صرف مؤمنین کے لئے:

دنیا کے اندر مدد کی چار صورتیں ہوتی ہیں: (۱) جو چیز ملزم کے ذمہ تھی وہی دے کر اسے بچالیا جائے مثلاً حکومت کو ٹیکس نہ دینے کی وجہ سے گرفتار ہوا دوسرا شخص ملزم کی طرف سے ٹیکس دے کر اسے آزاد کرالے، اسے جزاء کہتے ہیں۔ (۲) سفارش کرکے کسی کی مدد کردی جائے، اسے شفاعت کہتے ہیں۔ (۳) جرمانہ دے کر کسی کو مصیبت سے بچالیا جائے، اسے فدیہ کہتے ہیں۔ (۴) اپنی طاقت اور زور سے کسی کی مدد کردی جائے، اسے نصرت کہتے ہیں۔

کفار کے لئے مدد کے مذکورہ چاروں راستے بند کردیئے گئے کہ لا تجزی نفس عن نفس سے مدد کا پہلا راستہ بند کیا گیا لا یقبل منها شفاعة سے شفاعت کفار کی نفی کی گئی، لا یؤخذ منها عدل سے مدد کا تیسرا دروازہ بند کیا گیا اور ولا هم ینصرون سے چوتھے راستے کو بھی بند کردیا گیا۔ گویا کفار کو دنیا ہی میں آخرت کی ساری بھلائیوں سے مایوس کرکے ان پر واضح کردیا گیا کہ آخرت میں ان کی نجات کی کوئی سبیل نہیں۔

مگر نکوکار مسلمانوں کے لئے ایک طرف اللہ عزوجل کا یہ ارشاد ہے، بشر الذین اٰمنوا و عملوا الصلحت ان لهم جنت الاية تو دوسری جانب امت کے گنہگاروں کے لئے خود مختار کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا یہ امید افزا فرمان ہے شفاعتی لاهل الكبائر من امتی "میری شفاعت میری امت کے بڑے گنہگاروں کے لئے ہے" اس سے واضح ہوا کہ

نیک مسلمان جنت میں تو جائیں گے ہی گنہگار مسلمانوں کے لئے آخرت میں مدد اور غم خواری کے سارے دروازے کھلے ہوں گے اور اللہ تعالیٰ ان کی بھی بخشش فرمائے گا، لہٰذا ثابت ہوا کہ آخرت کی ساری بھلائیاں صرف مسلمانوں کے لئے ہیں۔

غیر مقلدین کو "شرّ امّۃ" کا تمغہ:

غیر مقلد عالم مولوی محمد جونا گڑھی کے ترجمۂ قرآن پر غیر مقلد مولوی صلاح الدین یوسف کا حاشیہ ہے، جسے شاہ فہد کی جانب سے سعودیہ کے کسی نشریاتی ادارہ نے شائع کیا ہے، صلاح الدین یوسف نے بنی اسرائیل سے امت محمدیہ کا موازنہ کیا ہے اور پھر لکھا کہ "امت محمدیہ کی اکثریت بھی اس وقت اپنی بدعملیوں اور شرک و بدعات کے ارتکاب کی وجہ سے "خیر امة" کے بجائے "شرّ امة" بنی ہوئی ہے۔ ھداھا اللہ تعالی.

اگر مولوی صلاح الدین یوسف "امت محمدیہ کی اکثریت" کی جگہ دنیائے وہابیت و دیوبندیت لکھ دیتے تو بات سو فی صد درست ہوتی مگر انھوں نے مطلق امت محمدیہ کہہ کر خوش عقیدہ مسلمانوں پر بہتان تراشی کا الزام اپنے سر لے لیا۔

آپ دیکھیں تو سہی ربط محبت کیا ہے
اپنا افسانہ ملا کر مرے افسانے سے

الحمد للہ اہلسنّت و جماعت روز اول سے خیر امت ہیں اور تا قیام قیامت خیر امت ہی رہیں گے کیونکہ ان کے سر پر فضیلت و کرامت کا یہ تاج اللہ رب العزت نے رکھا ہے جسے کوئی اتار نہیں سکتا، لہٰذا "شرّ امة" کا تمغہ دیابنہ اور غیر مقلدین کو مبارک ہو۔

فرعون اور حضرت موسیٰ علیہ السلام:

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دور میں جو فرعون تھا اس کا اصلی نام ولید بن مصعب تھا یہ شہر اصفہان کا ایک غریب عطار تھا جب اس پر بہت قرض ہو گیا تو اصفہان سے بھاگ کر ملک شام پہنچا لیکن وہاں کوئی ذریعۂ معاش ہاتھ نہیں آیا تو تلاش رزق کے لئے مصر آ گیا یہاں اس نے دیکھا کہ گاؤں میں تربوز بہت سستے بکتے ہیں اور شہر میں مہنگے دل میں سوچا کہ یہ نفع بخش تجارت ہے اور پھر اس نے گاؤں سے بہت سارے تربوز خریدے مگر جب شہر کی طرف چلا تو راستے میں محصول لینے والوں نے اس سے کئی جگہ محصول لیا بازار آتے آتے اس کے پاس صرف ایک تربوز بچا باقی سب محصول میں چلے گئے، یہ سمجھ گیا کہ اس ملک میں کوئی شاہی انتظام نہیں جو چاہے حاکم بن کر مال حاصل کرے۔

اس وقت مصر میں کوئی وبائی بیماری پھیلی ہوئی تھی اور لوگ بہت مر رہے تھے، یہ ایک قبرستان میں بیٹھ گیا اور کہا کہ میں شاہی افسر ہوں مرنے والوں پر ٹیکس لگا ہے فی مردہ مجھے پانچ درہم دو پھر دفن کرو، اس بہانے سے چند دنوں میں اس نے بہت مال جمع کر لیا اتفاقاً ایک دن کوئی بڑا آدمی دفن کے لئے لایا گیا، اس نے اس کے وارثوں سے بھی روپے مانگے انھوں نے اسے

گرفتار کر کے بادشاہ تک پہنچا دیا اور سارا واقعہ بادشاہ کو بتایا، بادشاہ نے اس سے پوچھا کہ تجھے کس نے اس جگہ مقرر کیا ہے؟ ولید بولا کہ میں نے آپ تک پہنچنے کا یہ بہانہ بنایا ہے۔ میں آپ کو خبر کئے دیتا ہوں کہ آپ کے ملک میں بڑی بدامنی ہے میں نے تھوڑے عرصہ میں ظلماً اس قدر مال اکٹھا کر لیا ہے تو دوسرے حکام کیا کچھ نہ کرتے ہوں گے یہ کہہ کر وہ سارا مال بادشاہ کے سامنے ڈال دیا اور کہا کہ اگر آپ انتظام میرے سپرد کر دیں تو میں آپ کے ملک کا انتظام درست کر دوں، بادشاہ کو یہ بات پسند آئی اور اس نے ولید کو کوئی معمولی عہدہ دے دیا پھر رفتہ رفتہ یہ تمام لشکر کا افسر بنا دیا گیا اور ملک کا نظام اچھا ہو گیا اور چونکہ اس نے رعایا اور امرائے سلطنت کو خوش رکھا تھا اس لئے جب بادشاہ مصر مرا تو لوگوں نے ولید کو تخت پر بٹھا دیا۔

فرعون نے تخت پر بیٹھتے ہی اعلان عام کیا کہ لوگ مجھے سجدہ کیا کریں سب سے پہلے اس کے وزیر ہامان نے سجدہ کیا پھر دوسرے امراء اور رعایا نے یہاں تک کہ تمام اہل مصر فرعون کی پرستش میں گرفتار ہو گئے، بنی اسرائیل جو اگرچہ مصر میں اقلیت میں تھے مگر انھوں نے فرعون کو سجدہ کرنے سے انکار کر دیا جس کے سبب فرعون نے ان پر بے پناہ سختی کی اور انھیں اپنی قوم کا غلام بنا دیا اسی درمیان فرعون نے وہ خواب دیکھا جو توضیح و تشریح کے ضمن میں گزرا جس کے بعد فرعون نے بنی اسرائیل کے بچوں کو قتل کرنے کا حکم دے دیا اور چند سالوں میں بارہ ہزار اور ایک روایت کے مطابق ستر ہزار بچے قتل کرا دیئے اور نوے ہزار حمل گروا دیئے، اسی دوران بنی اسرائیل کے بوڑھے بھی جلدی جلدی مرنے لگے تب قبطیوں یعنی فرعون کی قوم کے با اثر افراد نے درخواست کی کہ اگر یہی حال رہا تو بنی اسرائیل سب کے سب فنا ہو جائیں گے پھر ہمیں غلام کہاں سے ملیں گے؟ یہ سن کر فرعون نے حکم دیا کہ ایک سال بچوں کو قتل کر دیا جائے اور ایک سال چھوڑ دیا جائے رب کی شان چھوڑنے کے سال میں حضرت ہارون علیہ السلام پیدا ہوئے اور قتل کے سال حضرت موسیٰ علیہ السلام۔

لاوی بن یعقوب علیہ السلام کی اولاد میں اس وقت حضرت عمران اپنی قوم بنی اسرائیل کے سردار تھے ان کی بیوی کا نام حضرت عایذ تھا حضرت ہارون اور حضرت موسیٰ علیہما السلام انھیں کے فرزند ہیں حضرت ہارون علیہ السلام تین سال کے بڑے تھے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بچپن کا واقعہ یہ ہے کہ جب آپ کی پیدائش ہوئی تو فرعون کی طرف سے مقرر کردہ دائی آپ پر عاشق ہو گئی اور پھر آپ کو بچانے کی یہ تدبیر نکالی کہ ایک بکری کا ذبح کیا ہوا بچہ ہانڈی میں ڈال کر دروازہ پر موجود پہرے دار سپاہیوں کے پاس لے گئی اور کہا کہ اس گھر میں بچہ پیدا ہوا تھا جسے میں نے ذبح کر دیا ہے اور اسے دفن کرنے کیلئے جنگل میں لے جا رہی ہوں، سپاہیوں نے اس پر اعتبار کر لیا اور کوئی زائد تحقیق نہ کی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے گھر پرورش پاتے رہے، مگر نجومیوں نے فرعون کو خبر دی کہ بنی اسرائیل میں وہ بچہ پیدا ہو چکا ہے۔ فرعون اس خبر سے پریشان ہو گیا اور کوتوال کو سخت تنبیہ کی اور کوتوال نے سپاہیوں پر سختی کی تو انھوں نے کہا کہ ہم نے ان کے سارے بچوں کو قتل کر دیا ہے مگر عمران کے لڑکے کو اپنے ہاتھ سے نہ مارا کوتوال نے حضرت عمران کے گھر کی تلاشی لینے کا حکم دیا سپاہی حضرت عمران کے گھر میں گھس آئے اس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی بڑی بہن مریم کی گود میں تھے۔ مریم نے سپاہیوں کو دیکھتے ہی حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جلتے ہوئے تنور میں ڈال دیا، سپاہیوں نے گھر کی تلاشی لی اور کچھ نہ پا کر

واپس لوٹ گئے پھر دیکھا گیا تو تنور سے آگ کے شعلے نکل رہے تھے مگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کوئی تکلیف نہ پہنچی۔

اب آپ کی عمر چالیس دن کی ہو چکی تھی والدہ کے دل میں خیال آیا کہ فرزند کی زندگی خطرے میں ہے اس لئے ان کو دریائے نیل میں بہا دینا بہتر ہے شاید کوئی دوسرا شخص ان کو اٹھا کر لے جائے اور پرورش کرے چنانچہ گھر کے لوگوں نے مشورہ کر کے محلّہ کے ایک بڑھئی سے لکڑی کا صندوقچہ بنوایا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس میں رکھ کر دریائے نیل کے سپرد کر دیا خدا کی شان کہ دریائے نیل سے ایک نہر نکال کر فرعون کے باغ میں پہنچائی گئی تھی جس کا نام عین الشمس تھا یہ صندوقچہ اس نہر میں داخل ہو کر فرعون کے باغ میں پہنچا، اس وقت فرعون اپنی بیوی آسیہ اور دیگر خدام کے ساتھ باغ کی سیر کر رہا تھا، خدام نے وہ صندوقچہ دیکھا تو اٹھا کر لے آئے کھولا گیا تو اس میں ایک حسین وجمیل بچہ تھا فرعون نے کہا کہ یہ وہی بچہ ہے جس کی نجومیوں نے خبر دی ہے لہٰذا اسے ابھی قتل کر دیا جائے مگر اس کی بیوی حضرت آسیہ نے کسی طرح اس کو سمجھا لیا اور ان کی پرورش میں لگ گئیں اور دودھ پلانے کے لئے آپ کی والدہ کو ہی لایا گیا جن کی ایک اشرفی روزانہ اجرت مقرر ہوئی آپ کی پرورش ہوتی رہی اور جب آپ تقریباً جوان ہو گئے تب آپ کا میلان قلبی بنی اسرائیل کی طرف ہو گیا۔

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی عمر ۳۰ رسال کی ہوئی تو ایک دن ایک قبطی اور اسرائیلی میں جھگڑا ہو رہا تھا، آپ نے قبطی کو زیادتی کرنے سے منع کیا وہ باز نہ آیا تو آپ نے ایک گھونسا مارا جس سے قبطی مر گیا، راز فاش ہونے پر قبطیوں نے قصاص کا مطالبہ کیا اور فرعون اس مطالبہ پر غور کرنے لگا جب آپ کو اس کی خبر ہوئی تو آپ مدین کی طرف چلے گئے اور وہاں حضرت شعیب علیہ السلام کے گھر ٹھہر گئے اور ان کی بیٹی صفورا سے نکاح کیا، دس سال مدین میں رہ کر دوبارہ مصر تشریف لائے۔

(تفسیر نعیمی وعزیزی)

وَ اذْكُرُوْا ﴿اِذْ فَرَقْنَا﴾ فَلَقْنَا ﴿بِكُمُ﴾ بِسَبَبِكُمُ ﴿الْبَحْرَ﴾ حَتّٰى دَخَلْتُمُوْهُ هَارِبِيْنَ مِنْ عَدُوِّكُمْ ﴿فَاَنْجَيْنٰكُمْ﴾ مِنَ الْغَرَقِ ﴿وَ اَغْرَقْنَا اٰلَ فِرْعَوْنَ﴾ قَوْمَهٗ مَعَهٗ ﴿وَ اَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ﴾ اِلَى انْطِبَاقِ الْبَحْرِ عَلَيْهِمْ ﴿وَ اِذْ وٰعَدْنَا﴾ بِاَلْفٍ وَ دُوْنِهَا ﴿مُوْسٰى اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً﴾ نُعْطِيْهِ عِنْدَ اِنْقِضَائِهَا التَّوْرٰةَ لِتَعْمَلُوْا بِهَا ﴿ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ﴾ اَلَّذِىْ صَاغَهٗ لَكُمُ السَّامِرِىُّ اِلٰهًا ﴿مِنْۢ بَعْدِهٖ﴾ اَىْ بَعْدَ ذِهَابِهٖ اِلٰى مِيْعَادِنَا ﴿وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ۝﴾ بِاتِّخَاذِهٖ لِوَضْعِكُمُ الْعِبَادَةَ فِىْ غَيْرِ مَحَلِّهَا ﴿ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ﴾ مَحَوْنَا ذُنُوْبَكُمْ ﴿مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ﴾ الْاِتِّخَاذِ ﴿لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝﴾ نِعْمَتَنَا عَلَيْكُمْ ﴿وَ اِذْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ﴾ اَلتَّوْرٰةَ ﴿وَ الْفُرْقَانَ﴾ عَطْفُ تَفْسِيْرٍ اَىِ الْفَارِقُ بَيْنَ الْحَقِّ وَ الْبَاطِلِ وَ الْحَلَالِ وَ الْحَرَامِ ﴿لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۝﴾ بِهٖ مِنَ الضَّلَالِ ﴿وَ اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ﴾ اَلَّذِيْنَ عَبَدُوا الْعِجْلَ ﴿يٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ﴾ اِلٰهًا ﴿فَتُوْبُوْٓا اِلٰى بَارِئِكُمْ﴾ خَالِقِكُمْ مِنْ عِبَادَتِهٖ ﴿فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ﴾ اَىْ لِيَقْتُلِ الْبَرِىُّ مِنْكُمُ الْمُجْرِمَ ﴿ذٰلِكُمْ﴾ اَلْقَتْلُ ﴿خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِئِكُمْ﴾ فَوَفَّقَكُمْ لِفِعْلِ ذٰلِكَ وَ اَرْسَلَ عَلَيْكُمْ سَحَابَةً سَوْدَاءَ لِئَلَّا يُبْصِرَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا فَيَرْحَمَهٗ حَتّٰى قُتِلَ مِنْكُمْ نَحْوُ سَبْعِيْنَ اَلْفًا ﴿فَتَابَ عَلَيْكُمْ﴾ قَبِلَ تَوْبَتَكُمْ

﴿اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ ۝ وَ اِذْ قُلْتُمْ﴾ وَ قَدْ خَرَجْتُمْ مَعَ مُوْسٰی لِتَعْتَذِرُوْا اِلَی اللّٰهِ مِنْ عِبَادَةِ الْعِجْلِ وَ سَمِعْتُمْ کَلَامَهٗ ﴿یٰمُوْسٰی لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰی نَرَی اللّٰهَ جَهْرَةً﴾ عِیَانًا ﴿فَاَخَذَتْکُمُ الصّٰعِقَةُ﴾ اَلصَّیْحَةُ فَمُتُّمْ ﴿وَ اَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ۝﴾ مَاحَلَّ بِکُمْ ﴿ثُمَّ بَعَثْنٰکُمْ﴾ اَحْیَیْنَاکُمْ ﴿مِّنْ بَعْدِ مَوْتِکُمْ لَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ ۝﴾ نِعْمَتَنَا بِذٰلِكَ ﴿وَ ظَلَّلْنَا عَلَیْکُمُ الْغَمَامَ﴾ سَتَرْنَاکُمْ بِالسَّحَابِ الرَّقِیْقِ مِنْ حَرِّ الشَّمْسِ فِی التِّیْهِ ﴿وَ اَنْزَلْنَا عَلَیْکُمْ﴾ فِیْهِ ﴿الْمَنَّ وَ السَّلْوٰی﴾ هُمَا التُّرَنْجَبِیْنُ وَ الطَّیْرُ السُّمَّانٰی بِتَخْفِیْفِ الْمِیْمِ وَ الْقَصْرِ وَ قُلْنَا ﴿کُلُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰکُمْ﴾ وَلَا تَدَّخِرُوْا فَکَفَرُوا النِّعْمَةَ وَ ادَّخَرُوْا فَقُطِعَ مِنْهُمْ ﴿وَ مَا ظَلَمُوْنَا﴾ بِذٰلِكَ ﴿وَ لٰکِنْ کَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ یَظْلِمُوْنَ ۝﴾ لِاَنَّ وَبَالَهٗ عَلَیْهِمْ.

ترجمہ: اور یاد کرو ﴿جب پھاڑ دیا ہم نے تمہارے لئے﴾ تمہاری وجہ سے ﴿سمندر کو﴾ یہاں تک کہ تم اس میں داخل ہو گئے اپنے دشمن کے خوف سے بھاگ کر ﴿تو ہم نے بچالیا تم کو﴾ ڈوبنے سے ﴿اور ڈبو دیا فرعونیوں کو﴾ اور اس کے ساتھ اس کی قوم کو ﴿اور تم دیکھ رہے تھے﴾ سمندر کا ان پر مل جانا ﴿اور جب ہم نے وعدہ فرمایا﴾ واعدنا میں دوسری قرأت بغیر الف (وَعَدْنَا) ہے ﴿موسیٰ سے چالیس رات کا﴾ کہ ہم انھیں اس مدت کے ختم ہونے پر توریت عطا کریں گے تاکہ تم اس پر عمل کرو ﴿پھر تم نے بچھڑے کی پوجا شروع کر دی﴾ جسے تمہارے لئے سامری نے بطور معبود ڈھالا تھا ﴿اس کے بعد﴾ یعنی ہماری متعینہ میقات کی جانب ان کے چلے جانے کے بعد ﴿اور تم ظالم تھے﴾ اسے معبود بنا کر کہ عبادت کو غیر محل میں صرف کیا ﴿پھر بھی ہم نے تم سے درگزر فرمایا﴾ تمہارے گناہوں کو مٹا دیا ﴿اس ظلم کے بعد کہ کہیں تم احسان مانو﴾ ہماری ان نعمتوں کا جو تم پر ہیں ﴿اور جب ہم نے موسیٰ کو کتاب عطا کی﴾ توریت ﴿اور حق و باطل میں تمیز کی قوت﴾ فرقان پر کتاب کا عطف تفسیری ہے یعنی حق و باطل اور حلال و حرام کے درمیان فرق کرنے والی کتاب ﴿کہ کہیں تم راہ پر آؤ﴾ اس کے ذریعہ، گمراہی سے نکل کر ﴿اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا﴾ جنھوں نے بچھڑے کو پوجا تھا ﴿اے میری قوم تم نے بچھڑا کو (معبود) بنا کر اپنی جانوں پر ظلم کیا تو اپنے خالق کی طرف رجوع لاؤ﴾ اپنے خالق کی عبادت کر کے ﴿تو آپس میں ایک دوسرے کو قتل کرو﴾ یعنی تم میں سے بری رہنے والا جرم کرنے والے کو قتل کرے ﴿یہ (قتل) تمہارے خالق کے نزدیک تمہارے لئے بہتر ہے﴾ تو اللہ تعالیٰ نے تمہیں ایسا کرنے کی توفیق دی، اور تم پر بھیج دیا ایک سیاہ بادل، تاکہ تم ایک دوسرے کو دیکھ کر رحم نہ کھا سکو، یہاں تک کہ تم میں سے ستر ہزار قتل کر دیئے گئے ﴿پھر اللہ تعالیٰ نے تم پر توجہ فرمائی﴾ یعنی تمہاری توبہ قبول کی ﴿بے شک وہی ہے بہت توبہ قبول فرمانے والا مہربان﴾ ﴿اور جب تم نے کہا﴾ جس وقت کہ تم موسیٰ کے ہمراہ نکلے تھے۔ خدا کی بارگاہ میں بچھڑا پوجنے کی معذرت کرنے اور تم نے کلام الٰہی سنا تھا ﴿اے موسیٰ! ہم ہرگز تمہارا یقین نہ لائیں گے جب تک علانیہ خدا کو نہ دیکھ لیں تو تمہیں کڑک نے آلیا﴾ بجلی آئی اور تم مر گئے ﴿اور تم دیکھ رہے تھے﴾ جو تمہیں درپیش ہوا ﴿پھر ہم نے تمہیں زندہ کیا تمہارے مرنے کے بعد کہ کہیں تم احسان مانو﴾ ہماری اس نعمت کا ﴿اور ہم نے بادل کو تمہارا سائبان کیا﴾ تم پر ہلکے بادل کا شامیانہ لگا دیا تاکہ میدان تیہ میں سورج کی گرمی سے بچے رہو ﴿اور ہم نے اتارا تم پر﴾ اس میدان میں ﴿من و

سلوٰی ﴾ ترنجبین اور بٹیریں، سمانی میم مخفف اور الف مقصورہ کے ساتھ ہے اور ہم نے کہا ﴿ کھاؤ ہماری دی ہوئی ستھری چیزیں ﴾ اور ذخیرہ نہ کرنا، مگر انھوں نے ذخیرہ کر کے ناشکری کی تو نعمتوں کو ان سے منقطع کر دیا گیا ﴿ اور انھوں نے ہم پر کوئی زیادتی نہیں کی ﴾ حکم عدولی کر کے ﴿ بلکہ وہ اپنی ہی جانوں پر زیادتی کرتے رہتے تھے ﴾ کہ نافرمانی کا وبال انھیں پر پڑتا تھا۔

توضیح و تشریح: قوله: قومه معه — اس تقدیری عبارت کا حاصل یہ ہے کہ لفظ آل مشترک ہے دو معنوں میں لغوی معنی ہے [گھر والے] جنھیں عرف میں کنبہ یا خاندان کہتے ہیں، اور اصطلاحی معنی ہے پیروکار حضرت مفسر نے اشارہ فرمایا ہے کہ یہاں آیت میں لفظ آل کا مجازی معنی مراد ہے اور ''معہ'' کا اضافہ کر کے یہ افادہ کیا کہ اس میں فرعون اور فرعونی سب داخل ہیں، جیسے و لقد کرمنا بنی آدم میں لفظ بنی آدم سے آدم اور آدمی دونوں مراد ہیں۔

خیال رہے لفظ آل اور اہل ہم معنی ہیں یعنی دونوں کا معنی ہے [گھر کے لوگ] مگر چند طرح سے دونوں میں فرق ہے اولاً یہ کہ آل کا اطلاق معززین پر ہوتا ہے خواہ ان کو اعزاز دینی اور دنیوی دونوں حاصل ہو یا صرف ایک جیسے آل نبی و آل فرعون مگر اہل کا اطلاق عام ہے یعنی معزز اور غیر معزز سب کی طرف منسوب ہوتا ہے۔ ثانیاً یہ کہ آل صرف ذوی العقول کی طرف منسوب ہوتا ہے جب کہ اہل عام ہے ذوی العقول اور غیر ذوی العقول سب کی طرف منسوب ہوتا ہے لہٰذا اہل مصر و اہل مکہ کہنا درست ہے مگر آل مصر اور آل مکہ کہنا درست نہیں۔ ثالثاً یہ کہ آل صرف معرفہ کی طرف منسوب ہوتا ہے اور اہل معرفہ و نکرہ دونوں کی طرف منسوب ہوتا ہے لہٰذا اہل زبان کہنا درست ہے مگر آل زبان کہنا درست نہیں۔

قوله: بالف و دونها اس سے واعدنا — کی دو قراٰتوں کی طرف اشارہ ہے اور فائدہ اس کا یہ ہے کہ اگر الف کے ساتھ پڑھا جائے تو یہ باب مفاعلت سے ہے اور اس میں مفاعلت کی خاصیت [اشتراک] ہے۔ لہٰذا معنی یہ ہوگا کہ وعدہ دونوں طرف سے ہوا، اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو توریت دینے کا وعدہ فرمایا اور موسیٰ علیہ السلام نے کوہ طور پر حاضر ہونے کا وعدہ کیا۔ اور اگر وعدنا مجرد ہے تو وعدہ صرف ایک طرف سے مراد ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے۔

خیال رہے کہ موسیٰ عبرانی لفظ ہے جو مو اور شیٰ سے مرکب ہے عبرانی زبان میں مو پانی کو اور شیٰ درخت کو کہتے ہیں، چونکہ آپ نہر میں پائے گئے تھے اور لکڑی کے صندوقچے میں بند تھے اس لئے حضرت آسیہ نے آپ کا نام موشیٰ رکھا یعنی درخت اور پانی سے پایا ہوا فرزند، پھر عربی میں آ کر شین سین سے بدل کر موسیٰ ہو گیا، آپ کا نسب شریف یہ ہے، موسیٰ بن عمران بن یصیر بن ناہت بن لاوی بن یعقوب بن اسحٰق بن ابراہیم علیہم السلام (تفسیر نعیمی)

قوله: نعطیه عند انقضائها الخ یہ ایک دوسرے واقعہ کی طرف اشارہ ہے جس کی قدرے تفصیل یہ ہے کہ جب بنی اسرائیل کو قبطیوں کی غلامی سے نجات ملی اور وہ آزادی کی نعمت سے سرفراز کئے گئے تو حکمت الٰہی کا تقاضا ہوا کہ انھیں ایک کتاب عطا کی جائے جس پر عمل پیرا ہو کر بنی اسرائیل بے راہروی سے بچتے رہیں اور خود حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی بنی اسرائیل کے لئے ایک کتاب کی اللہ تعالیٰ سے درخواست کی، اللہ تعالیٰ نے عطائے توریت کا وعدہ فرمایا اور اس کے لئے میقات کو معین فرمایا جس کی مدت مع اضافہ چالیس روز تھی، پورا ایک مہینہ ذو القعدہ اور دس دن ذو الحجہ کے حضرت موسیٰ علیہ

السلام قوم میں اپنے بھائی ہارون علیہ السلام کو اپنا خلیفہ وجانشین بنا کر توریت حاصل کرنے کے لئے کوہ طور پر تشریف لے گئے چالیس شب وہاں ٹھہرے اور اس عرصہ میں کسی سے بات نہ کی صرف ریاضت میں مصروف رہے، مدت پوری ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ نے زبرجدی الواح میں توریت آپ پر نازل فرمائی، جسے آپ لے کر قوم کے پاس آئے۔ (تفسیر خزائن العرفان)

خیال رہے یہاں آیت میں اربعین لیلۃ سے میعاد کی پوری مدت بیان کی گئی ہے اور سورۂ اعراف میں ہے و واعدنا موسیٰ ثلثین لیلۃ جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ میعاد کی مدت تیس رات تھی۔ اس اشکال کا حل یہ ہے کہ اولاً تیس دن کوہ طور پہ رہنے کا حکم ملا تھا لیکن جب حضرت موسیٰ علیہ السلام یہ میعاد پوری کر چکے اور تیس دن روزہ رکھ چکے تو اس خیال سے کہ میں نے بہت روز سے مسواک نہیں کی ہے شاید منہ میں بو ہو لہذا مسواک کرلی اور توریت لینے کے لئے بارگاہ الٰہی میں حاضر ہوئے حکم الٰہی آیا کہ اے موسیٰ! تم نے منہ سے وہ خوشبو دور کردی جو ہم کو مشک سے زیادہ پیاری تھی لہٰذا دس روزہ اور رکھو تاکہ تمہارے منہ میں پھر وہی خوشبو پیدا ہو جائے، حضرت موسیٰ علیہ السلام دس دن اور ٹھہرے یہ دونوں مدتیں چالیس بنیں، لہٰذا سورۂ اعراف میں اصل مدت کا ذکر ہے اور یہاں اضافہ شدہ مدت کا۔ (صاوی ملخصاً)

قولہ: الذی صاغہ الخ اس عبارت سے اشارہ فرمایا کہ العجل پر آلِ عہد خارجی کا ہے، اس سے مراد وہ بچھڑا ہے جسے موسیٰ سامری نے بنی اسرائیل کے لئے ڈھالا تھا اس کا واقعہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو چونکہ اولاً تیس دن ہی کوہ طور پر رہنے کا حکم ہوا تھا اس لئے آپ نے کوہ طور پہ جاتے وقت بنی اسرائیل سے تیس رات کا وعدہ کیا تھا، پھر دس رات وہاں اور رہنا پڑا تو بنی اسرائیل میں کھلبلی مچ گئی اور موسیٰ علیہ السلام کے وصال کی خبر مشہور ہو گئی۔ ادھر موسیٰ بن ظفر سامری نے جو بنی اسرائیل کے ایک قبیلہ بنی سامرہ سے تعلق رکھتا تھا اور حرامی تھا جو منافقت سے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لایا تھا بنی اسرائیل سے زیورات لے کر ایک بچھڑا بنایا۔ اس کے پاس حضرت جبرئیل علیہ السلام کی گھوڑی کے ٹاپوں کے نیچے کی مٹی موجود تھی جسے اس نے فرعونیوں کے غرق ہونے کے وقت اٹھائی تھی یہ مٹی اس نے بچھڑے کے اندر ڈال دی چونکہ اس مٹی میں تاثیر حیات تھی اس لئے بچھڑا بولنے اور حرکت کرنے لگا، بچھڑے کی آواز سنا کر سامری نے بنی اسرائیل سے کہا ھذا الٰھکم و الٰہ موسیٰ فنسی (طٰہٰ) یہ تمہارا اور موسیٰ کا خدا ہے مگر موسیٰ بھول کر خدا کو تلاش کرنے گئے۔ بنی اسرائیل سامری کے بہکاوے میں آگئے کیونکہ وہ پہلے ہی سے بت پرستی کا شوق رکھتے تھے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہہ چکے تھے یا موسیٰ اجعل لنا الٰھاً کما لھم الھۃ (اعراف) اے موسیٰ ہمارے لئے بھی کوئی معبود بنادو جس طرح بت پرستوں کے معبود ہیں۔ مگر موسیٰ علیہ السلام نے اس فرمائش پر سخت برہمی کا اظہار کیا تھا۔ اب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی غیر حاضری میں بنی اسرائیل سامری کے فریب کا شکار ہو گئے اور سوائے حضرت ہارون علیہ السلام اور ان کے بارہ ہزار ساتھیوں کے باقی سبھی اسرائیلی بچھڑے کی پرستش میں لگ گئے۔ جب حضرت ہارون علیہ السلام نے انھیں اس فعل سے منع کیا تو انھوں نے انکار کرتے ہوئے کہا لن نبرح علیہ عاکفین حتی یرجع الینا موسیٰ (طٰہٰ) ہم ہمیشہ اس کی عبادت کرتے رہیں گے جب تک موسیٰ ہمارے پاس لوٹ نہ آئیں۔ (تفسیر عزیزی وتفسیر فتح المنان)

قولہ: لوضعکم العبادۃ الخ. یہ ظلم کی علت کا بیان ہے چونکہ ظلم نام ہے وضع الشئ الی غیر محلہ کا تو عبادت جو محض خالق حقیقی کے لئے ہونی چاہئے اسرائیلوں نے بچھڑے کے لئے روا رکھی اور اس کا وبال انھیں کے سر آیا اس لئے بچھڑے کی پرستش کر کے اسرائیلوں نے گویا اپنی ہی جانوں پر ظلم کیا۔

قولہ: ای لیقتل البرئ منکم المجرم. یہ کیفیت توبہ کا بیان ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کوہ طور سے توریت لے کر واپس اپنی قوم میں تشریف لائے اور قوم کو شرک میں مبتلا دیکھا تو سخت ناراض ہوئے قوم سے باز پرس فرمائی تو قوم نے سارا الزام سامری پر ڈال دیا اور سامری سے پوچھا تو اس نے کہا کہ میرے دل میں کچھ ایسا ہی آ گیا، لہٰذا آپ نے سامری کے حق میں بد دعا فرمائی اور بچھڑے کو جلا کر اس کی راکھ دریا میں ڈال دی اور قوم کو توبہ کا حکم سنایا جس کی صورت یہ تھی کہ جنھوں نے بچھڑے کی پرستش نہیں کی ہے وہ پرستش کرنے والوں کو قتل کریں اور مجرم برضا وتسلیم سکون کے ساتھ قتل ہو جائیں۔

بنی اسرائیل توبہ کی اس صورت پر راضی ہو گئے، اللہ تعالیٰ نے ان پر ایک سیاہ بادل بھیجا تا کہ قتل کرنے والے مجرمین کو دیکھ کر رحم نہ کھائیں اس بادل نے پورے میدان کو گھیر لیا، صبح سے شام تک ستر ہزار اسرائیلی قتل ہو گئے۔ تب حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام نے رو کر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں رحم کی درخواست کی جو قبول ہوئی اور وحی آئی کہ جو قتل ہو چکے وہ شہید ہوئے باقی بخشے گئے۔ (صاوی، خزائن العرفان)

قولہ: و قد خرجتم مع موسیٰ الخ یہ بنی اسرائیل سے متعلق ایک دوسرے واقعہ کی طرف اشارہ ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کی توبہ قبول فرمائی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ وہ بنی اسرائیل میں سے ستر ایسے افراد کو جنھوں نے بچھڑے کی پرستش نہ کی ہو ہمراہ لے کر کوہ طور پر آئیں اور جن لوگوں نے بچھڑے کی پرستش کی تھی ان کے لئے دعائے استغفار کریں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل سے ستر افراد کو لیا اور کوہ طور پہ گئے اور رب سے ہم کلام ہوئے جسے اسرائیلیوں نے بھی سنا، مروی ہے اللہ تعالیٰ نے اسرائیلیوں سے فرمایا کہ "بے شک میں ہی معبود ہوں، میرے سوا کوئی معبود نہیں، میں نے ہی تمہیں مصر سے نکال کر پریشانیوں سے نجات دی تو میری ہی عبادت کرو میرے سوا کسی اور کو مستحق عبادت نہ سمجھو"

مگر اسرائیلیوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ کیا خبر یہ خدا ہی کا کلام تھا جسے ہم نے سنا، ہم تو جب تک خدا کو علانیہ نہیں دیکھ لیں گے آپ پر یقین نہیں کریں گے، اس پر آسمان سے ایک ہولناک آواز آئی جس کی ہیبت سے وہ مر گئے۔ موسیٰ علیہ السلام نے بارگاہ خداوندی میں گریہ وزاری کی، کہ میں بنی اسرائیل کو کیا جواب دوں گا وہ تو کہیں گے کہ تم نے ستر ہزار آدمی تو یہاں قتل کرا دیئے اور ستر آدمی باہر لے جا کر نہ معلوم کس طرح ہلاک کر دیئے، اس پر اللہ تعالیٰ نے انہیں یکے بعد دیگرے زندہ فرما دیا۔ (صاوی، تفسیر فتح المنان)

قولہ: سترناکم بالسحاب الرقیق الخ یہاں سے بنی اسرائیل پر کئے جانے والے ایک اور انعام کا ذکر ہے

مگر اس کا حاصل ذکر کرنے سے پہلے ایک تمہید کا بیان کرنا ضروری ہے جس سے تقریباً بنی اسرائیل سے متعلق تمامی واقعات کا نچوڑ سمجھ میں آجائے گا۔

تمہید: بنی اسرائیل کا اصلی وطن کنعان یعنی ملک شام تھا۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے عہد میں قحط سالی کی وجہ سے یہ سب مصر چلے گئے تھے، ان کے پیچھے ایک ظالم قوم عمالقہ نے شام پر قبضہ کرلیا، پھر جب مدین سے مصر آکر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے مسلسل چالیس سال تک فرعونیوں کو تبلیغ فرمائی مگروہ ایمان نہ لائے اور آپ نے فرعونیوں کے ایمان سے مایوس ہوکر بارگاہ الٰہی سے مصر سے ہجرت کرنے کی اجازت طلب کی تو انھیں مصر سے ہجرت کی اجازت ملی اور حکم ہوا کہ بنی اسرائیل عمالقہ سے جہاد کر کے اپنا وطن آزاد کرائیں اور اس میں آزادی اور عزت کی زندگی بسر کریں، مگر بنی اسرائیل نے جہاد کرنے سے صاف انکار کردیا جس کی وجہ سے وہ مصر سے چلتے وقت راستہ بھول گئے۔ چنانچہ انھیں مصر سے نکل کر شمال و مشرق میں ارض فلسطین و شام کی طرف جانا تھا مگر وہ مصر سے جانب شرق دریائے قلزم کی طرف نکل گئے۔

قلزم ایک شہر کا نام ہے جہاں یہ دریا ختم ہوتا ہے اس لئے اس دریا کو بھی قلزم کہا جاتا ہے یہ دریا سمندر کی ایک شاخ ہے جو جبش اور دیگر بلاد عرب سے گذرتی ہوئی شہر قلزم کے قریب ختم ہوگئی ہے اور یہ شہر قلزم مصر سے تین دن کی مسافت پر واقع ہے، اسی دریائے قلزم کے ساحل پر تاران نامی ایک بستی ہے۔

بنی اسرائیل نے جن کی تعداد مصر سے نکلتے وقت ۶ ر لاکھ ستر ہزار تھی، مصر سے نکل کر مقام تاران کے محاذی ساحل قلزم پر پڑاؤ کیا اور یہیں فرعون مع لشکر دریائے قلزم میں غرق ہوا۔ تاران سے آگے قلزم کے شرق میں ایک بیابان ہے جو آگے چل کر شام اور عرب کے رخ دور تک چلا گیا ہے اس بیابان میں پانی اور سایہ دار درخت کا نام و نشان نہیں ملتا محض سنگلاخ یا ریگستانی زمین ہے جس پر خاردار درخت اور خشک پہاڑیاں ہیں، اسی بیابان کا نام تیہ ہے اور اسی میں طور پہاڑ واقع ہے بنی اسرائیل غرق فرعون کے بعد تاران سے چلے تو اسی تیہ نامی بیابان میں جا پھنسے اور ان کے سارے واقعات مثلاً گوسالہ پرستی، بجلی سے موت اور پھر زندہ ہونا وغیرہ اسی میدان میں پیش آئے۔ (تفسیر فتح المنان ملخصاً)

بنی اسرائیل جب میدان تیہ میں پھنس گئے تو وہاں بھی اللہ تعالیٰ کی نوازشات ان پر سایہ فگن رہیں اور حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام کی برکت سے ان پر انعامات کی بارش ہوتی رہی، انھیں انعامات میں سے ایک انعام کا ذکر یہاں مقصود ہے جس کی طرف مفسر علام نے سترنا الخ سے اشارہ کیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ میدان تیہ میں چونکہ سایہ دار درخت نہیں تھے اور نہ ہی بنی اسرائیل کے پاس کھانے کی کوئی چیز رہی تھی اس لئے دھوپ کی گرمی اور بھوک سے پریشان ہوکر انھوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے شکایت کی، اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا پر دھوپ سے بچنے کے لئے بادلوں کا سائبان تان دیا اور کھانے کے لئے من و سلویٰ نازل فرمایا۔

قولہ: هما الترنجبين الخ یہ من و سلویٰ کی توضیح ہے یعنی من سے مراد ترنجبین ہے جو ایک قسم کی قدرتی شکر تھی، یہ شبنم کی طرح درخت اور پتھر وغیرہ پر گر کر جم جاتی تھی۔ روزانہ صبح صادق سے طلوع آفتاب تک یہ قدرتی شکر گرتی تھی جو جم کر

برف کی طرح سفید اور لذت میں گھی اور شہد کے معجون کی طرح ہوتی تھی ہر شخص کو ایک صاع کی مقدار ملتی تھی لوگ اس کو اپنی چادر وغیرہ میں جمع کر لیتے تھے اور دن بھر کھاتے رہتے اور چونکہ یہ رزق لذیذ ان کو محنت و مشقت کے بغیر حاصل ہوجاتا تھا اس لئے اسے من (احسان) فرمایا گیا۔

سلویٰ ایک دریائی چھوٹے پرندے کا نام ہے جس کا گوشت انتہائی لذیذ اور زود ہضم ہوتا ہے روزانہ شام کے وقت ان پرندوں کو ہوا اڑا کر لاتی تھی اور یہ آسانی کے ساتھ ان کا شکار کر کے کباب بنا کر کھاتے تھے۔ (تفسیر عزیزی وغیرہ)

خیال رہے من وسلویٰ کے علاوہ میدان تیہ میں بنی اسرائیل کو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے ہر طرح کی سہولت عطا فرمائی تھی مثلاً شب میں ان کے لئے نوری ستون اترتا تھا جس کی روشنی میں وہ اپنا کام کرتے تھے، ان کے کپڑے میلے اور پرانے نہ ہوتے تھے تاکہ درزی اور دھوبی کی ضرورت نہ پڑے، ناخن اور بال بھی نہ بڑھتے تھے تاکہ نائی سے بے نیاز رہیں، میدان تیہ میں جو بچے پیدا ہوتے تھے ان کا لباس ان کے ساتھ پیدا ہوتا تھا جس قدر بچے بڑھتے اسی قدر لباس بھی بڑھتا رہتا۔ اس طرح بنی اسرائیل کی زیست اور راحت کے جملہ سامان بے آب وگیاہ ریگستان میں فراہم کر دیئے گئے تھے۔ (خزائن العرفان)

قوله: فکفروا النعمة الخ بنی اسرائیل پر من وسلویٰ کا نزول سنیچر کے علاوہ ہر دن ہوتا تھا مگر جمعہ کے دن اور دنوں سے دوگنا اترتا تھا، حکم یہ تھا کہ ہفتہ کے لئے جمعہ کے دن حسب ضرورت جمع کر لیا کرو مگر جمعہ کے علاوہ کسی اور دن ذخیرہ اندوزی نہ کرنا، بنی اسرائیل نے اس حکم کی خلاف ورزی کی اور ذخیرہ اندوزی کرنے لگے جس کا انجام یہ ہوا کہ کباب کے ذخیرے سڑ گئے اور ان کی آمد بند کر دی گئی، اس طرح بنی اسرائیل نے گویا اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی ناشکری کی جس سے خود انھیں کا نقصان ہوا کہ دنیا میں نعمت سے محروم کر دیئے گئے اور آخرت میں عذاب کے مستحق ہو گئے۔ (تفسیر عزیزی وخزائن العرفان)

مفسرین فرماتے ہیں کہ اگر بنی اسرائیل نے ذخیرہ اندوزی کی غلطی نہ کی ہوتی تو کھانا کبھی نہیں سڑتا، حدیث شریف میں بھی ارشاد ہے کہ اگر بنی اسرائیل نہ ہوتے تو کھانا کبھی سڑتا ہی نہیں اور اگر حوا کی خیانت (حضرت آدم کو گندم کھلانا) نہ ہوتی تو کوئی بھی عورت اپنے شوہر سے خیانت نہ کرتی۔

غرق فرعون: جب حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون اور فرعونیوں کے ایمان سے مایوس ہو گئے اور انھیں مصر سے کنعان جانے کا حکم ملا تو آپ نے تمام بنی اسرئیل کو شہر سے باہر جمع ہونے کا حکم دیا چنانچہ تمام بنی اسرائیل نے نویں محرم جمعرات کے دن شہر سے باہر خیمہ نصب کر دیا اور قبطیوں کے پوچھنے پر بتایا کہ یوم عاشورہ قریب آ گیا ہے لہٰذا ہم شہر سے باہر اکٹھا ہو کر عید منانا چاہتے ہیں، اس جواب سے تمام فرعونی مطمئن ہو گئے۔ نو محرم کا دن گزار کر رات میں بنی اسرائیل نے کنعان کی طرف کوچ کیا اور پھر راستہ سے بھٹک کر مقام تاران کے قریب ساحل قلزم پر جا پہنچے اور وہیں ڈیرے ڈال دیئے۔

ادھر جب فرعون کو بنی اسرائیل کے کوچ کر جانے کی خبر ملی تو اس نے فوراً فوج کو جمع ہونے کا حکم دیا اور آناً فاناً اس حکم کی تعمیل ہوئی روایت میں ہے کہ ستر ہزار گھوڑے سوار فوج لشکر کے آگے آگے تھی اور تفسیر روح البیان میں فرمایا کہ سواروں کی تعداد ستر لاکھ تھی، تفسیر عزیزی کے مطابق ایک لاکھ تیر انداز، ایک لاکھ نیزے باز، ایک لاکھ گرز مارنے والے فرعونی لشکر میں تھے،

فرعون نے اس لشکر جرار کے ساتھ کوچ کیا اور دوپہر کے قریب دسویں محرم الحرام کو مقام تاران کے قریب بنی اسرائیل کو جالیا۔

بنی اسرائیل فرعونی لشکر دیکھ کر گھبرا گئے تو وحی آئی کہ اے موسیٰ! دریا پر اپنا عصا مار کر کہو کہ تو پھٹ جا اور ہم کو راستہ دے آپ نے ایسا ہی کیا جس سے دریا میں بارہ راستے بن گئے، پہلے حضرت یوشع اور حضرت ہارون علیہما السلام نے اس راستے پر اپنے اپنے گھوڑے ڈالے اور پھر تمامی بنی اسرائیل دریا میں اتر گئے سب کے پیچھے حضرت موسیٰ علیہ السلام داخل ہوئے۔

فرعون جب اپنے لشکر کے ساتھ دریا کے اس مقام پر پہنچا جہاں سے بنی اسرائیل دریا عبور کر رہے تھے تو اس کے وزیر ہامان نے کشتی سے دریا عبور کرنے کا مشورہ دیا فرعون نے اس مشورہ کو قبول کیا اور اپنے گھوڑے کو آگے بڑھنے سے روک دیا، اسی حالت میں حضرت جبرئیل علیہ السلام انسانی شکل میں گھوڑی پر سوار ہو کر فرعون کے گھوڑے کے آگے نمودار ہوئے اور اپنی گھوڑی کو دریا میں ڈال دیا، فرعون کا گھوڑا اس گھوڑی کی بو پا کر اس کے پیچھے ہولیا اور فرعون کے روکنے پر بھی نہ رکا اور اس خشک راستے میں داخل ہو گیا۔ فرعون کے لشکر نے جب اسے دریا میں صحیح وسلامت دیکھا تو وہ بھی داخل ہو گئے۔ جب سارا لشکر بیچ دریا میں آ گیا تو حکم الٰہی سے دریا آپس میں مل گیا اور سب غرق ہو گئے اور چونکہ اس مقام پر دریائے قلزم کا عرض صرف چار فرسخ کوس تھا اس لئے دوسرے کنارے سے بنی اسرائیل یہ سارا منظر دیکھ رہے تھے۔ مگر اسرائیلیوں کے دلوں میں فرعون کی ایسی ہیبت بیٹھی ہوئی تھی کہ انھیں فرعون کے ڈوبنے کا یقین نہ آتا تھا تب دریا نے فرعون، ہامان اور دیگر سرکردہ فرعونیوں کی لاش باہر پھینک دی جس سے اسرائیلیوں کو ان کی موت کا یقین ہوا۔ (تفسیر نعیمی وتفسیر عزیزی)

ایک غیر مقلد عالم کی مشرکانہ تفسیر:

غیر مقلد عالم مولوی صلاح الدین یوسف نے گئو سالہ پرستی کا واقعہ نقل کرنے کے بعد مولوی محمد جونا گڑھی کے ترجمۂ قرآن میں بطور تفسیر لکھا ''آج کا مسلمان بھی شرکیہ عقائد واعمال میں بری طرح مبتلا ہے لیکن وہ سمجھتا یہ ہے کہ مسلمان مشرک کس طرح ہو سکتا ہے؟ ان مشرک مسلمانوں نے شرک کو پتھر کی مورتیوں کے پجاریوں کے لئے خاص کر دیا ہے کہ صرف وہی مشرک ہیں، جب کہ یہ نام نہاد مسلمان بھی قبروں پر قبوں کے ساتھ وہی کچھ کرتے ہیں جو پتھر کے پجاری اپنی مورتیوں کے ساتھ کرتے ہیں''۔

یہ ہے غیر مقلد عالم کی مشرکانہ تفسیر جو نہ یہ کہ صرف لائق نفرت ہے بلکہ غیر مقلدین کی حماقت وجہالت کا ایک بین ثبوت ہے، کہ بے چارہ قرآن کی تفسیر کرنے بیٹھا ہے مگر شیطانی توحید کے نشہ میں ایسا مخمور ہے کہ اسے نہ مسلمان اور مشرک کا فرق معلوم ہے اور نہ ہی شرک وتوحید میں امتیاز کی قدرت ہے، مگر موصوف کی تفسیر کا تحلیلی جائزہ پڑھنے سے پہلے مشرک اور مسلمان یوں ہی شرک اور توحید کی تعریفات پر ایک نظر:

مسلمان وہ ہے جو ضروریات دین کی تصدیق کرے اور ضروریات دین وہ مسائل دین ہیں جن کو ہر خاص وعام مسلمان جانتے ہیں مثلاً اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، انبیاء کی نبوت حشر ونشر وغیرہ (شامی)

مشرک وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات اور عبادت میں کسی کو شریک سمجھے۔ (عامۂ کتب فتاویٰ)
توحید نام ہے اللہ تعالیٰ کو ایک جاننے کا اس طرح کہ اس کی ذات، اس کی صفات اور عبادت میں کسی کو شریک نہ کرے۔ اور اسی کا مقابل شرک ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات یا اس کی عبادت میں کسی کو شریک کرنا شرک کہلاتا ہے۔
اب ایک نظر آنجناب کی مشرکانہ تفسیر پر ڈالیں لکھتے ہیں: ''آج کا مسلمان بھی، شرکیہ عقائد واعمال میں بری طرح مبتلا ہے'' یعنی آج کا مسلمان مشرک بھی ہے اور مسلمان بھی جب کہ اسلام اور شرک میں تضاد ہے کہ جو مسلمان ہوگا وہ مشرک نہیں اور جو مشرک ہوگا وہ مسلمان نہیں پھر شخص واحد کو دو متضاد صفات کا حامل ماننا جہالت وحماقت نہیں تو اور کیا ہے؟
اور لطف یہ کہ کسی خاص جماعت یا فرقہ کی طرف اشارہ بھی نہیں بلکہ مطلق کہا ''آج کا مسلمان'' اب اس جملہ کے دو رخ ہیں اولاً یہ کہ مفسر موصوف خود کو مسلمان نہیں سمجھتے اس لئے سب مسلمانوں کو مشرک کہا تو بزبان خویش وہ کافر ٹھہرے، اور اگر خود کو مسلمان سمجھتے ہیں تو وہ خود بھی بزبان خویش مشرک ہوئے کہ جملہ کا اطلاق عموم چاہتا ہے۔

سمجھتے تھے رہے گی جنگ محدود گل وبلبل
مگر تخریب نظم گلستاں تک بات جا پہنچی

رہا مشرکانہ تفسیر کا آخری حصہ تو وہ قابل التفات نہیں کہ غیر مقلدین اپنی پیدائش کے دن سے ہی خوش عقیدہ مسلمانوں پر اس قسم کی بہتان تراشی کرتے چلے آئے ہیں جس کا جواب بھی ہمارے علمانے بار ہا دیا، یہاں تو بس اس قدر کہدینا کافی ہے کہ:

وحشت میں ہر اک نقشہ الٹا نظر آتا ہے
مجنوں نظر آتی ہے لیلیٰ نظر آتا ہے

﴿وَ اِذْ قُلْنَا﴾ لَهُمْ بَعْدَ خُرُوْجِهِمْ مِنَ التِّيْهِ ﴿ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ﴾ بَيْتَ الْمُقَدَّسِ اَوْ اَرِيْحَا ﴿فَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا﴾ وَاسِعًا لَاحَجْرَ فِيْهِ ﴿وَ ادْخُلُوا الْبَابَ﴾ اَىْ بَابَهَا ﴿سُجَّدًا﴾ مُنْحَنِيْنَ ﴿وَ قُوْلُوْا﴾ مَسْأَلَتُنَا ﴿حِطَّةٌ﴾ اَىْ اَنْ تَحُطَّ عَنَّا خَطَايَانَا ﴿نَغْفِرْ﴾ وَ فِىْ قِرَاءَةٍ بِالْيَاءِ وَ التَّاءِ مَبْنِيًا لِلْمَفْعُوْلِ فِيْهِمَا ﴿لَكُمْ خَطٰيٰكُمْ وَ سَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ٥﴾ بِالطَّاعَةِ ثَوَابًا ﴿فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا﴾ مِنْهُمْ ﴿قَوْلًا غَيْرَ الَّذِىْ قِيْلَ لَهُمْ﴾ فَقَالُوْا حَبَّةٌ فِىْ شَعْرَةٍ وَ دَخَلُوْا يَزْحَفُوْنَ عَلٰى اَسْتَاهِهِمْ ﴿فَاَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا﴾ فِيْهِ وَضْعُ الظَّاهِرِ مَوْضَعَ الْمُضْمَرِ مُبَالَغَةً فِىْ تَقْبِيْحِ شَانِهِمْ ﴿رِجْزًا﴾ عَذَابًا طَاعُوْنًا ﴿مِنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ٥﴾ بِسَبَبِ فِسْقِهِمْ اَىْ خُرُوْجِهِمْ عَنِ الطَّاعَةِ فَهَلَكَ مِنْهُمْ فِىْ سَاعَةٍ سَبْعُوْنَ اَلْفًا اَوْ اَقَلُّ.

ترجمہ: ﴿اور جب ہم نے فرمایا﴾ ان سے میدان تیہ سے ان کے نکلنے کے بعد ﴿داخل ہو جاؤ اس بستی میں﴾ بیت المقدس یا اریحا میں ﴿پھر اس میں جہاں چاہو بے روک ٹوک کھاؤ﴾ بلا تکلف اس میں کوئی ممانعت نہیں ﴿اور داخل ہونا

دروازہ سے﴾ یعنی اس بستی کے دروازہ سے ﴿سجدہ کرتے﴾ سر جھکائے ہوئے ﴿اور کہتے جانا﴾ ہماری درخواست ہے کہ ﴿ہمیں بخش دے﴾ یعنی ہمارے گناہ معاف ہوں ﴿ہم بخش دیں گے﴾ اور ایک قراءت میں نغفر کی جگہ یاء اور تاء کے ساتھ (یغفر اور تغفر) مبنی للمفعول یعنی مجہول ہیں۔ ﴿تمہاری خطائیں، اور قریب ہے کہ ہم نیکی کرنے والوں کو اور زیادہ دیں﴾ اطاعت کا ثواب ﴿پس بدل ڈالا ان ظالموں نے﴾ ان میں سے کچھ نے ﴿اور بات سے جو کہا گیا تھا انہیں﴾ تو انھوں نے کہا حبة فی شعرة اور اپنی سرین کے بل داخل ہوئے ﴿تو ہم نے اتارا ان ظالموں پر﴾ اس میں ضمیر کی جگہ اسم ظاہر لایا گیا ان کی قبیح حالت میں مبالغہ کے لئے ﴿عذاب﴾ یعنی بلا بصورت طاعون ﴿آسمان سے، بدلہ ان کے فسق کا﴾ ان کی نافرمانی کے سبب یعنی اطاعت سے نکل جانے کی وجہ سے لہٰذا ان میں سے ستر ہزار یا اس سے کچھ کم فی الفور ہلاک ہوگئے۔

توضیح و تشریح: قولہ: بیت المقدس او اریحا. اس عبارت سے حضرت مفسر قدس سرہ نے قریہ سے متعلق مفسرین کے اختلاف کی جانب اشارہ فرمایا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ آیت میں لفظ قریہ سے کون سی بستی مراد ہے، یہ واضح نہیں لہٰذا اس کی تعیین میں اختلاف ہوگیا بعض علما نے فرمایا کہ اس سے مراد ''بیت المقدس'' ہے اور بعض نے فرمایا کہ اس سے ''اریحا'' مراد ہے جو بیت المقدس کے قریب ایک بستی تھی اور جس میں قوم عمالقہ رہتی تھی، اس قوم کا سردار عوج بن عنق تھا۔

اگر پہلا قول درست ہے یعنی اس بستی سے مراد بیت المقدس ہے تو یہ واقعہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ظاہری زندگی کا ہے جب بنی اسرائیل میدان تیہ میں تھے اور مطلب یہ ہوگا کہ اے بنی اسرائیل! جب تم میدان تیہ سے نکلو تو ادب کے ساتھ بیت المقدس میں داخل ہو۔ اور اگر اس بستی سے اریحا گاؤں مراد ہے تو یہ واقعہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد حضرت یوشع بن نون علیہ السلام کے زمانے کا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے میدان تیہ میں وفات پائی اور پھر حضرت یوشع علیہ السلام بنی اسرائیل کے حاکم ہوئے اور آپ نے ہی اریحا وغیرہ کو فتح کیا۔ (خازن)

خیال رہے کہ دوسرے قول کی صحت پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ آئندہ آیت میں پھر میدان تیہ کا ہی ذکر آرہا ہے لہٰذا اگر یہ واقعہ تیہ سے نکلنے کے بعد کا ہے تو واقعات کا بیان بے ترتیب ہوجائے گا۔ اس کا حل یہ ہے کہ قرآن پاک جن واقعات کا ذکر کرتا ہے اس سے واقعہ کی تاریخی حیثیت کا بیان مقصود نہیں ہوتا بلکہ اس سے صرف عبرت و موعظت کا بیان مقصود ہوتا ہے۔ لہٰذا یہاں بھی واقعات کا تسلسل اور حسن ترتیب پیش نظر نہیں بلکہ بنی اسرائیل پر کئے گئے احسانات کا شمار کرانا مطلوب ہے۔

قولہ: واسعاً لاحَجَرَ فیہ — اس تفسیر سے "رغداً" کے معنی کی توضیح اور اشارہ مقصود ہے کہ آیت میں امر کا صیغہ کلوا وجوب کے لئے نہیں بلکہ اباحت کے لئے ہے، چونکہ عمالقہ نے جب حضرت یوشع بن نون علیہ السلام کے ساتھ بنی اسرائیل کا لشکر دیکھا تو انھوں نے اپنی بستیوں سے راہ فرار اختیار کرلی اور غلے، میوے اور دیگر جائدادیں یہیں چھوڑ گئے جسے اللہ تعالیٰ نے اسرائیلوں کے لئے حلال کردیا اور وہاں کی ساری چیزوں سے فائدہ اٹھانا ان کے لئے مباح ہوگیا مگر چونکہ کھانا بڑی نعمتوں سے ہے اس لئے خصوصیت کے ساتھ کھانے کا ہی ذکر فرمایا۔ (تفسیر عزیزی)

قولہ: ای بابها یہاں ضمیر مؤنث قریہ کی طرف لوٹتی ہے اور چونکہ قریہ کی تعیین میں اختلاف ہے اس لئے باب کے

تعلق سے بھی اختلاف ہوگیا لہٰذا جو علما قریہ سے بیت المقدس مراد لیتے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ اس سے بیت المقدس کا دروازہ مراد ہے جو آج بھی موجود ہے۔ اس کا نام حطہ یا باب القبہ ہے اور اب بھی جو شخص بیت المقدس میں داخل ہوتا ہے وہ اسی دروازہ سے داخل ہوتا ہے۔ اور جو علما قریہ سے اریحا بستی مراد لیتے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ اس سے اریحا بستی کا کوئی دروازہ مراد ہے۔
(خازن وروح البیان)

قولہ: منحنین اس لفظ سے حضرت مفسر نے اشارہ فرمایا ہے کہ آیت میں لفظ سجدہ اصطلاحی معنی میں نہیں بلکہ مجازی معنی میں ہے یعنی محض بطور ادب جھک جانا مراد ہے پیشانی کا ٹیکنا مراد نہیں۔

قولہ: ای ان تحط الخ یہ حطة کا معنی ہے۔ حطہ بنی اسرائیل کے لئے کلمۂ استغفار تھا جس کا معنی ہے "ہمارے گناہ بخش دے"

قولہ: فقالوا الخ اس عبارت سے اشارہ فرمایا کہ بنی اسرائیل نے قول وفعل دونوں سے حکم الٰہی کی مخالفت کی یعنی انھیں حکم تھا کہ انکساری اور تواضع کے ساتھ دروازے میں داخل ہوں اور ساتھ ہی توبہ واستغفار کا کلمہ زبان سے ادا کرتے جائیں، انھوں نے دونوں حکموں کی مخالفت کی داخل تو ہوئے سرین کے بل گھسٹتے ہوئے اور کلمۂ استغفار کی جگہ حبة فی شعرة کہنے لگے جس کا معنی ہے "بالی میں دانہ"

قولہ: فیہ وضع الظاهر الخ یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ آیت میں فانزلنا کے بعد ضمیر لانے کا مقام تھا مگر وہاں اسم ظاہر ہے یعنی علیہم کی بجائے الذین ظلموا فرمایا تاکہ ان کی قباحت خوب واضح ہو جائے۔

قولہ: بسبب فسقهم الخ اس عبارت سے اشارہ فرمایا کہ بما میں باسبب کے لئے ہے اور ما مصدریہ ہے اور بتانا یہ مقصود ہے کہ ان پر یہ عذاب بلا وجہ نہیں تھا بلکہ ان کی نافرمانیوں اور بداعمالیوں کا طبعی نتیجہ تھا۔

قولہ: فهلك منهم الخ اس عبارت سے اشارہ فرمایا کہ طاعون بنی اسرئیل کے لئے بطور عذاب تھا کہ آناً فاناً ستر ہزار یا اس سے کچھ کم اسرائیلی طاعون سے ہلاک ہو گئے بخلاف امت محمدیہ کے کہ اس امت میں اگر طاعون کی وبا پھیلے اور مسلمان اس وبا سے مرجائیں تو وہ ہلاک نہیں ہوتے بلکہ شہادت کا درجہ پاتے ہیں۔ (صاوی)

میدان تیہ سے بنی اسرائیل کا نکلنا:

بنی اسرائیل اپنی بداعمالیوں کی وجہ سے بطور سزا میدان تیہ میں قید کر دیئے گئے اور وہ اس ریگستانی بیابان میں مسلسل چالیس سال تک ٹھوکریں کھاتے رہے۔ ہر دن صبح اپنا سفر شروع کرتے اور جب شام ہوتی تو خود کو وہیں پاتے جہاں سے سفر کا آغاز کیا تھا، سفر کی مشقت سے تھک جاتے مگر ان میں جو صلحاء اور انبیاء تھے مثلاً حضرت موسیٰ وہارون اور یوشع بن نون علیہم السلام انھیں کوئی دشواری اور تکلیف محسوس نہ ہوتی جب بنی اسرائیل بہت گھبرا گئے اور من وسلویٰ کا آنا بھی بند ہو گیا تو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کنعان کی تمام سرزمین دکھائی اور خبر دی کہ تم اس ملک میں نہ جا سکو گے مگر بنی اسرائیل کو بتا دو کہ وہ

عنقریب اس ملک کو فتح کریں گے لیکن جب وہ اس ملک میں داخل ہوں تو اپنی فتح اور بہادری پر تکبر نہ کریں بلکہ عاجزی کے ساتھ کلمۂ استغفار پڑھتے ہوئے داخل ہوں اس پر ہم ان کے گناہ معاف کردیں گے اور ان میں جو نیکوکار ہیں انھیں مزید انعامات سے نوازیں گے۔

چنانچہ حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام اور وہ اسرائیلی جن کی عمر میدان تیہ میں داخل ہونے کے وقت چالیس سال یا اس سے زائد تھی سبھی انتقال کر گئے، اور پھر حضرت یوشع بن نون علیہ السلام کو نبوت عطا ہوئی اور وہ بنی اسرائیل کے حاکم اعلیٰ بنائے گئے انھوں نے بنی اسرائیل کو عمالقہ سے جہاد کرنے کا حکم دیا مگر اسرائیلیوں نے کہا ہم عمالقہ سے ڈرتے ہیں وہ عظیم الجثہ اور بہادر ہوتے ہیں لہٰذا جب تک وہ خود نہ بھاگ جائیں ہم ان کی بستیوں میں داخل نہ ہوں گے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ خواہش بھی پوری فرمائی اور عمالقہ کے دل میں بنی اسرائیل کا رعب پیدا فرمادیا جس سے وہ خود ہی اپنی بستیوں کو چھوڑ کر بھاگ اٹھے، پھر اسرائیلی میدان تیہ سے نکل کر کنعان میں داخل ہوئے مگر پھر بھی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے باز نہ آئے اور حکم کے مطابق عمل نہ کیا جس کے سبب وہ طاعون کی بیماری میں مبتلا کئے گئے اور ستر ہزار کے قریب اسی وقت فنا کردیئے گئے۔ (تفسیر فتح المنان ملخصاً)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا وصال مبارک اور عمر شریف:

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا وصال مبارک کہاں ہوا اور آپ کا مزار مبارک کہاں ہے؟ اس سلسلہ میں علما کے سات اقوال ہیں، صحیح اور راجح یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا وصال میدان تیہ میں ہوا اور وہیں آپ کا مزار پاک ہے، یہی حضرت ابن عباس، وہب بن منبہ (رضی اللہ عنہما) اور عام علما کا قول ہے۔ (نزہۃ القاری شرح بخاری جلد سوم، ص ۱۰۲، دائرۃ البرکات، گھوسی)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے وصال مبارک کی کیفیت کے بارے میں دو روایتیں ہیں ایک یہ کہ تشریف لئے جارہے تھے دیکھا کہ فرشتے ایک بہترین قبر کھود رہے ہیں، دریافت فرمایا کس کے لئے کھود رہے ہو؟ فرشتوں نے عرض کی کیا آپ اس میں دفن ہونا پسند فرماتے ہیں؟ ارشاد فرمایا ہاں، فرشتوں نے کہا تو اس میں لیٹ جایئے اور اپنے رب کی طرف توجہ کیجئے، حضرت موسیٰ علیہ السلام لیٹ گئے اور ہلکی سی سانس لی روح پرواز کرگئی۔ دوسری روایت یہ ہے کہ حضرت ملک الموت جنت سے ایک سیب لائے آپ نے اسے سونگھا اور روح اعلیٰ علیین میں چلی گئی۔ (ایضاً) عمر شریف کے بارے میں بھی دو قول ہیں ایک یہ کہ آپ کی عمر شریف ایک سو بیس سال ہوئی دوسرا یہ کہ ایک سو ساٹھ سال تھی۔ (شرح صحیح مسلم جلد ۶، ص ۸۵۲، علامہ غلام رسول سعیدی، مکتبہ مرکز اہلسنت برکات رضا پور بندر، گجرات)

﴿وَ﴾ اذْكُرْ ﴿اِذِ اسْتَسْقٰى مُوْسٰى﴾ اَیْ طَلَبَ السُّقْيَا ﴿لِقَوْمِهٖ﴾ وَ قَدْ عَطِشُوْا فِی التِّيْهِ ﴿فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ﴾ وَ هُوَ الَّذِیْ فَرَّ بِثَوْبِهٖ خَفِيْفٌ مُرَبَّعٌ كَرَاسِ رَجُلٍ رُخَامٌ اَوْ كَذَانٌ فَضَرَبَهٗ ﴿فَانْفَجَرَتْ﴾ اِنْشَقَّتْ وَ سَالَتْ ﴿مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا﴾ بِعَدَدِ الْاَسْبَاطِ ﴿قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ﴾ سِبْطٍ

مِنْهُمْ ﴿مَشْرَبَهُمْ﴾ مَوْضَعَ شُرْبِهِمْ فَلَا يُشْرِكُهُمْ فِيْهِ غَيْرُهُمْ وَ قُلْنَا لَهُمْ ﴿كُلُوْا وَ اشْرَبُوْا مِنْ رِّزْقِ اللّٰهِ وَ لَا تَعْثَوْا فِى الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ٥﴾ حَالٌ مُؤَكِّدَةٌ لِعَامِلِهَا مِنْ عَثِىَ بِكَسْرِ الْمُثَلَّثَةِ اَفْسَدَ ﴿وَ اِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ﴾ اَىْ نَوْعٍ مِنْهُ ﴿وَّاحِدٍ﴾ وَهُوَ الْمَنُّ وَ السَّلْوٰى ﴿فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُخْرِجْ لَنَا﴾ شَيْئًا ﴿مِمَّا تُنْبِتُ الْاَرْضُ مِنْ﴾ لِلْبَيَانِ ﴿بَقْلِهَا وَ قِثَّائِهَا وَ فُوْمِهَا﴾ حِنْطَتِهَا ﴿وَ عَدَسِهَا وَ بَصَلِهَا قَالَ﴾ لَهُمْ مُوْسٰى ﴿اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِىْ هُوَ اَدْنٰى﴾ اَخَسُّ ﴿بِالَّذِىْ هُوَ خَيْرٌ﴾ اَشْرَفُ اَىْ تَاْخُذُوْنَهُ بَدَلَهُ وَ الْهَمْزَةُ لِلْاِنْكَارِ فَاَبَوْا اَنْ يَّرْجِعُوْا فَدَعَا اللّٰهَ فَقَالَ تَعَالٰى ﴿اِهْبِطُوْا﴾ اِنْزِلُوْا ﴿مِصْرًا﴾ مِنَ الْاَمْصَارِ ﴿فَاِنَّ لَكُمْ﴾ فِيْهِ ﴿مَّا سَاَلْتُمْ﴾ مِنَ النَّبَاتِ ﴿وَ ضُرِبَتْ﴾ جُعِلَتْ ﴿عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ﴾ الذُّلُّ وَ الْهَوَانُ ﴿وَ الْمَسْكَنَةُ﴾ اَىْ اَثَرُ الْفَقْرِ مِنَ السُّكُوْنِ وَ الْخِزْىِ فَهِىَ لَازِمَةٌ لَّهُمْ وَاِنْ كَانُوْا اَغْنِيَاءَ لُزُوْمَ الدِّرْهَمِ الْمَضْرُوْبِ لِسِكَّتِهِ ﴿وَ بَآءُوْا﴾ رَجَعُوْا ﴿بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ذٰلِكَ﴾ اَىِ الضَّرْبُ وَ الْغَضَبُ ﴿بِاَنَّهُمْ﴾ اَىْ بِسَبَبِ اَنَّهُمْ ﴿كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ يَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ﴾ كَزَكَرِيَّا وَ يَحْيٰى ﴿بِغَيْرِ الْحَقِّ﴾ اَىْ ظُلْمًا ﴿ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّ كَانُوْا يَعْتَدُوْنَ٥﴾ يَتَجَاوَزُوْنَ الْحَدَّ فِى الْمَعَاصِىْ وَ كَرَّرَهُ لِلتَّاكِيْدِ.

حل اللغات: ﴿طلب السقيا﴾ اس نے بارش طلب کی ﴿عطشوا﴾ وہ پیاسے ہوئے [س] ﴿التیہ﴾ چٹیل میدان جس میں آدمی بھٹک جائے، یہاں مراد تیہ بنی اسرائیل ہے۔ ﴿فر﴾ وہ بھاگا [ض] ﴿ثوب﴾ کپڑا، جمع ثیاب، اثواب، اثوب ﴿خفیف﴾ ہلکا ﴿مربع﴾ چار ضلعوں والی شکل یعنی چوکور ﴿رأس﴾ سر، جمع ارؤس و رؤوس ﴿رخام﴾ سنگ مرمر ﴿کذان﴾ نرم پتھر ﴿الاسباط﴾ خاندان، واحد سبط ﴿موضع شربھم﴾ اپنے پینے کی جگہ یعنی گھاٹ ﴿اخس﴾ گھٹیا ﴿ابو﴾ انھوں نے انکار کردیا [ف، ض] ﴿النبات﴾ زمین سے جو کچھ اُگے [مصدر ہے] واحد نباتة اور جمع نباتات ہے ﴿جعلت علیھم﴾ ان پر مسلط کردی گئی ﴿الذل﴾ تابعداری، ذلت ﴿الھوان﴾ رسوائی ﴿الخزی﴾ ذلت، رسوائی، عذاب ﴿الدرھم المضروب﴾ ڈھلا ہوا درہم ﴿السکة﴾ سکہ ڈھالنے کا سانچہ، جمع سکك ﴿یتجاوزون الحد﴾ حد سے گزر جاتے ہیں ﴿المعاصی﴾ گناہ، واحد عصیان.

ترجمہ: ﴿اور﴾ یاد کرو ﴿جب پانی کی دعا مانگی موسیٰ نے﴾ یعنی سیرابی طلب کی ﴿اپنی قوم کے لئے﴾ جب وہ (قوم) پیاسی ہوئی میدان تیہ میں ﴿تو ہم نے فرمایا اس پتھر پر اپنا عصا مارو﴾ یہ وہی پتھر تھا جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کا کپڑا لے کر بھاگا تھا ہلکا، چوکور، جیسے آدمی کا سر، سنگ مرمر یا کوئی نرم پتھر تھا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عصا اس پر مارا ﴿تو فوراً بہہ نکلے﴾ پتھر پھٹا اور بہنے لگے ﴿اس سے بارہ چشمے﴾ خاندانوں کی تعداد کے مطابق ﴿پہچان لیا ہر گروہ نے﴾ ان کے ہر خاندان نے ﴿اپنا اپنا گھاٹ﴾ اپنے پینے کی جگہ، تو کوئی خاندان اپنے گھاٹ میں کسی اور خاندان کو شریک نہ کرتا، اور ہم نے ان سے کہا ﴿کھاؤ اور پیو خدا کا دیا اور زمین میں فساد اٹھاتے نہ پھرو﴾ اور یہ اپنے عامل سے حال موکدہ ہے جو عثی بکسر الثاء بمعنی افسد سے ہے ﴿اور یاد کرو جب تم نے کہا اے موسیٰ! ہم سے تو ایک کھانے پر ہرگز صبر نہ ہوگا﴾ یعنی ایک قسم

کے کھانا پر اور وہ من وسلویٰ تھا ﴿لہٰذا آپ اپنے رب سے دعا کیجئے کہ نکالے ہمارے لئے﴾ کچھ ﴿وہ جن کو زمین اگاتی ہے﴾ من بیانیہ ہے ﴿ساگ، ککڑی، گیہوں، مسور اور پیاز، کہا﴾ موسیٰ علیہ السلام نے ان سے ﴿کیا تم لینا چاہتے ہو وہ چیز جو ادنیٰ ہے﴾ حقیر ہے ﴿اس کے بدلے میں جو عمدہ ہے﴾ خیر بمعنی اشرف ہے، یعنی عمدہ چیز کی جگہ گھٹیا چیزیں لینا چاہتے ہو اور ہمزہ استفہام انکاری کے لئے ہے، مگر انھوں نے اپنی مانگ واپس لینے سے انکار کر دیا چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دعا کی تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿جاؤ﴾ اترو ﴿کسی شہر میں﴾ یعنی شہروں میں سے کسی بھی شہر میں ﴿تمہیں مل جائے گا﴾ اس میں ﴿جو تم نے مانگا﴾ زمین سے اُگی چیزیں ﴿اور مقرر کردی گئی﴾ مسلط کردی گئی ﴿ان پر ذلت﴾ خواری اور رسوائی ﴿اور ناداری﴾ یعنی غربت کا اثر مسکینی اور خواری اور لفظ مسکنۃ، سکون بمعنی مسکینی سے ہے لہٰذا ذلت ان کے لئے لازم ہے اگر چہ وہ مالدار ہوں، جیسے ڈھلے ہوئے درہم کے لئے ٹھپا لازم ہوتا ہے۔ ﴿اور مستحق ہو گئے﴾ لوٹے ﴿غضب الٰہی کی جانب وہ﴾ یعنی پھٹکار اور غضب ﴿اس وجہ سے تھا کہ وہ﴾ یعنی اس سبب سے تھا کہ وہ لوگ ﴿انکار کرتے رہتے تھے اللہ کی آیتوں کا اور قتل کرتے تھے انبیاء کو﴾ جیسے حضرت زکریا و یحیٰ علیہما السلام کو ﴿ناحق﴾ یعنی ظلماً ﴿یہ بدلہ تھا ان کی نافرمانیوں اور حد سے بڑھنے کا﴾ گناہوں میں حد سے بڑھ جاتے تھے، اس جملہ کو بطور تاکید مکرر کیا۔

توضیح و تشریح: قولہ: طلب السقیا۔ یہ استسقیٰ کا معنی ہے، اس کا حاصل یہ ہے کہ استسقیٰ بنا ہے سَقْیٌ سے جس کا معنی ہے بارش سے سیرابی یا مطلق سیرابی! اور جب یہ لفظ باب استفعال میں گیا تو اس میں استفعال کی خاصیت ”طلب ماخذ“ پائی گئی۔ لہٰذا استسقیٰ کا معنی ہوا۔ اس نے بارش یا سیرابی طلب کی۔

قولہ: و قد عطشوا فی التیہ اس عبارت سے اشارہ فرمایا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سارے انسانوں کے لئے بارش طلب نہ فرمائی بلکہ صرف اپنی قوم بنی اسرائیل کے لئے دعا فرمائی تھی جو آپ کے ہمراہ میدان تیہ میں تھی اور جیسا کہ گزرا کہ ان کی تعداد چھ لاکھ تھی جو بارہ میل کے طویل و عریض علاقہ میں ڈیرے ڈالتے تھے۔ (صاوی)

قولہ: وهو الذی الخ اس عبارت سے اشارہ فرمایا کہ الحجر میں ال برائے عہد ہے اور مراد وہ پتھر ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کپڑے لے کر بھاگا تھا جس کی قدرے تفصیل یہ ہے کہ بنی اسرائیل میں عام لوگ، ایک دوسرے کے سامنے ستر عورت کھولنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتے تھے مگر حضرت موسیٰ علیہ السلام اسے عیب سمجھتے اور کسی کے سامنے استنجا نہ فرماتے اور نہ ہی غسل وغیرہ کرتے وقت کسی کے سامنے برہنہ ہوتے، آپ کی اس طبعی حیا کی وجہ سے بنی اسرائیل کو وہم ہوا کہ شاید آپ کو انتفاخ خصیہ (خصیوں کا بڑھ جانا) کی بیماری ہے، اللہ تعالیٰ نے ان کے وہم کا ازالہ اس طرح فرمایا کہ ایک مرتبہ حضرت موسیٰ علیہ السلام غسل کے لئے ایک چشمہ میں اترے اور کپڑا اتار کر ایک پتھر پر رکھ دیا، جب غسل سے فارغ ہو کر باہر نکلے تو پتھر کپڑا لے کر بنی اسرائیل کے پڑاؤ کی طرف بھاگا آپ بھی کپڑا کے لئے اس کے پیچھے برہنہ ہی دوڑ پڑے۔ پتھر بنی اسرائیل کے پڑاؤ پر جا کر رکا، لوگوں کی نظر آپ کے ستر عورت پر پڑ گئی اور ان کے وہم کا ازالہ ہو گیا۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے عرض کیا کہ آپ اس پتھر کو سنبھال کر رکھیں کہ اس سے کمالات صادر ہوں گے۔ یہ پتھر سنگ مرمر یا کذان تھا جو ایک قسم کا نرم

پتھر ہوتا ہے، ایک گز لمبا اور ایک گز چوڑا چوکور تھا مگر گولائی کی طرف مائل تھا جیسے انسان کا سر، اس کے چاروں کنارے پر مزید تین تین گوشے ابھرے ہوئے تھے۔ (صاوی ملخصاً)

قولہ: فضربہ اس تقدیری عبارت سے یہ بتانا مقصود ہے کہ آگے فانفجرت میں فا برائے عطف ہے اور انفجرت معطوف ہے جس کا معطوف علیہ فضربہ محذوف ہے کیونکہ چشمہ پھوٹ پڑنا آپ کے ضرب پر متفرع ہے۔ مطلب یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے عصا سے پتھر پر مارا جس سے پتھر کے سب گوشوں میں شگاف پڑ گئے اور اس سے چشمے بہنے لگے اس مقام پر تفسیر عزیزی نے فرمایا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پتھر پر بارہ ضربیں لگائیں اور ہر ضرب سے ایک چشمہ جاری ہوا اس طرح کہ پتھر کے ہر گوشہ پر عورت کے پستان جیسا ابھار ظاہر ہوتا جس سے پہلے عرق سا آتا اور پھر قطرہ قطرہ ٹپکتا پھر پانی بہنے لگتا۔

قولہ: بعدد الاسباط اسباط جیسا کہ گزرا سبط کی جمع ہے جس کا معنی ہے خاندان اور قبیلہ، چونکہ بنی اسرائیل کے بارہ خاندان تھے اس لئے اللہ تعالیٰ نے خاندانوں کے مطابق بارہ چشمے جاری فرما دیئے کہ اگر ایک ہی چشمہ ہوتا تو بنی اسرائیل آپس میں لڑائی جھگڑا کرتے۔

قولہ: موضع شربھم الخ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو حکم دیا تھا کہ ہر قبیلہ الگ الگ اپنا ایک تالاب کھود لے۔ ہر قبیلہ نے اپنے اپنے پڑاؤ کے قریب اپنا اپنا تالاب کھود لیا، پتھر سے پانی آکر تالاب میں جمع ہوتا اور ہر قبیلہ اپنے اپنے تالاب سے پانی استعمال کرتا اور ایک قبیلہ دوسرے قبیلہ کے تالاب سے پانی نہ لیتا، اسی تفصیل کی طرف اشارہ فرمایا ہے مفسر علام نے اپنی تفسیری عبارت موضع شربھم الخ سے۔

قولہ: و قلنا آنے والے قول یعنی کلوا و اشربوا الخ کا قائل کون ہے اس میں دو احتمال ہیں۔ یا تو اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کے ذریعہ ان سے کہلوایا، یا خود حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا بر احتمال دوم یہاں قال ہونا چاہئے مگر حضرت مفسر نے تقدیری عبارت قلنا نکال کر پہلے احتمال کو راجح قرار دیا۔

قولہ: حال مؤکدۃ الخ یہ دفع دخل مقدر ہے، اس کا حاصل یہ ہے کہ لا تعثوا، عَثِیَ یَعْثٰی سے بنا ہے جس کا معنی ہے فساد کرنا لہٰذا لا تعثوا فی الارض کا معنی ہوا۔ زمین میں فساد نہ مچاؤ تو جب فساد کا معنی یہاں پالیا گیا پھر الگ لفظ مفسدین کے ذکر کی کیا ضرورت رہی؟ اس کا جواب مفسر علام نے دیا کہ مفسدین لا تعثوا کی ضمیر سے حال مؤکدہ ہے جس سے بنی اسرائیل کی بے وقوفی کا اظہار مقصود ہے، یعنی وہ اس قدر غبی ہیں کہ لا تعثوا فی الارض سے مقصد کلام نہ سمجھ سکیں گے اس لئے بطور تاکید مفسدین فرمایا تا کہ وہ اچھی طرح سمجھ لیں کہ فساد پھیلانے کی سخت ممانعت ہے۔

قولہ: ای نوع منہ یہ بھی ایک سوال کا جواب ہے اس کا ماحصل یہ ہے کہ بنی اسرائیل پر من اور سلوی دو کھانے اترتے تھے پھر انھوں نے لن نصبر علی طعام واحد کیوں کہا؟ جواب یہ ہے کہ اس سے مراد ایک قسم کا کھانا ہے کیونکہ بنی اسرائیل من کو روٹی کی طرح توے پر سینک کر سلویٰ کے ساتھ کھاتے تھے تو یہ ایسا ہی ہو گیا جیسے روزانہ گیہوں کی روٹی اور گوشت

کھایا جائے تو یہ ایک ہی قسم کا کھانا کہلائے گا نہ کہ دو کھانا یعنی واحد بالعدد مراد نہیں بلکہ واحد بالنوع مراد ہے۔ اس واقعہ کی قدرے تفصیل یہ ہے کہ جب بنی اسرائیل پر تیہ جیسے دشت پر خار میں جہاں خورد و نوش کا کوئی سامان موجود نہ تھا۔ من جانب اللہ من وسلویٰ اترنے لگا تو بنی اسرائیل شکر گزاری کی بجائے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے جھگڑنے لگے کہ آپ نے ہمیں مصر سے نکال کر اس وادی میں لا ڈالا جہاں من وسلویٰ کے سوا کچھ بھی نہیں ہم مصر میں زمین کی ہر قسم کی پیداوار کھاتے تھے مثلاً ساگ سبزی، ککڑی، گیہوں، مسور، پیاز، لہسن وغیرہ لہٰذا آپ اپنے رب سے کہئے کہ وہ اس جنگل میں ہمیں یہ چیزیں عطا کرے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اشارۃً انھیں اس طلب سے منع فرمایا مگر وہ نہ مانے، اس گستاخی پر وہ عذاب کے مستحق تھے مگر اللہ تعالیٰ نے درگزر فرمایا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی معرفت فرمادیا کہ اس جنگل کو طے کر کے کسی آبادی میں چلو وہاں تمہیں یہ سب چیزیں ملیں گی۔ (تفسیر فتح المنان)

قولہ: حنطتھا. یہاں آیت میں فومھا کی ایک دوسری قرأت ثومھا ہے جس کا معنی ہے لہسن، اس لئے فومھا کے معنی مراد میں مفسرین کا اختلاف ہو گیا، بعض علما نے اس سے لہسن مراد لیا ہے مگر جمہور کے نزدیک اس سے مراد گیہوں ہے اور مفسر قدس سرہ کے نزدیک چونکہ جمہور کا قول راجح ہے اس لئے فومھا کی تفسیر حنطتھا سے فرمائی۔

قولہ: والھمزۃ للانکار. اس سے اشارہ فرمایا کہ أتستبدلون میں ہمزہ استفہام کے لئے نہیں کیونکہ اللہ کی طرف سے استفہام (یعنی کسی چیز کی جانکاری چاہنا) محال ہے بلکہ وہ استفہام انکاری ہے جس سے مقصود زجر و توبیخ کرنا ہے، گویا ان سے کہا گیا کہ تم کس قدر احمق اور ناشکرے ہو کہ اعلیٰ کے بدلے ادنیٰ کی طلب کرتے ہو۔

قولہ: انزلوا. یہ اھبطوا کا ترجمہ ہے یہاں قدرے تفصیل یہ ہے کہ اھبطوا بنا ہے ھبوط سے جس کا معنی ہے اترنا، یہ لفظ وہاں بولا جاتا ہے جہاں اوپر سے نیچے اترنے کا معنی پایا جائے اور کبھی انتقال مکانی یعنی ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کے معنی میں بھی اس کا استعمال ہوتا ہے اور یہاں یہی معنی مراد ہے جس کے لئے اکثر اذھبوا کا لفظ آتا ہے مگر یہاں اذھبوا کی بجائے اھبطوا اس لئے فرمایا کہ میدان تیہ بلندی پر واقع ہے اور جہاں بنی اسرائیل کو بھیجا جا رہا تھا وہ شہر پستی میں تھا۔ مگر صحیح یہ ہے کہ یہاں اھبطوا سے ھبوط رتبی مراد ہے مکانی نہیں کہ جب مصر متعین مراد نہیں ہے تو یہ کہنا کہ وہ شہر پستی میں تھا درست نہیں۔

قولہ: من الامصار یہ قول جمہور کی طرف اشارہ ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ مصر خاص ایک شہر کا بھی نام ہے اور عام شہروں کو بھی کہا جاتا ہے۔ جیسے لفظ مدینہ ہر شہر کو بھی کہہ سکتے ہیں اور خاص ایک شہر کا نام بھی ہے۔ لہٰذا یہاں آیت میں لفظ مصر سے کس شہر کی طرف اشارہ ہے اس میں مفسرین کے چند اقوال ہیں۔ اوّل اس سے خاص فرعونی شہر مراد ہے اور مطلب یہ ہے کہ بنی اسرائیل کو حکم ہوا کہ تم جہاں سے آئے ہو وہیں واپس چلو، ثانی بعض علما فرماتے ہیں کہ اس سے وہی جگہ مراد ہے جہاں ان کو لے جانا منظور تھا یعنی اریحا۔ ثالث جمہور مفسرین کا قول یہ ہے کہ اس سے کوئی عام شہر مراد ہے اور مطلب یہ ہے کہ یہ چیزیں تم کو یہاں تو ملیں گی نہیں، کسی بستی میں چلے جاؤ۔

پہلا اور دوسرا قول ضعیف ہے، پہلا تو اس لئے کہ بنی اسرائیل کو حکم تھا: "ادخلوا الارض المقدسة التی کتب اللہ لکم و لاترتدوا علی ادبارکم" (مائدہ) یعنی جب تم مقدس زمین یعنی شام میں داخل ہو جو اللہ نے تم فرض کر دیا ہے تو پیچھے واپس نہ ہونا، لہٰذا جب انھیں واپسی سے منع کر دیا گیا تھا تو اب واپسی کا حکم کیوں دیا جا رہا ہے؟ دوسرا قول اس لئے ضعیف ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا۔ "فانها محرمة علیهم اربعین سنة یتیهون فی الارض" (مائدہ) یعنی وہ شہران پر چالیس سال کے لئے حرام کر دیا گیا اسی میدان میں حیران و پریشان پھریں گے۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد حضرت یوشع علیہ السلام کی قیادت میں بنی اسرائیل شہر اریحا میں داخل ہوئے جب کہ یہ واقعہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی شریف کا ہے لہٰذا اقوی اور راجح جمہور کا قول ہے یعنی یہ کہ اس سے کوئی عام شہر مراد ہے اور یہی قول مفسر علام نے بھی اختیار کیا ہے۔ (تفسیر نعیمی، ابن کثیر، تفسیر فتح المنان)

قوله: جعلت، ضربت کی تفسیر جعلت سے کر کے اشارہ فرمایا کہ ضربت بطور استعارہ بمعنی لزوم ہے آگے المسکنة کی تفسیر اثر الفقر سے کر کے اشارہ فرمایا کہ یہاں نفس فقر مراد نہیں بلکہ لازمہ فقر یعنی ذلت مراد ہے۔

قوله: و ان کانوا اغنیاء. یہ ایک شبہ کا ازالہ ہے شبہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ قرآن کریم کے مطابق اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر فقر و تنگ دستی مسلط کر دی، حالانکہ ان کا شمار دنیا کی امیر ترین اقوام میں ہوتا ہے، مفسر علام نے اس شبہ کا ازالہ کرتے ہوئے فرمایا کہ یہاں مراد اثر فقر کا باقی رہنا ہے یعنی اگر چہ وہ مالدار ہو جائیں مگر مقام احترام حاصل نہ کر سکیں گے اور ہمیشہ دنیا کی نظروں سے گرے رہیں گے اور یہی ذلت و رسوائی کی حقیقت ہے جو آج بھی بنی اسرائیل میں موجود ہے اور ہمیشہ موجود رہے گی علاوہ ازیں بنی اسرائیل کی اکثریت آج بھی مفلس ہے جیسا کہ علامہ کرم شاہ ازہری نے جیوش انسائیکلوپیڈیا کے حوالے سے نقل فرمایا کہ "گو یہود کا تمول ضرب المثل کی حد تک شہرت پا چکا ہے لیکن اہل تحقیق کا اتفاق ہے کہ یہود یورپ کے جس جس ملک میں آباد ہیں۔ وہاں کی آبادی میں انھیں کے مفلسوں کا تناسب بڑھا ہوا ہے۔ (تفسیر ضیاء القرآن)

قوله: لزوم الدرهم الخ. یہ عبارت مقلوب ہے اصل میں تھی لزوم السکة للدرهم المضروب، اور سکہ بحذف مضاف ہے یعنی اثر السکة، مطلب یہ ہے کہ جس طرح ٹکسالی سکہ کے لئے سرکاری مہر لازم ہے ایسے ہی یہودیوں پر ہمیشہ فقر و افلاس کا اثر رہے گا۔

قوله: ای ظلماً. یہ بغیر الحق کا مفہوم ہے یعنی انبیاء کا قتل بطور ظلم تھا وہ حضرات نہ شرعاً مستحق قتل تھے اور نہ ہی بظاہر کوئی سبب تھا، خیال رہے تمام انبیاء علیہم السلام کا قتل ظلماً ہی ہوا ہے اس لئے یہاں بغیر الحق کی قید احترازی نہیں بلکہ واقعی ہے اور اس قید واقعی سے یہ بتانا مقصود ہے کہ قتل انبیاء قاتلین کے اعتقاد میں بھی قتل ناحق اور ظلم ہوتا تھا اور وہ بھی اس قتل کی کوئی وجہ پیش نہیں کر سکتے تھے۔

مولوی نعیم دیوبندی پر تعقب:

دیوبند کے استاذ تفسیر مولوی نعیم دیوبندی نے اس مقام پر اپنے ترجمہ اور تحقیق میں چار فحش غلطیاں کی ہیں جنہیں دیکھنے کے بعد واضح ہوتا ہے کہ دارالعلوم دیوبند کے استاذ تفسیر کو نحو کی ابتدائی کتابیں بھی یاد نہیں بلکہ حروف جارہ کے متعلق بھی تفصیلی علم نہیں۔ لیجئے موصوف کے البیلے ترجمہ اور نادر تحقیق پر ایک نظر ڈالیے اور عش عش کیجئے۔

(۱) ایک تفسیری عبارت ''کرأس رجل'' کا ترجمہ کرتے ہیں ''آدمی کے سر کے برابر۔ (کمالین پارہ الم، ص ۴۷، مکتبہ تھانوی)

(۲) رخام او کذان کا ترجمہ کرتے ہیں ''سفید اور نرم'' (ایضاً ص ۴۷)

(۳) ضرب کلیم کے سبب جس پتھر سے پانی نکلا تھا اس کے متعلق اپنی تحقیق یوں پیش کرتے ہیں: ''ایک ہاتھ مربع یا اس سے کچھ کم ہوگا۔ (ایضاً)

(۴) ایک اور تحقیق پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں ''مصر سے مراد عام شہر ہے خاص ملک مصر مراد نہیں ہے'' آگے لکھتے ہیں ''اریحا'' ایک نشیبی اور شاداب علاقہ ہے۔ اسی لئے اھبطوا استعمال کیا گیا۔ (ایضاً ص ۷۵)

اب ترتیب وار آنجناب کے ترجمہ اور ان کی تحقیق کی برہنہ تصویر دیکھئے جس سے واضح ہوگا کہ ہمارہ مذکورہ بالا تبصرہ بے جا نہیں بلکہ واقع کے عین مطابق ہے۔

(۱) تفسیری عبارت "کرأس رجل" میں موصوف نے کاف کو مساوات کے لئے سمجھتے ہوئے ترجمہ کیا'' آدمی کے سر کے برابر'' یعنی وہ پتھر جس سے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پانی نکالا تھا وہ آدمی کے سر کے برابر تھا، یہاں موصوف کا ترجمہ بھی غلط ہے اور اس سے پیدا ہونے والا مفہوم بھی، ترجمہ تو اس لئے کہ کاف مساوات کے لئے آتا ہی نہیں، اس کی صرف دو قسمیں نحویوں نے بیان کی ہیں۔ (۱) تشبیہ کے لئے آتا ہے جیسے "زید کالاسد" (۲) زائد ہوتا ہے جیسے "لیس کمثلہ شئ" یہاں آیت میں کاف پہلے معنی میں ہے جسے دارالعلوم دیوبند کے استاذ تفسیر نہ سمجھ سکے اور ترجمہ ایسا کر دیا کہ کاف کی ایک تیسری قسم پیدا ہوگئی جس کا سرے سے کوئی وجود ہی نہیں۔

مفہوم اس لئے غلط ہے کہ یہ توجیہ القول بما لایرضی بہ القائل کے قبیل سے ہے، کیونکہ مفسر علام نے کاف تشبیہ سے یہ بتانا چاہا کہ پتھر آدمی کے سر کی طرح چوکور اور گولائی کی طرف مائل تھا، مگر موصوف یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ وہ آدمی کے سر کے برابر تھا۔

(۲) مولوی موصوف نے ''رخام'' کا ترجمہ کیا ہے ''سفید'' اور ''کذان'' کا ترجمہ کیا ہے ''نرم'' یہاں بھی مفہوم نہ سمجھ سکے تفسیری عبارت ہے ''رخام او کذان'' اس عبارت سے مفسر علام نے پتھر کی نوع کی طرف اشارہ کیا ہے کہ وہ پتھر رخام (سنگ مرمر) یا کذان (ایک قسم کا نرم پتھر) تھا چنانچہ المنجد، ص ۳۷۷ میں ہے ''الرخام'' سنگ مرمر، ایک ٹکڑا، معجم الوسیط میں ہے: "الکذان، حجارۃ فیھا رخاوۃ و ربما کانت نخرۃ" ایک نرم پتھر جو کبھی سخت بھی ہوتا ہے۔ مگر مولوی نعیم نے

رخام اور کذان سے رنگ اور کیف سمجھا۔

(۳) پتھر کے سائز کے متعلق موصوف کی تحقیق یہ ہے کہ وہ ایک ہاتھ مربع یا اس سے کچھ کم ہوگا جب کہ اس سے قبل ترجمہ میں لکھا کہ "آدمی کے سر کے برابر تھا" شاید دار العلوم دیوبند کے اساتذہ اور طلبہ کا سر ایک ہاتھ مربع یا اس سے کچھ کم ہوتا ہوگا۔

اس پتھر کا عینی شاہد پادری دین اسٹینلے جس نے انیسویں صدی کے وسط میں بائبل کے مقامات مقدسہ کی جغرافیائی تحقیق کے لئے خود فلسطین کی سیاحت کی ہے اپنا ذاتی مشاہدہ لکھتا ہے کہ "یہ چٹان دس اور پندرہ فٹ کے درمیان بلند ہے آگے کی طرف ذرا خمیدہ ہے اور آس سفصفہ کے قریب لیجا کی وسیع وادی میں واقع ہے۔ (بحوالہ تفسیر ضیاء القرآن)

(۴) موصوف نے اهبطوا مصرا کی توضیح میں لکھا مصر سے مراد عام شہر ہے یعنی مصر فرعون یا شہر اریحا مراد نہیں، پھر آگے لکھا اریحا ایک تشبیہی علاقہ ہے اسی لئے اهبطوا استعمال کیا گیا، یعنی مصر سے مراد اریحا ہے یہاں توضیح میں تضاد ہے کہ اولاً لکھا "مصر سے مراد عام شہر ہے" پھر اشارۃً لکھا "مصر سے مراد اریحا ہے" گویا اپنے ہی نشترِ قلم سے اپنی تحقیق کے پرخچے اڑا دیئے۔

مذکورہ تفصیلات سے واضح ہوا کہ مولوی نعیم دیوبندی نے جلالین کی شرح اصول تصنیف سے آزاد ہو کر محض ظن و تخمین اور وہم و قیاس کا جھوٹا سہارا لے کر لکھی ہے، مگر یہ جائے تعجب نہیں کہ عام طور سے دیوبندی شارحین کا یہی حال ہے کہ ان کے یہاں تحقیق کا کوئی معیار نہیں جو سمجھ میں آیا لکھ دیا جیسا چاہا کہہ دیا نہ دنیا میں رسوائی کا خوف نہ آخرت میں عذاب کا ڈر۔ العیاذ باللہ تعالیٰ۔

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ بِالْاَنْبِيَاءِ مِنْ قَبْلُ ﴿وَ الَّذِيْنَ هَادُوْا﴾ هُمُ الْيَهُوْدُ ﴿وَ النَّصٰرٰى وَ الصّٰبِئِيْنَ﴾ طَائِفَةٌ مِنَ الْيَهُوْدِ اَوِ النَّصَارٰى ﴿مَنْ اٰمَنَ﴾ مِنْهُمْ ﴿بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ﴾ فِيْ زَمَنِ نَبِيِّنَا ﴿وَ عَمِلَ صَالِحًا﴾ بِشَرِيْعَتِهٖ ﴿فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ﴾ اَيْ ثَوَابُ اَعْمَالِهِمْ ﴿عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝﴾ رُوْعِيَ فِيْ ضَمِيْرِ اٰمَنَ وَ عَمِلَ لَفْظُ مَنْ وَ فِيْمَا بَعْدَهٗ مَعْنَاهَا ﴿وَ﴾ اذْكُرُوْا ﴿اِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ﴾ عَهْدَكُمْ بِالْعَمَلِ بِمَا فِي التَّوْرَاةِ ﴿وَ﴾ قَدْ ﴿رَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ﴾ اَلْجَبَلَ اِقْتَلَعْنَاهُ مِنْ اَصْلِهٖ عَلَيْكُمْ لَمَّا اَبَيْتُمْ قَبُوْلَهَا وَ قُلْنَا ﴿خُذُوْا مَا اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ﴾ بِجِدٍّ وَّ اِجْتِهَادٍ ﴿وَ اذْكُرُوْا مَا فِيْهِ﴾ بِالْعَمَلِ بِهٖ ﴿لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝﴾ اَلنَّارَ اَوِ الْمَعَاصِيَ ﴿ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ﴾ اَعْرَضْتُمْ ﴿مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ﴾ اَلْمِيْثَاقِ عَنِ الطَّاعَةِ ﴿فَلَوْ لَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَ رَحْمَتُهٗ﴾ لَكُمْ بِالتَّوْبَةِ اَوْ تَاْخِيْرِ الْعَذَابِ ﴿لَكُنْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝﴾ اَلْهَالِكِيْنَ۔

ترجمہ: ﴿بے شک جو ایمان لائے﴾ انبیاء سابقین پر ﴿اور جو یہودی بنے﴾ یعنی قوم یہود ﴿یا عیسائی اور صابی ہوں﴾ (صابی) عیسائی یا یہود سے نکلا ہوا ایک فرقہ ہے ﴿جو کوئی بھی ایمان لائے﴾ ان میں سے ﴿اللہ پر اور قیامت کے دن پر﴾ ہمارے نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے زمانہ میں ﴿اور نیک عمل کرے﴾ حضور کی شریعت کے مطابق ﴿تو ان کے لئے ان کا اجر ہے﴾ یعنی ان کے اعمال کا ثواب ہے ﴿ان کے رب کے پاس اور نہ انھیں کچھ اندیشہ اور نہ کچھ غم﴾ آمن اور عمل کی

ضمیر میں لفظ مَن کی رعایت کی گئی ہے اور اس کے مابعد کی ضمیروں میں معنی مَن کی ﴿اور﴾ یاد کرو ﴿جب ہم نے تم سے عہد لیا﴾ توریت کے احکام پر عمل کرنے کا تم سے عہد لیا ﴿اور بلند کیا تم پر طور کو﴾ پہاڑ کو ہم نے جڑ سے اُکھاڑ کر تم پر معلق کر دیا جس وقت تم نے احکام توریت قبول کرنے سے انکار کر دیا، اور ہم نے فرمایا ﴿پکڑ لو جو کچھ ہم تم کو دیتے ہیں مضبوطی سے﴾ پوری کوشش سے ﴿اور اس کے مضمون یاد کرو﴾ اس پر عمل کر کے ﴿شاید کہ تم پرہیزگار بن جاؤ﴾ جہنم اور گناہوں سے بچ کر ﴿پھر تم نے منہ موڑ لیا﴾ تم پھر گئے ﴿اس کے بعد﴾ یعنی اطاعت کا پختہ وعدہ کرنے کے بعد ﴿تو اگر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت تم پر نہ ہوتی﴾ توبہ یا تاخیر عذاب کے ذریعہ ﴿تو تم ضرور ہو جاتے نقصان اٹھانے والوں میں﴾ ہلاک ہونے والوں میں۔

توضیح و تشریح: قوله بالانبیاء من قبل. اس عبارت سے اشارہ فرمایا کہ یہاں آیت میں الذین آمنوا سے وہ مومنین مراد ہیں جو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے حضرت عیسیٰ علیہ السلام یا ان سے پہلے کے انبیاء پر ایمان لائے جیسے بحیرا راہب، ابوذر غفاری، ورقہ بن نوفل، سلمان فارسی اور قس بن ساعدہ وغیرہم کہ یہ حضرات حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے اور انھیں کی شریعت پر قائم رہے یہاں تک کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا زمانہ پایا اور آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر بھی ایمان لائے۔ (صاوی)

قوله: طائفة من الیهود و النصاریٰ لفظ یہودی بنا ہے ہود سے جس کے معنی ہیں ”توبہ کرنا، رجوع کرنا“ چونکہ انھوں نے بچھڑے کی عبادت سے رجوع کر لیا تھا اور سخت توبہ کی تھی، اس لئے انھیں یہودی کہا گیا، یا یہ کہ ہود کا ایک معنی ہے مخبری کرنا، یہ بادشاہ وقت کو انبیاء کرام کی خبر دے کر انھیں شہید کراتے تھے، اس لئے یہودی نام ہوا، یا حضرت یعقوب علیہ السلام کے بڑے فرزند یہودا کی طرف منسوب ہونے کی وجہ سے یہودی کہلاتے ہیں۔ (روح البیان)

نصاریٰ، جمع ہے نصران کی جیسے سکاریٰ جمع ہے سکران کی اور یہ لفظ بنا ہے نصر سے جس کا معنی ہے مدد کرنا، عیسائیوں کو نصاریٰ اس لئے کہتے ہیں کہ یہ آپس میں ایک دوسرے کی مدد کرتے تھے، یا اس لئے کہ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا "من انصاری الی اللہ" میرا مددگار کون ہے؟ تو ان کے ساتھیوں نے عرض کیا "نحن انصار اللہ" ہم اللہ کے دین کے مددگار ہیں لہٰذا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اصحاب اور ان کے دین پر چلنے والوں کو نصاریٰ یا نصرانی کہا گیا، یا ناصرہ ایک بستی کا نام ہے جہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اکثر تشریف لایا کرتے تھے اور وہاں آپ کے اصحاب رہتے تھے لہٰذا اسی بستی کی طرف منسوب ہو کر نصاریٰ یا نصرانی کہلائے۔ (ابن کثیر و تفسیر نعیمی)

صابی کا لفظ صباء سے بنا ہے جس کا معنی ہے نکل جانا یہ یہود یا نصاریٰ کی ایک قسم ہے جو اپنے قدیم مذہب کو چھوڑ کر ستارہ پرست بن گئے تھے اس لئے انھیں صابی کہتے ہیں ان کے دین کی صحیح تحقیق نہیں اسی لئے مفسر علام نے طائفة الخ فرمایا۔

قوله: فی زمن نبینا یہ دفع دخل مقدر ہے، سوال یہ پیدا ہوا کہ ان الذین اٰمنوا اور پھر اٰمن باللہ و الیوم الاخر دونوں کا مفہوم ایک ہے پھر تخصیص بعد التعمیم کا فائدہ کیا ہے؟ حاصل جواب یہ ہے کہ ان الذین اٰمنوا سے مراد وہ لوگ ہیں جو حضور کی بعثت سے قبل انبیاء سابقین پر ایمان لائے اور دوسری آیت میں ان لوگوں کا ذکر ہے جو حضور صلی

اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد آپ پر ایمان لائے۔ لہٰذا دونوں آیتوں کے مصداق میں مغایرت ہے اور بے فائدہ تکرار نہیں۔ (ترویح الارواح ملخصاً)

قولہ: روعی فی ضمیر الخ یہ دفع دخل مقدر ہے اور اس قسم کا اعتراض و جواب پہلے بھی گزر چکا ہے یہاں عبارت کا حاصل یہ ہے کہ لفظ من چونکہ ذو وجہین ہے کہ لفظاً مفرد اور معنیً جمع ہے۔ لہٰذا اٰمن اور عمل میں من کی لفظی رعایت کی گئی ہے اور مابعد کی ضمیروں میں لفظ من کی معنوی رعایت کی گئی ہے۔ لہٰذا لفظ مَن کی طرف واحد اور جمع کی ضمیروں کے لوٹنے پر کوئی اشکال نہیں۔

قولہ: عہدکم بالعمل الخ. یہ ایک اور واقعہ کا بیان ہے جس کا خلاصہ کچھ اس طرح ہے، کہ بنی اسرائیل نے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بار بار ایک ایسی آسمانی کتاب کا مطالبہ کیا جس میں شریعت موسوی کے اصول اور طاعت و عبادت کے طریقے مذکور ہوں، تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل سے پختہ عہد و پیمان لیا کہ، جب آسمانی کتاب آجائے تو تم اسے قبول کرو گے اور اس میں مذکور احکام پر عمل کرو گے، سب اسرائیلیوں نے وعدہ کیا کہ وہ ہمیشہ اس پر عامل رہیں گے۔ مگر جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو توریت عطا ہوئی اور آپ نے قوم کو دکھایا تو انھوں نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا اور کہنے لگے کہ ہم سے اس پر عمل نہ ہو سکے گا، تب حضرت جبرئیل امین بحکم الٰہی کوہ طور کو اکھیڑ کر لائے اور ان کے سروں پر کھڑے ہو گئے، یہ پہاڑ قد آدم ان کے سروں سے اونچا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ توریت قبول کرلو ورنہ یہ پہاڑ تمہارے اوپر گرا دیا جائے گا۔" بنی اسرائیل گھبرا گئے اور فوراً سجدہ میں گر گئے مگر سجدہ پوری پیشانی پر نہ کیا بلکہ ایک رخسار پر کیا تا کہ پہاڑ کو بھی دیکھتے رہیں کہیں گر نہ جائے اسی لئے یہود آج تک ایک رخسار پر سجدہ کرتے ہیں۔ چنانچہ یہود جب سجدہ میں گئے اور توبہ کر کے آئندہ عمل کرتے رہنے کا پورا پورا عہد کیا، تو حضرت جبرئیل علیہ السلام نے بحکم الٰہی پہاڑ کو دوبارہ اس کی جگہ پر رکھ دیا، مگر خطرہ ٹلتے ہی بنی اسرائیل نے عہد و پیمان کو توڑ دیا اور پھر بدکاریوں میں مشغول ہو گئے۔ (تفسیر عزیزی ملخصاً)

قولہ: النار او المعاصی. اس عبارت سے حضرت مفسر نے اشارہ فرمایا کہ تتقون کا مفعول محذوف ہے۔ لہٰذا یہ تنزیل المتعدی بمنزلۃ الازم کے قبیل سے نہیں ساتھ ہی یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ آیت میں لعل برائے ترجی بنی اسرائیل کے لحاظ سے ہے لہٰذا یہ اعتراض نہیں کیا جا سکتا کہ ترجی کا معنی اللہ تعالیٰ کے حق میں محال ہے پھر یہاں لعلکم کیوں ارشاد ہوا۔

ایک شبہ کا ازالہ: یہاں ایک شبہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل سے زبردستی توریت منوائی گئی اور یہ اکراہ فی الدین ہوا حالانکہ دین میں اکراہ و جبر نہیں، ارشاد ہے لا اکراہ فی الدین (بقرۃ)

اس کے متعدد جوابات دیئے گئے ہیں عمدہ ترین دو جواب ہیں اولاً یہ کہ یہاں ظاہر میں جبر تھا مگر در حقیقت معجزہ دکھا کر ان کو مطمئن کرنا تھا کہ بے شک یہ کتاب رب کی طرف سے ہے۔ (خزائن العرفان)

ثانیاً یہ کہ لا اکراہ میں نفی اکراہ بندوں کے لئے ہے یعنی بندوں کو جائز نہیں کہ کسی کو دین پر مجبور کریں اور یہ فعل رب کا تھا بندوں کا نہیں۔ فلا اعتراض (تفسیر عزیزی)

مودودی صاحب کی احمقانہ تاویل:

ماضی قریب کے رسوائے زمانہ عالم جناب مودودی صاحب نے اس مقام پر "ورفعنا فوقکم الطور" کی توضیح میں آیت کے حقیقی معنی ومفہوم کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی احمقانہ تاویل اس طرح پیش کی ہے لکھتے ہیں: "پہاڑ کے دامن میں یثاق لیتے وقت ایسی خوفناک صورت حال پیدا کردی گئی تھی کہ ان کو ایسا معلوم ہوتا تھا گویا پہاڑ ان پر آپڑے گا۔ (تفہیم القرآن جلد اول ص ۸۳)

شاید مودودی صاحب نے قدرت خداوندی کو اپنی قدرت پر قیاس کیا ہوگا کہ جیسے آنجناب اور ان کی پوری لابی مل کر مچھر کا ایک پر بھی فضا میں معلق نہیں کر سکتے کہ یہ ان کے لئے محال ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کی قدرت سے کوہ طور کا فضا میں معلق ہو جانا آن جہانی کو محال نظر آیا، جس کی وجہ سے آیت کے ظاہری مفہوم سے ہٹ کر تاویل بے جا کرنے پر مجبور ہو گئے جب کہ مفسرین کا اس پر اتفاق ہے کہ اگر آیت کا ظاہر معنی مراد لینے میں کوئی شرعی قباحت نہ ہو تو اس کا ظاہری معنی ہی مراد لیا جائے گا اور تاویل جائز نہ ہوگی اس اجماع کے ہوتے ہوئے مذکورہ آیت میں بلا وجہ تاویل کرنا بلاشبہ مودودی صاحب کی حماقت ہے۔

﴿وَلَقَدْ﴾ لَامُ قَسَمٍ ﴿عَلِمْتُمْ﴾ عَرَفْتُمْ ﴿اَلَّذِيْنَ اعْتَدَوْا﴾ تَجَاوَزُوْ الْحَدَّ ﴿مِنكُمْ فِي السَّبْتِ﴾ بِصَيْدِ السَّمَكِ وَ قَدْ نَهَيْنَاكُمْ عَنْهُ وَ هُمْ اَهْلُ اِيْلَةَ ﴿فَقُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوا قِرَدَةً خَاسِئِيْنَ o﴾ مُبْعَدِيْنَ فَكَانُوْهَا وَ هَلَكُوْا بَعْدَ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ ﴿فَجَعَلْنَاهَا﴾ اَيْ تِلْكَ الْعُقُوْبَةَ ﴿نَكَالًا﴾ عِبْرَةً مَانِعَةً مِنْ اِرْتِكَابِ مِثْلِ مَا عَمِلُوْا ﴿لِمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَ مَا خَلْفَهَا﴾ اَيْ لِلْاُمَمِ الَّتِيْ فِيْ زَمَانِهَا وَ بَعْدَهَا ﴿وَ مَوْعِظَةً لِلْمُتَّقِيْنَ o﴾ اَللّٰهَ وَ خُصُّوا بِالذِّكْرِ لِاَنَّهُمُ الْمُنْتَفِعُوْنَ بِهَا بِخِلَافِ غَيْرِهِمْ.

ترجمہ: ﴿اور بے شک ضرور﴾ لقد میں لام قسمیہ ہے ﴿تمہیں معلوم ہے، جنھوں نے نافرمانی کی تھی﴾ حد سے تجاوز کیا تھا ﴿تم میں سے ہفتہ میں﴾ مچھلی کا شکار کر کے حالانکہ ہم نے تمہیں اس سے منع کیا تھا، اور وہ لوگ ایلہ کے باشندے تھے ﴿تو ہم نے ان سے کہا کہ ہو جاؤ بندر دھتکارے ہوئے﴾ راندے ہوئے تو وہ مسخ ہو گئے اور تین دن کے بعد ہلاک ہو گئے ﴿پس ہم نے بنادیا اس کو﴾ یعنی اس سزا کو ﴿عبرت﴾ ایسی عبرت جو ان لوگوں جیسا کام کرنے سے مانع ہو ﴿ان کے معاصرین کے لئے اور بعد میں آنے والوں کے لئے﴾ یعنی ان لوگوں کے لئے جو اس زمانہ میں موجود تھے اور جو بعد میں آنے والے تھے ﴿اور پرہیزگاروں کے لئے نصیحت﴾ پرہیزگاروں کی تخصیص اس لئے ہے کہ وہی لوگ اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں نہ کہ دوسرے لوگ۔

توضیح و تشریح: قولہ: لام قسم. اس عبارت سے مفسر علام نے قسم محذوف کی طرف اشارہ فرمایا ہے یعنی عبارت اصل میں یوں ہے و اللہ لقد اور آگے علم کی تفسیر معرفت سے اس لئے فرمائی کہ "علم" متعدی بدو مفعول ہوتا ہے

جبکہ ''معرفت'' متعدی بیک مفعول ہوتا ہے اور یہاں ایک ہی مفعول ہے لہٰذا ''علمتم'' بمعنی ''عرفتم'' ہے۔ علم اور معرفت میں دو طرح سے فرق کیا جاتا ہے (۱) ''علم'' ''ذات'' کی معرفت کے ساتھ ''حالت ذات'' کی معرفت کا نام ہے جب کہ ''معرفت'' محض ذات کی معرفت ہے۔ (۲) ''معرفت'' میں یہ ملحوظ ہوتا ہے کہ اس سے پہلے لاعلمی ہو جب کہ علم میں ایسا لحاظ نہیں ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ''معرفت'' کا اطلاق ذات باری تعالیٰ پر نہیں ہوتا ہے۔ (جمل)

قولہ، تجاوزوا الحد. اللہ تعالیٰ کی نافرمانی حد سے تجاوز کرنا ہے، اس لئے فعل ممنوع کے ارتکاب کو آیت میں اعتداء سے تعبیر کیا گیا جس کی تفسیر مفسر علام نے تجاوزوا الحد سے کی ہے، یہاں جس واقعہ کی یاددہانی مقصود ہے اس کی قدرے تفصیل تفسیر عزیزی وخزائن العرفان وغیرہ کی روشنی میں یہ ہے کہ ملک شام میں ساحل سمندر پر ''ایلہ'' نام کا ایک شہر واقع تھا جس میں بنی اسرائیل آباد تھے۔ بنی اسرائیل کو حکم تھا کہ سنیچر کا دن عبادت کے لئے خاص کردیں۔ اس دن شکار اور دنیاوی مشاغل ترک کریں، اہل ایلہ کے ایک گروہ نے یہ چال کی کہ جمعہ کے دن دریا کے کنارے کنارے بہت سے گڈھے کھودتے اور شنبہ کی صبح کو دریا سے ان گڈھوں تک نالیاں بناتے جن کے ذریعہ پانی کے ساتھ آکر مچھلیاں گڈھوں میں قید ہوجاتیں، اتوار کو انھیں نکال کر کھاتے اور کہتے کہ ہم مچھلی کو پانی سے سنیچر کے روز نہیں نکالتے ہیں۔

چالیس یا ستر سال تک یہی عمل رہا جب حضرت داؤد علیہ السلام کی نبوت کا عہد آیا تو آپ نے انھیں اس سے منع فرمایا کہ قید کرنا ہی شکار کرنا ہے۔ لہٰذا اس سے باز آجاؤ ورنہ عذاب میں گرفتار کئے جاؤ گے وہ باز نہ آئے تو آپ نے بددعا فرمائی اللہ تعالیٰ نے انھیں بندروں کی شکل میں مسخ فرمادیا اس طرح کہ ان کے عقل وحواس تو باقی رہے مگر قوت گویائی زائل ہوگئی اور بدن سے بدبو نکلنے لگی، اپنے اس حال پر روتے روتے تین روز میں سب ہلاک ہوگئے اور ان کی نسل باقی نہ رہی، یہ ستر ہزار کے قریب تھے۔

قولہ: مبعدین الخ یہ خاسئین کا ترجمہ ہے جو بنا ہے خساء سے اور جس کا اردو میں ترجمہ ہے ذلت اور دھتکار، یعنی وہ اللہ کی رحمت سے دور کر کے ذلت میں ڈال دیئے گئے، دراصل یہاں اس لفظ سے یہ بتانا مقصود ہے کہ وہ عام بندروں کی طرح صاف ستھرے بندر نہ بنائے گئے تھے بلکہ انتہائی قبیح اور دھتکارے ہوئے بندر بنائے گئے تھے کیونکہ ان کے جسم سے بدبو آتی تھی اور کوئی ان کو اپنے قریب نہیں آنے دیتا بلکہ ہر شخص انھیں دیکھ کر لعن طعن کرتا تھا۔

﴿وَ﴾ اذْكُرْ ﴿اِذْ قَالَ مُوسٰى لِقَوْمِهٖ﴾ وَ قَدْ قُتِلَ لَهُمْ قَتِيْلٌ لَا يُدْرٰى قَاتِلُهٗ وَ سَاَلُوْهُ اَنْ يَّدْعُوَ اللّٰهَ اَنْ يُّبَيِّنَهٗ لَهُمْ فَدَعَاهُ ﴿اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً قَالُوْا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا﴾ مَهْزُوًّا بِنَا حَيْثُ تُجِيْبُنَا بِمِثْلِ ذٰلِكَ ﴿قَالَ اَعُوْذُ﴾ اَمْتَنِعُ ﴿بِاللّٰهِ﴾ مِنْ ﴿اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ٥﴾ اَلْمُسْتَهْزِئِيْنَ فَلَمَّا عَلِمُوْا اَنَّهٗ عَزْمٌ ﴿قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَاهِيَ﴾ اَيْ مَاسِنُّهَا ﴿قَالَ﴾ مُوسٰى ﴿اِنَّهٗ﴾ اَيِ اللّٰهُ ﴿يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ﴾ مُسِنَّةٌ ﴿وَّ لَا بِكْرٌ﴾ صَغِيْرَةٌ ﴿عَوَانٌ﴾ نَصَفٌ ﴿بَيْنَ ذٰلِكَ﴾ اَلْمَذْكُوْرِ مِنَ السِّنَّيْنِ ﴿فَافْعَلُوْا مَا تُؤْمَرُوْنَ ٥﴾ بِهٖ مِنْ ذَبْحِهَا ﴿قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا لَوْنُهَا قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ

صَفْرَاءُ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا﴾ شَدِیْدُ الصُّفْرَةِ ﴿تَسُرُّ النّٰظِرِیْنَ ۝﴾ اِلَیْهَا بِحُسْنِهَا اَیْ تُعْجِبُهُمْ ﴿قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ یُبَیِّنْ لَّنَا مَا هِیَ﴾ اَسَائِمَةٌ اَمْ عَامِلَةٌ ﴿اِنَّ الْبَقَرَ﴾ اَیْ جِنْسَهُ الْمَنْعُوْتَ بِمَا ذُكِرَ ﴿تَشَابَهَ عَلَیْنَا﴾ لِكَثْرَتِهٖ فَلَمْ نَهْتَدِ اِلَی الْمَقْصُوْدَةِ ﴿وَ اِنَّا اِنْ شَاءَ اللّٰهُ لَمُهْتَدُوْنَ ۝﴾ اِلَیْهَا فِی الْحَدِیْثِ لَوْ لَمْ یَسْتَثْنُوْا لَمَا بُیِّنَتْ لَهُمْ اٰخِرَ الْاَبَدِ ﴿قَالَ اِنَّهٗ یَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُوْلٌ﴾ غَیْرُ مُذَلَّلَةٍ بِالْعَمَلِ ﴿تُثِیْرُ الْاَرْضَ﴾ تَقْلِبُهَا لِلزِّرَاعَةِ وَ الْجُمْلَةُ صِفَةُ ذَلُوْلٍ دَاخِلَةٌ فِی النَّفْیِ ﴿وَ لَا تَسْقِی الْحَرْثَ﴾ اَلْاَرْضَ الْمُهَیَّئَةَ لِلزَّرْعِ ﴿مُسَلَّمَةٌ﴾ مِنَ الْعُیُوْبِ وَ اٰثَارِ الْعَمَلِ ﴿لَّا شِیَةَ﴾ لَوْنَ ﴿فِیْهَا﴾ غَیْرَ لَوْنِهَا ﴿قَالُوا الْئٰنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ﴾ نَطَقْتَ بِالْبَیَانِ التَّامِّ فَطَلَبُوْهَا فَوَجَدُوْهَا عِنْدَ الْفَتَی الْبَارِّ بِاُمِّهٖ فَاشْتَرَوْهَا بِمِلْءِ مَسْكِهَا ذَهَبًا ﴿فَذَبَحُوْهَا وَ مَا كَادُوْا یَفْعَلُوْنَ ۝﴾ لِغَلَاءِ ثَمَنِهَا وَ فِی الْحَدِیْثِ لَوْ ذَبَحُوْا اَیَّ بَقَرَةٍ كَانَتْ لَاَجْزَأَتْهُمْ وَ لٰكِنْ شَدَّدُوْا عَلٰی اَنْفُسِهِمْ فَشَدَّدَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ.

حل اللغات: ﴿القتیل﴾ [مذکر و مؤنث] مقتول جمع قَتْلٰی، قُتَلَاء، قَتَالٰی ﴿لا یدری﴾ لا پتہ [افعال] ﴿سألوه﴾ انھوں نے ان سے درخواست کی [ف] ﴿ان یبینه﴾ کہ وہ اسے واضح کر دے [تفعیل] ﴿مهزوا بنا﴾ ہمیں سامانِ تمسخر بناتے ہیں۔ ﴿المستهزئین﴾ ٹھٹھا کرنے والے ﴿العزم﴾ پختہ ارادہ ﴿مسنة﴾ بہت برسوں والی ﴿تعجبهم﴾ وہ انھیں اچھی لگے ﴿سائمة﴾ چراگاہوں میں چرنے والی ﴿عاملة﴾ کام کرنے والی ﴿المنعوت﴾ جس کا وصف بیان کر دیا جائے۔ ﴿لو لم یستثنوا﴾ اگر وہ انشاء اللہ نہ کہتے ﴿المهیئة للزرع﴾ کھیتی کے لئے تیار کی ہوئی ﴿الفتی﴾ نوجوان، سخی جمع فِتیان ﴿البار بامه﴾ ماں کا فرماں بردار ﴿المسك﴾ کھال جمع مُسُك و مسوك ﴿الغلاء﴾ گرانی۔

ترجمہ: ﴿اور﴾ یاد کرو ﴿جب موسیٰ نے اپنی قوم سے فرمایا﴾ جس وقت کہ ان میں سے کسی ایک کو قتل کر دیا گیا تھا اور اس کا قاتل لاپتہ تھا، لوگوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے عرض کی کہ اللہ سے دعا کریں کہ وہ اسے ظاہر فرما دے، تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دعا فرمائی ﴿خدا تمھیں حکم دیتا ہے کہ ایک گائے ذبح کرو، وہ بولے کیا آپ ہمارا مذاق اڑاتے ہیں﴾ ہمیں سامان تفریح بنا رہے ہیں اس طرح کا [بے جوڑ] جواب دے کر ﴿فرمایا میں پناہ مانگتا ہوں﴾ حفاظت چاہتا ہوں ﴿خدا کی﴾ اس سے ﴿کہ میں شامل ہو جاؤں جاہلوں میں﴾ مذاق کرنے والوں میں، تو جب لوگوں کو یقین ہو گیا کہ آپ حق فرما رہے ہیں۔ ﴿بولے اپنے رب سے دعا کیجئے کہ وہ ہمیں بتا دے کہ کیسی ہے وہ گائے﴾ یعنی کس عمر کی: ﴿فرمایا﴾ موسیٰ علیہ السلام نے ﴿بے شک وہ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ ﴿فرماتا ہے کہ وہ ایک گائے ہے جو نہ بوڑھی﴾ عمر رسیدہ ﴿اور نہ بالکل بچھیا﴾ بہت کم عمر ﴿بلکہ ان دونوں کے بیچ میں ہے﴾ یعنی مذکورہ دونوں عمروں کے بیچ ﴿تو کرو جس کا تمھیں حکم ہوتا ہے﴾ یعنی اس کے ذبح کا ﴿بولے اپنے رب سے دعا کیجئے ہمیں بتا دے اس کا رنگ کیسا ہو، موسیٰ نے کہا وہ فرماتا ہے وہ ایک زرد گائے ہو جس کی رنگت خوب گہری ہو﴾ خوب زرد ہو ﴿دیکھنے والوں کو فرحت بخشے﴾ دیکھنے والے کو اپنے حسن سے خوش کر دے یعنی اچھی لگے ﴿بولے اپنے رب سے دعا کیجئے کہ ہمارے لئے صاف بیان کر دے وہ گائے کیسی ہو﴾ صرف چرائی پر رہنے والی ہو یا

کھیتی باڑی کا کام کرنے والی ہو۔ ﴿بے شک گائے ﴾ یعنی اس کی جنس جس کے اوصاف بتلائے گئے ﴿ہم پر مشتبہ ہوگئی ہے﴾ اپنی کثرت کی وجہ سے۔ لہٰذا ہم مقصود تک نہیں پہنچ سکے ﴿اور اگر اللہ نے چاہا تو ہم راہ پا جائیں گے﴾ اس مطلوبہ کی جانب۔ حدیث میں ہے کہ اگر وہ انشاء اللہ نہ کہتے تو انہیں کبھی واضح بات نہ بتائی جاتی ﴿موسیٰ بولے اللہ فرماتا ہے وہ ایک گائے ہے جس سے خدمت نہیں لی جاتی﴾ کسی کام کے ذریعہ خدمت نہیں لی گئی ﴿کہ زمین جوتے﴾ کھیتی کے لئے زمین جوتی ہو اور جملہ (تثیر الارض) ذلول کی صفت ہے اور منفی ہے ﴿اور نہ کھیتی کو پانی دے﴾ یعنی اس زمین کو جو کاشت کے لئے تیار کی گئی ہو ﴿صحیح سالم ہے﴾ عیوب اور محنت کے آثار سے ﴿داغ نہیں ہے﴾ کوئی اور رنگ ﴿اس میں﴾ اس کے رنگ کے علاوہ ﴿بولے اب آپ لائے صحیح پتہ﴾ آپ نے پوری وضاحت کے ساتھ بتایا۔ چنانچہ انھوں نے گائے تلاش کی تو اسے ماں کے فرمانبردار ایک نوجوان کے پاس پایا اور اسے اس کی کھال بھر سونا کے عوض خرید لیا ﴿تو اسے ذبح کیا اور ذبح کرتے معلوم نہ ہوتے تھے﴾ اس کی گرانی کی وجہ سے اور حدیث میں ہے کہ ابتداءً کوئی بھی گائے ذبح کردیتے تو وہ ان کے لئے کافی ہوتی لیکن انھوں نے خود اپنے اوپر سختی کی تو اللہ نے بھی ان پر سختی فرمائی۔

توضیح و تشریح: و قد قتل لهم قتيل الخ یہ ایک خاص واقعہ کی طرف اشارہ ہے جس کا بیان یہاں منظور ہے واقعہ کا حاصل یہ ہے کہ بنی اسرائیل میں عامیل نامی ایک مالدار شخص تھا، اس کے چچازاد بھائی نے وراثت حاصل کرنے کے لئے اسے قتل کردیا اور اس کی لاش اٹھا کر دوسری بستی کے کسی دروازے پر ڈال دیا، صبح ہوئی تو خود ہی مدعی بن بیٹھا، لوگوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے درخواست کی کہ آپ دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ حقیقت حال ظاہر فرمادے اس پر حکم ہوا کہ ایک گائے ذبح کر کے اس کے کسی حصہ سے مقتول کو ماریں وہ زندہ ہوکر قاتل کو بتادے گا۔ (خزائن العرفان)

خیال رہے کہ بقر کے لغوی معنی ہیں "چیرنا پھاڑنا" لہٰذا گائے کو اس لئے بقرۃ کہتے ہیں کہ اس کا نر زمین کو کاشت کے لئے پھاڑتا ہے، یہاں آیت میں بقرۃ جنس ہے جو مذکر اور مؤنث دونوں کو شامل ہے اور فرق وصف کے ذریعہ ہوتا ہے یعنی مؤنث کو بقرۃ انثی اور مذکر کو بقرہ ذکر کہا جاتا ہے اس صورت میں بقرۃ کی تا وحدت کے لئے ہے، مگر ایک قول یہ بھی ہے کہ بقرۃ کی تا تانیث کے لئے ہے اور عربی میں مؤنث کے لئے بقرہ اور مذکر کے لئے لفظ ثور بولا جاتا ہے۔ اور یہاں آیت میں اکثر مفسرین کے نزدیک بقرہ سے گائے مراد ہے۔ کیونکہ اس کے لئے مؤنث کی ضمیریں "هى" "إنها" اور صیغے "تسر" "تثير" وغیرہ استعمال ہوا ہے۔

قوله: مهزوا ابنا الخ اس تفسیر سے حضرت مفسر نے اشارہ فرمایا کہ آیت میں لفظ هزو امصدر بمعنی اسم مفعول ہے گویا یہاں اہل معاملہ نے یہ کہنا چاہا کہ آپ ہم کو سامان دل لگی بنا کر مذاق کررہے ہیں" اور ایسا انھوں نے اس لئے کہا کہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آئی تھی کیونکہ جواب سوال کے مطابق نہ تھا، وہ آئے تھے قاتل کا پتہ لگانے کی درخواست لے کر اور حکم ہو رہا تھا گائے ذبح کرنے کا۔

قوله: ما سنها. ما هى کی تفسیر ما سنها سے کر کے اشارہ فرمایا کہ "ما" اگرچہ شی کی حقیقت و ماہیت دریافت

کرنے کے لئے آتا ہے مگر یہ قاعدہ اکثریہ ہے کلیہ نہیں، لہٰذا یہاں "ما" بمعنی کیف ہے جس سے گائے کے اوصاف دریافت کرنا مقصود ہے حقیقت نہیں کہ گائے کی حقیقت تو اسرائیلیوں کو معلوم ہی تھی۔

قوله: مسنة. یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ "فارض" فرضت البقرة سے اسم فاعل ہے اور "فرضت البقرة" اس وقت بولا جاتا ہے جب کہ وہ سن رسیدہ ہوگئی ہو۔ اور جب فعل اکثر یا عموماً بطور مؤنث استعمال ہو تو اسم فاعل مذکر کا صیغہ بھی مؤنث کے لئے بولا جاتا ہے۔ جیسے حائض، مرضع وغیرہ، لہٰذا بقرہ کے لئے فارض بولنا صحیح ہے۔

قوله: غیر مذللة. یہ بھی ایک سوال کا جواب ہے۔ سوال یہ ہے کہ آیت میں "لا ذلول" بقرة کی صفت واقع ہے حالانکہ حرف نہ صفت واقع ہوسکتا ہے اور نہ صفت کا جز لہٰذا لا ذلول کا صفت واقع ہونا درست نہیں کہ حرف لا جز ہے ذلول کا۔ جواب یہ ہے کہ یہاں لا بمعنی غیر ہے فلا اعتراض علیه (ترویح الارواح)

قوله: والجملة صفة ذلول الخ یہ آیت کی ترکیب نحوی کی طرف اشارہ ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ یہاں جملہ "تثیر الارض" ذلول کی صفت اول ہے اور چونکہ موصوف منفی ہے۔ لہٰذا یہ جملہ بھی تحت نفی ہوگا گویا یوں کہا گیا، لیست مذللة لعمل و لامثیرة للارض" (نہ کسی خدمت سے ذلیل کی گئی اور نہ اس سے زمین جوتی گئی)

خیال رہے یہاں دوسری دو ترکیبیں اور ہیں اولاً یہ کہ بقرة موصوف ہو اور لا ذلول صفت اول، تثیر الارض، صفت ثانیہ اور تسقی الحرث صفت ثالثہ ہو۔ ثانیاً یہ کہ لاذلول بقرة کی صفت اول ہو اور تثیر الارض ذلول کی ضمیر سے حال واقع ہو اس تقدیر پر یہ جملہ محل نصب میں ہوگا اور تقدیری عبارت یوں ہوگی۔ و لاتذل فی حال اثارتها

قوله: نطقت بالبیان التام الخ یہ دفع دخل مقدر ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ آیت کے ظاہری مفہوم سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسرائیلی جو حجت بازیاں کر رہے تھے کافر تھے کیونکہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جھوٹا تصور کرتے رہے اور اب انھیں سچا تسلیم کیا، ظاہر ہے کہ نبی کو جھوٹا سمجھنے والا کافر ہی ہوگا۔ جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ یہاں حق، باطل کے مقابلے میں نہیں، یعنی بنی اسرائیل نے جو کچھ کہا اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ابھی تک جھوٹا خیال کرتے تھے اور اب سچا، بلکہ اس سے واضح اور تسلی بخش بات مراد ہے اور بنی اسرائیل نے یہ کہنا چاہا کہ اب ہم نے آپ کی بات مکمل طور پہ سمجھ لی۔

فوائد نافعه (۱) قاتل کا پتہ لگانے کے لئے گائے کو ذبح کرنے کا حکم اس لئے آیا کہ بنی اسرائیل ایک لمبے عرصہ تک بت پرستوں کے درمیان رہے تھے جہاں گائے کی پرستش بھی ہوتی تھی اس لئے بنی اسرائیل کے دل میں کسی قدر گائے کی عظمت موجود تھی لہٰذا ان کی عقیدت توڑنے اور باطل معبود کی حقارت کے لئے گائے ذبح کرنے کا حکم ہوا۔ (۲) گائے کے متعلق سخت احکام آنے کی وجہ یہ تھی کہ بنی اسرائیل نے گائے ذبح کرنے کا حکم سن کر بلا وجہ کٹھ حجتی شروع کردی تھی تو اللہ تعالیٰ نے بطور سزا احکام میں سختی پیدا فرمادی۔ (۳) آیت میں بقرة سے گائے مراد ہے نہ کہ بیل، قرینہ یہ ہے کہ بقرة کی طرف لوٹنے والی ساری ضمیریں مؤنث کی ہیں۔

﴿وَ اِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ﴾ فِيْهِ اِدْغَامُ التَّاءِ فِي الْاَصْلِ فِي الدَّالِ اَيْ تَخَاصَمْتُمْ وَ تَدَافَعْتُمْ

﴿فِيهَا وَ اللّٰهُ مُخْرِجٌ﴾ مُظْهِرٌ ﴿مَّا كُنتُمْ تَكْتُمُونَ ٥﴾ مِنْ اَمْرِهَا وَ هٰذَا اِعْتِرَاضٌ وَ هُوَ اَوَّلُ الْقِصَّةِ ﴿فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ﴾ اَيِ الْقَتِيْلَ ﴿بِبَعْضِهَا﴾ فَضُرِبَ بِلِسَانِهَا اَوْ عَجْبِ ذَنَبِهَا فَحَيِيَ وَ قَالَ قَتَلَنِي فُلَانٌ وَ فُلَانٌ لِابْنَيْ عَمِّهِ وَ مَاتَ فَحُرِمَا الْمِيْرَاثَ وَ قُتِلَا قَالَ تَعَالٰى ﴿كَذٰلِكَ﴾ اَلْاِحْيَاءِ ﴿يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى وَ يُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ﴾ دَلَائِلَ قُدْرَتِهٖ ﴿لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ٥﴾ تَتَدَبَّرُوْنَ فَتَعْلَمُوْنَ اَنَّ الْقَادِرَ عَلٰى اِحْيَاءِ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ قَادِرٌ عَلٰى اِحْيَاءِ نُفُوْسٍ كَثِيْرَةٍ فَتُؤْمِنُوْنَ ﴿ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ﴾ اَيُّهَا الْيَهُوْدُ صَلُبَتْ عَنْ قَبُوْلِ الْحَقِّ ﴿مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ﴾ الْمَذْكُوْرِ مِنْ اِحْيَاءِ الْقَتِيْلِ وَ مَا قَبْلَهٗ مِنَ الْاٰيَاتِ ﴿فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ﴾ فِي الْقَسْوَةِ ﴿اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً﴾ مِنْهَا ﴿وَ اِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ وَ اِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ﴾ فِيْهِ اِدْغَامُ التَّاءِ فِي الْاَصْلِ فِي الشِّيْنِ ﴿فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَاءُ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ﴾ يَنْزِلُ مِنْ عُلُوٍّ اِلٰى سُفْلٍ ﴿مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ﴾ وَ قُلُوْبُكُمْ لَا تَتَأَثَّرُ وَ لَا تَلِيْنُ وَ لَا تَخْشَعُ ﴿وَ مَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ﴾ وَ اِنَّمَا يُؤَخِّرُكُمْ لِوَقْتِكُمْ وَ فِيْ قِرَاءَةٍ بِالتَّحْتَانِيَةِ وَ فِيْهِ اِلْتِفَاتٌ عَنِ الْخِطَابِ.

ترجمہ: ﴿اور جب تم نے ایک خون کیا تو ایک دوسرے پر اس کی تہمت ڈالنے لگے﴾ فادارء تم میں تفاعل کی تا کو دال سے بدل کر دال کو دال میں ادغام کر دیا گیا معنی ہے، تم ایک دوسرے سے جھگڑنے اور ایک دوسرے سے دفع کرنے لگے۔ ﴿اور اللہ کو ظاہر کرنا تھا جو تم چھپاتے تھے﴾ قتل کا معاملہ اور یہ جملہ معترضہ ہے اور و اذقتلتم الخ قصہ کا ابتدائی حصہ ہے ﴿تو ہم نے فرمایا کہ مارو اس کو﴾ یعنی مقتول کو ﴿گائے کے کسی ٹکڑے سے﴾ تو مارا اس کی زبان یا دم کی جڑ سے چنانچہ وہ زندہ ہو گیا اور بولا کہ فلاں فلاں چچا زاد بھائیوں نے مجھے قتل کیا ہے اور پھر مر گیا تو ان دونوں کو میراث سے محروم کر کے قصاصاً قتل کر دیا گیا، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ﴿یوں ہی﴾ زندہ کرنے کی طرح ﴿زندہ کرتا ہے اللہ تعالیٰ مردوں کو اور دکھاتا ہے تمہیں اپنی نشانیاں﴾ اپنی قدرت کے دلائل ﴿شاید تم سمجھ جاؤ﴾ غور و فکر کر کے سمجھ جاؤ کہ جو ایک جان زندہ کرنے پر قادر ہے وہ سب جانوں کے زندہ کرنے پر بھی قادر ہے لہٰذا تم ایمان لے آؤ ﴿پھر سخت ہو گئے تمہارے دل﴾ اے یہودیو! قبول حق کے قابل نہیں رہے ﴿یہ منظر دیکھنے کے بعد﴾ جو مذکور ہوا یعنی مقتول کو زندہ کرنا اور اس سے پہلے کی نشانیاں ﴿تو وہ پتھر کی طرح ہیں﴾ سختی میں ﴿بلکہ زیادہ سخت ہیں﴾ اس سے بھی ﴿اور پتھروں میں تو کچھ وہ ہیں جن سے نہریں بہہ نکلتی ہیں اور کچھ وہ ہیں جو پھٹ جاتے ہیں﴾ یشقق میں تفعل کی تا کو شین سے بدل کر شین کو شین میں ادغام کر دیا گیا ہے۔ ﴿تو ان سے پانی نکلتا ہے اور کچھ وہ ہیں جو گر پڑتے ہیں﴾ اوپر سے نیچے کی جانب ﴿خوف الٰہی سے﴾ اور تمہارے دل ہیں جو نہ متاثر ہوتے ہیں نہ نرم ہوتے ہیں، نہ ڈرتے ہیں ﴿اور اللہ تمہارے کرتوت سے بے خبر نہیں﴾ البتہ تمہیں تمہاری موت تک ڈھیل دے رکھی ہے اور ایک قراءت میں یعلمون ہے اس صورت میں غیبت سے خطاب کی طرف التفات ہوگا۔

توضیح و تشریح: قولہ: فیہ ادغام التاء الخ یہ آیت میں مذکور صیغہ "فادارء تم" میں جاری صرفی قاعدہ اور اس صیغہ میں موجود خاصیت کی طرف اشارہ ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ "ادارء تم" اصل میں تدارأتم" بروزن تفاعلتم

تھا، ابدال کے مشہور صرفی قاعدہ کے تحت تا کو دال سے بدل کر دال کو دال میں ادغام کر دیا، ابتداء بالسکون محال ہونے کی وجہ سے شروع میں ہمزۂ وصل لے آئے "ادار أتـــم" ہو گیا، اس میں تفاعل کی خاصیت "تشارک" ہے جسے مفسر علام نے اسی تخاصمتم و تدافعتم کہہ کر ظاہر کیا ہے۔

قولہ: وھو اول القصة یہاں سے یہ بتانا مقصود ہے کہ مذکورہ واقعہ دو حصوں میں منقسم ہے پہلے حصہ میں ذبح بقرہ اور دوسرے میں احیاء موتی کا بیان ہے مگر پہلا حصہ بعد میں اور آخری حصہ پہلے مذکور ہوا، ایسا اس لئے ہے کہ گائے ذبح کرنے کا واقعہ بتانا ہی اصل مقصود تھا کہ اس سے عقیدۂ توحید کو راسخ کرنا اور اسرائیلیوں کے دلوں سے بچھڑے کی محبت زائل کرنا منظور تھا جبکہ واقعہ کے آخری حصہ سے بعث بعد الموت پر دلیل قائم کرنا منظور ہے۔ اور ظاہر ہے حیات بعد الموت کا عقیدہ عقیدۂ توحید کی فرع ہے لہٰذا اصل کو بیان میں مقدم رکھا اور فرع کو مؤخر۔

قولہ: فتؤمنون — اس میں یہ اشارہ ہے کہ بنو اسرائیل ہر چند بعث بعد الموت پر یقین رکھتے تھے لیکن ان کا یہ یقین بطور استدلال تھا اس واقعہ سے اس امر پر ان کا یقین مشاہدہ کے سبب اور بڑھ گیا جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے عرض کیا تھا "و لکن لیطمئن قلبی"

قولہ: صلبت عن قبول الحق یہ اشارہ اس امر کی طرف ہے کہ آیت میں قسوۃ کی نسبت قلوب کی طرف بطور مجاز ہے اور کفار کے قلوب کو تشبیہ دی گئی ہے پتھر سے سختی و درشتی میں، علت مشترکہ عدم تلین و قبول اثر ہے، اور اس میں استعارہ بالکنایہ ہے۔

قولہ: منھا — یہ اشارہ ہے مفضل علیہ کی ضمیر محذوف کی طرف، جس سے در اصل اس اشکال کا جواب دینا مقصود ہے کہ لفظ "اشد" صفت ہے "قلوب" کی قلوب جمع ہے اور اشد واحد، لہٰذا موصوف اور صفت میں مطابقت نہ رہی، جواب کا حاصل یہ ہے کہ اسم تفضیل جب من کے ساتھ استعمال ہوتا ہے تو اس میں واحد اور جمع برابر ہوتا ہے۔ کما تقرر فی النحو اور یہاں اسم تفضیل من کے ساتھ مستعمل ہے لہٰذا اس کا قلوب کی صفت واقع ہونا صحیح ہے۔ (ترویح الارواح)

قولہ: و قلوبکم لاتتأثر الخ اس تفسیر سے اشارہ فرمایا کہ آیت میں لفظ خشیہ مجازاً بمعنی انقیاد ہے، لہٰذا یہاں اس اعتراض کی گنجائش نہیں کہ خشیت بغیر عقل کے ممکن نہیں اور پتھر لا یعقل ہوتا ہے لہٰذا اس سے خشیت متصور نہیں پھر اس کی طرف خشیت کی نسبت کیوں کی گئی، یا یہ اشارہ ہے کہ خشیت معنی حقیقی میں ہے اور اللہ نے ان پتھروں میں بھی قوت تمیز پیدا کی ہے۔ جیسا کہ ان کے لئے دوسری آیت "لو انزلنا ھذ القرآن علی جبل لرأیته خاشعاً متصدعا من خشیة اللہ" میں خشیت اور یونہی ایک آیت سے تسبیح بھی ثابت ہے۔

قولہ: و فی قراءۃ الخ اس عبارت سے اختلاف قراءۃ اور آیت میں موجود ایک نکتہ کی طرف اشارہ ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ یہاں تعلمون میں دوسری قرأت یعلمون ہے اس صورت میں یہاں التفات کا نکتہ پایا گیا یعنی ماقبل کے تمام صیغے خطاب کے ہیں مگر یہاں مقتضائے ظاہر کے خلاف کلام کا رخ خطاب سے غیبت کی طرف پھیر دیا گیا افادۂ عموم کے لئے،

اسے علم معانی میں التفات کہتے ہیں۔

ایک شبہ کا ازالہ: یہاں ایک شبہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے قاتل کے خلاف صرف مقتول کے بیان پر اکتفاء کرتے ہوئے قاتل پر شرعی حکم نافذ کر دیا، حالانکہ مقدمات میں شرعاً دو گواہ کی ضرورت ہوتی ہے جیسا کہ قرآن پاک میں ہے، اشهدوا ذوی عدل منكم. (یوسف) تم میں سے دو عادل گواہی دیں۔

اس شبہ کے چند جوابات ہیں اولاً یہ کہ بعض مفسرین نے فرمایا ہے کہ مقتول کی نشاندہی کے بعد قاتل نے اقرار جرم بھی کر لیا تھا اور مجرم کے اقرار کے بعد دو گواہوں کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ ثانیاً جو خبر یا گواہی نبی کے معجزہ کی بنا پر ہو۔ وہ ایک ہی کی قبول ہوتی ہے جیسے حضرت یوسف علیہ السلام کی پاکدامنی کی گواہی صرف ایک شیر خوار بچے نے دی اور وہ مقبول بھی ہوئی ارشاد ہے و شهد شاهد من اهلها (یوسف) ثالثاً ہر نبی کی حیثیت چونکہ قانون ساز کی ہوتی ہے اور انھیں اختیار ہوتا ہے کہ جس حکم کو چاہیں اور جس کے لئے چاہیں خاص کر سکتے ہیں، لہٰذا یہ اس مقتول شخص کی خصوصیت تھی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تنہا اسی کے بیان پر اکتفا کرتے ہوئے شرعی حکم نافذ فرما دیا جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا من شهد له خزيمة او شهد عليه فحسبه (بخاری) خزیمہ کسی کے موافق یا مخالف گواہی دیں تو ان کی تنہا گواہی کافی ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

﴿اَفَتَطْمَعُوْنَ﴾ اَيُّهَا الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿اَنْ يُّؤْمِنُوْا﴾ اَيِ الْيَهُوْدُ ﴿لَكُمْ وَ قَدْ كَانَ فَرِيْقٌ﴾ طَائِفَةٌ ﴿مِنْهُمْ﴾ اَحْبَارُهُمْ ﴿يَسْمَعُوْنَ كَلَامَ اللّٰهِ﴾ فِيْ التَّوْرَاةِ ﴿ثُمَّ يُحَرِّفُوْنَهٗ﴾ يُغَيِّرُوْنَهٗ ﴿مِنْ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ﴾ فَهِمُوْهُ ﴿وَ هُمْ يَعْلَمُوْنَ ٥﴾ اَنَّهُمْ مُفْتَرُوْنَ وَ الْهَمْزَةُ لِلْاِنْكَارِ اَيْ لَا تَطْمَعُوْ فَلَهُمْ سَابِقَةٌ فِيْ الْكُفْرِ ﴿وَ اِذَا لَقُوْا﴾ اَيْ مُنَافِقُوا الْيَهُوْدِ ﴿الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْا اٰمَنَّا﴾ بِاَنَّ مُحَمَّدًا نَبِيٌّ وَهُوَ الْمُبَشَّرُ بِهٖ فِيْ كِتَابِنَا ﴿وَ اِذَا خَلَا﴾ رَجَعَ ﴿بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ قَالُوْا﴾ اَيْ رُؤَسَائُهُمُ الَّذِيْنَ لَمْ يُنَافِقُوْا لِمَنْ نَافَقَ ﴿اَتُحَدِّثُوْنَهُمْ﴾ اَيِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ﴾ اَيْ عَرَّفَكُمْ فِيْ التَّوْرَاةِ مِنْ نَعْتِ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ﴿لِيُحَاجُّوْكُمْ﴾ لِيُخَاصِمُوْكُمْ وَ اللَّامُ لِلصَّيْرُوْرَةِ ﴿بِهٖ عِنْدَ رَبِّكُمْ﴾ فِيْ الْاٰخِرَةِ وَ يُقِيْمُوْا عَلَيْكُمُ الْحُجَّةَ فِيْ تَرْكِ اِتِّبَاعِهٖ مَعَ عِلْمِكُمْ بِصِدْقِهٖ ﴿اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ٥﴾ اَنَّهُمْ يُحَاجُّوْنَكُمْ اِذَا حَدَّثْتُمُوْهُمْ فَتَنْتَهُوْا قَالَ تَعَالٰى ﴿اَوَ لَا يَعْلَمُوْنَ﴾ الْاِسْتِفْهَامُ لِلتَّقْرِيْرِ وَ الْوَاوُ الدَّاخِلَةُ عَلَيْهَا لِلْعَطْفِ ﴿اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَ مَا يُعْلِنُوْنَ ٥﴾ مَا يُخْفُوْنَ وَ مَا يُظْهِرُوْنَ مِنْ ذٰلِكَ وَغَيْرِهٖ فَيَرْعَوُوْا عَنْ ذٰلِكَ.

ترجمہ: ﴿کیا تم یہ امید رکھتے ہو﴾ اے مسلمانو! ﴿کہ ایمان لائیں گے﴾ یعنی یہودی ﴿تمہارے کہنے سے حالانکہ ایک گروہ ان میں سے ایسا تھا﴾ یعنی ان کے علما ﴿جو سنتا تھا کلام الٰہی کو﴾ توریت میں ﴿پھر بدل دیتا تھا اسے﴾ اسے تبدیل کر دیتے تھے۔ ﴿خوب سمجھ لینے کے بعد جان بوجھ کر﴾ کہ وہ افتراء پردازی کر رہے ہیں اور ہمزہ استفہام انکاری کے لئے ہے یعنی تم امید نہ رکھو کیونکہ انھیں کفر میں اولیت حاصل ہے۔ ﴿اور جب ملتے ہیں﴾ یہودی منافقین ﴿ایمان والوں سے تو کہتے ہیں ہم ایمان لائے﴾ کہ محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نبی ہیں اور یہی ہیں وہ جن کی بشارت ہماری کتاب میں دی گئی ہے۔

﴿اور جب تنہا ملتے ہیں ایک دوسرے سے تو کہتے ہیں﴾ یعنی ان کے غیر منافق روسا منافقین یہودیوں سے ﴿کیا بیان کردیتے ہو ان سے﴾ یعنی مؤمنین سے ﴿وہ علم جو اللہ نے تم پر کھولا﴾ یعنی تمہیں معرفت دے دی ہے توریت کے ذریعہ محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے اوصاف کی ﴿تاکہ وہ تم پر دلیل قائم کریں﴾ تاکہ تم سے جھگڑیں اور لام صیرورۃ کے لئے ہے یعنی وہ آخرت میں تمہارے رب کے سامنے جھگڑیں گے اور تم پر حجت قائم کردیں گے کہ تم نے ان کی صداقت جاننے کے باوجود ان کی پیروی نہیں کی ﴿کیا تم سمجھتے نہیں﴾ کہ وہ تمہیں پر حجت قائم کردیں گے جب تم ان سے بیان کردو گے، لہٰذا تم باز آجاؤ (بیان کرنے سے) اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿کیا وہ نہیں جانتے﴾ یہاں استفہام تقریر کے لئے ہے اور اس پر داخل شدہ واؤ عاطفہ ہے۔ ﴿کہ اللہ جانتا ہے جو کچھ وہ چھپاتے ہیں اور جو کچھ ظاہر کرتے ہیں﴾ جو کچھ پوشیدہ رکھتے ہیں اور جو کچھ ظاہر رکھتے ہیں اس سے [حضور کے اوصاف] اور اس کے علاوہ تو اس سے انھیں باز آنا چاہئے۔

توضیح و تشریح: قوله: ايها المؤمنون. یہ ازالہ ہے ماقبل سے پیدا ہونے والے وہم کا چونکہ ماقبل میں خطاب یہود سے تھا اس لئے یہاں یہ وہم پیدا ہو سکتا تھا کہ خطاب یہود سے ہے۔ لہٰذا ايها المؤمنون سے اس وہم کو دور کیا۔

قوله: احبارهم. احبار جمع ہے حبر کی یہودی عالم کو کہتے ہیں۔ آیت میں لفظ فریق سے مراد علمائے یہود ہیں ابتداءً اور خصوصیت کے ساتھ انھیں کا ذکر اس لئے کیا گیا کہ یہودیوں کی ساری خرابیوں کی جڑ یہی تھے۔

قوله: يغيرونه. یعنی علمائے یہود توریت کے احکام میں ردوبدل کرتے رہتے تھے اور حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے اوصاف میں بھی تبدیلی کردی تھی اور احکام توریت میں بھی۔

قوله: و الهمزة للانكار — مفسر علام نے اس عبارت سے اشارہ فرمایا ہے کہ أفتطمعون میں ہمزۂ استفہام انکاری ہے۔ اصل میں فـأتـطـمـعـون تھا چونکہ ہمزۂ استفہام صدارت کلام کو چاہتا ہے اس لئے ہمزہ کو "ف" پر مقدم کردیا گیا۔ یہی جمہور کا مذہب ہے، خیال رہے ہمزۂ استفہام صرف تین حروف یعنی واؤ، فا، ثم پر ہی داخل ہوتا ہے۔

قوله: فلهم سابقة بالكفر. یہ استبعاد ایمان کی علت کی طرف اشارہ ہے کہ قول باری تعالیٰ "و قد كان فريق الخ" کا حاصل یہ ہے کہ اس سے قبل یہ کام کرچکے ہیں تو ان سے یہ فعل کچھ مستبعد نہیں معلوم ہونا چاہئے۔

قوله: رجع. خلا کی تفسیر رجع سے کرنے میں اس شبہ کا ازالہ مقصود ہے کہ خلا کا صلہ "الی" نہیں آتا مگر آیت کریمہ "اذا خلا بعضهم الى بعض" میں خلا کا صلہ الی آیا ہے۔ حاصل ازالہ یہ ہے کہ یہاں خلا رجع کے معنی کو متضمن ہے، لہٰذا اس کا صلہ الی لانا درست ہے۔

قوله: و اللام للصيرورة. یعنی ليحاجوكم میں لام صیرورت کا ہے۔ جسے لام معاقبہ اور لام مآل بھی کہتے ہیں جو اس پر دلالت کرتا ہے کہ اس کے مجرور کا حصول، فعل مذکور کے بعد ہو جیسے لزم الشر للشقاوة میں لام صیرورت کا ہے تو جملے کا معنی ہوا کہ اس نے بدعملی کا التزام کیا تو اس کے بعد بدنصیبی حاصل ہوئی، اسی طرح یہاں آیت کا معنی یہ ہوگا کہ اے منافقو! تمہاری اس خبر دینے کا انجام یہ ہوگا کہ مسلمان اسی کے ذریعہ تم پر حجت قائم کریں گے یا تم پر غالب آجائیں گے۔

قولہ: فی الآخرۃ الخ یہ قول راجح کی طرف اشارہ ہے چونکہ عند ربکم کے معنی میں علمانے تردد کیا ہے، بعض نے عند کو فی کے معنی میں لیا ہے۔ بعض نے ربکم سے پہلے لفظ کتاب پوشیدہ مانا ہے، بعض نے حکم پوشیدہ مانا اور بعض نے عند کو اعتقاد کے معنی میں لیا ہے، مگر صحیح اور راجح یہ ہے کہ عند اپنے ہی معنی میں ہے اور آیت کا معنی ہے کہ ''قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے سامنے مسلمان تم پر حجت قائم کریں گے کہ تم نے اسلام کی حقانیت کو جانتے ہوئے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی اتباع سے گریز کیا ہے۔ اسی توجیہ کی طرف حضرت مفسر نے اشارہ فرمایا ہے۔

قولہ: الاستفهام للتقرير الخ اس عبارت سے یہ بتانا مقصود ہے کہ یہاں ہمزۂ استفہام تقریر کے لئے ہے جس سے زجر وتوبیخ مقصود ہے اور واؤ عاطفہ ہے جسے ہمزہ سے پہلے ہونا چاہئے تھا مگر ہمزہ چونکہ صدارت کلام چاہتا ہے اس لئے اسے واؤ پر مقدم کر دیا گیا، تقدیری عبارت یوں ہوگی۔ أيلومونهم و لا يعلمون

فائدہ: (۱) تحریف کا لغوی معنی ہے، ہٹادینا اور مائل کر دینا، اور اصطلاح میں کسی بات کو اصل معنی ومفہوم سے پھیر کر اپنی خواہش کے مطابق کچھ دوسرے معنی پہنادینا جو قائل کی منشاء کے خلاف ہو تحریف ہے۔

(۲) افتراء اس جھوٹ کو کہتے ہیں جس کے جھوٹ ہونے میں کوئی شک نہ ہو۔

﴿وَ مِنۡهُمۡ﴾ اَیِ الۡیَهُوۡدِ ﴿اُمِّیُّوۡنَ﴾ عَوَامٌ ﴿لَا یَعۡلَمُوۡنَ الۡکِتٰبَ﴾ اَلتَّوۡرَاةَ ﴿اِلَّا﴾ لٰکِنۡ ﴿اَمَانِیَّ﴾ اَکَاذِیۡبَ تَلَقَّوۡهَا مِنۡ رُؤَسَائِهِمۡ فَاعۡتَمَدُوۡهَا ﴿وَ اِنۡ﴾ مَا ﴿هُمۡ﴾ فِیۡ جَحۡدِ نُبُوَّةِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیۡهِ وَسَلَّمَ وَغَیۡرِهٖ مِمَّا یَخۡتَلِقُوۡنَهٗ ﴿اِلَّا یَظُنُّوۡنَ﴾ ظَنًّا وَ لَا عِلۡمَ لَهُمۡ ﴿فَوَیۡلٌ﴾ شِدَّةُ عَذَابٍ ﴿لِلَّذِیۡنَ یَکۡتُبُوۡنَ الۡکِتٰبَ بِاَیۡدِیۡهِمۡ﴾ اَیۡ مُخۡتَلَقًا مِنۡ عِنۡدِهِمۡ ﴿ثُمَّ یَقُوۡلُوۡنَ هٰذَا مِنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ لِیَشۡتَرُوۡا بِهٖ ثَمَنًا قَلِیۡلًا﴾ مِنَ الدُّنۡیَا وَ هُمُ الۡیَهُوۡدُ غَیَّرُوۡا صِفَةَ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیۡهِ وَسَلَّمَ فِی التَّوۡرَاةِ وَ اٰیَةَ الرَّجۡمِ وَغَیۡرَهَا وَ کَتَبُوۡهَا عَلٰی خِلَافِ مَا اُنۡزِلَ ﴿فَوَیۡلٌ لَّهُمۡ مِّمَّا کَتَبَتۡ اَیۡدِیۡهِمۡ﴾ مِنَ الۡمُخۡتَلَقِ ﴿وَ وَیۡلٌ لَّهُمۡ مِّمَّا یَکۡسِبُوۡنَ۝﴾ مِنَ الرُّشٰی.

ترجمہ: ﴿اور ان میں کچھ﴾ یعنی یہود میں ﴿ان پڑھ ہیں﴾ یعنی عوام ﴿جو کتاب کو نہیں جانتے﴾ یعنی توریت کو ﴿مگر﴾ سوائے ﴿جھوٹی امیدوں کے﴾ من گھڑت خیالات جو انھوں نے اپنے بڑوں سے حاصل کیا اور اسی پر اعتماد کر بیٹھے ﴿اور نہیں ہیں وہ﴾ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی نبوت کے انکار اور اپنے دوسرے من گھڑت خیالات میں ﴿مگر نرے گمان میں﴾ محض وہم وگمان میں ہیں انھیں اس کا کوئی علم نہیں ﴿تو خرابی ہے﴾ شدت کا عذاب ﴿ان کے لئے جو کتاب اپنے ہاتھ سے لکھیں﴾ یعنی اپنی طرف سے گڑھ کر ﴿پھر کہہ دیں یہ خدا کے پاس سے ہے کہ اس کے عوض تھوڑے دام حاصل کریں﴾ دنیا سے اور وہ یہود ہیں جنھوں نے توریت میں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے اوصاف اور آیت رجم وغیرہ کو تبدیل کر کے خلاف اصل باتیں لکھ دیں ﴿تو خرابی ہے ان کے لئے ان کے ہاتھوں کے لکھے سے﴾ من گھڑت لکھنے کی وجہ سے ﴿اور خرابی ان کے لئے اس مال کی وجہ سے جو وہ کماتے ہیں﴾ بطور رشوت۔

توضیح و تشریح: قوله: عوام. مفسر علام نے اس لفظ سے آیت میں لفظ امیون کے مصداق کی طرف اشارہ فرمایا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ امیون جمع ہے امی کی اور امی بنا ہے اُمّ سے جس کا لغوی معنی ہے اصل، ماں کو اسی لئے اُمّ کہتے ہیں کہ وہ اپنے بچوں کی اصل ہوتی ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو امی کہتے ہیں کہ آپ ساری کائنات کی اصل ہیں پھر لفظ امی بے پڑھے لکھے آدمی کو کہا جانے لگا کیونکہ وہ جیسے ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا اسی حال میں رہ گیا۔ یعنی ان پڑھ یہاں آیت میں امیون سے یہود کی چوتھی اور آخری جماعت یعنی ان پڑھ لوگ مراد ہیں چونکہ عوام کی اکثریت ان پڑھ ہوتی ہے اس لئے مفسر علیہ الرحمہ نے امیون کی تفسیر لفظ عوام سے فرمائی ہے۔

قوله: لکن. یہاں لفظ اِلّا کے بعد لٰکن ظاہر فرما کر حضرت مفسر اشارہ فرما رہے ہیں کہ آیت میں استثناء منقطع ہے کیونکہ امانی جو بمعنی اکاذیب (باطل خیالات) ہے کتاب کی جنس سے نہیں۔

خیال رہے امانی جمع ہے امنیۃ کی جس کے چند معانی ہیں، ایسی چیز جس کی تمنا کی جائے، پڑھی ہوئی چیز، جھوٹے خیالات، یہاں آیت میں آخری معنی مراد ہے۔ (صاوی)

قوله: اعتمدوها. یعنی ان پڑھ یہودیوں نے اپنے رؤساء اور علما کے بتائے ہوئے خیالات باطلہ پر بلا تحقیق اور علم صحیح کے اعتماد کر لیا تھا چنانچہ ان کے اوہام و خیالات سے بعض یہ ہیں۔ (۱) ہم خدا کے لاڈلے اور اس کے محبوب ہیں۔ لہٰذا ہمارا گناہ معاف ہے (۲) ہمارے باپ دادا انبیاء تھے، ان کو قدرت ہے کہ بغیر مرضی خدا ہم کو دوزخ سے چھڑا لیں گے۔ (۳) یہود کو اگر عذاب بھی ہو تو چند روز کا ہوگا یعنی سات یا چالیس دن۔ (۴) نبوت کا استحقاق ہمارے خاندان کو حاصل ہے، کسی اور خاندان کا شخص نبی نہیں ہو سکتا۔ (فتح المنان)

قوله: ماهم — اِنْ کی تفسیر ما سے کر کے اشارہ فرمایا کہ یہاں ان شرطیہ نہیں بلکہ نافیہ ہے، لہٰذا یہ اعتراض نہیں کیا جا سکتا کہ ان مختص ہے فعل کے ساتھ پھر یہاں اسم ضمیر پر کیوں داخل ہوا؟

قوله: شدة عذاب. یہ لفظ ویل کا انتہائی جامع معنی ہے جو حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی تفسیر کے عین مطابق ہے۔ چنانچہ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ویل ایک دردناک عذاب کا نام ہے۔ (تفسیر کبیر)

خیال رہے ویل کا لغوی معنی ہے، خرابی وخواری اور اس لفظ کو اہل عرب اظہار ناراضگی کے مواقع پر بولتے ہیں مگر قرآن شریف میں وارد شدہ لفظ ویل کی مختلف تفسیریں آئی ہیں مثلاً بعض روایات میں ہے کہ ویل جہنم میں آگ کا ایک پہاڑ ہے جو مجرموں پر گر کر ان کا جسم پاش پاش کر دے گا۔ اور بعض میں ہے کہ ویل جہنم میں ایک گہرا غار ہے جس میں مجرمین ڈالے جائیں گے، بعض روایات میں ہے کہ ویل جہنم میں ایک نہایت گرم پتھر ہے جس پر مجرموں کو چڑھایا جائے گا اور اتارا جائے گا، بعض میں ہے کہ ویل ایک ندی ہے جس میں جہنمیوں کا خون اور پیپ بہتا ہوگا اور مجرموں کو وہی پلایا جائے گا، بعض روایات میں ہے کہ ویل جہنم میں ایک کنواں کا نام ہے، جس میں کافر ڈالے جائیں گے تو چالیس سال تک اس کی تہہ تک نہ پہنچیں گے۔
(تفسیر نعیمی و تفسیر کبیر و تفسیر عزیزی)

مگر حضرت مفسر قدس سرہ نے ویل کا جو معنی بیان کیا ہے وہ مذکورہ تمامی روایات کو جامع ہے، وہ اس طرح کہ ویل کا معنی ہے سخت عذاب، مگر قیامت میں اس کا ظہور مختلف طرح سے ہوگا، جیسا مجرم ویسا اس کے لئے ویل، مثلاً محرفین علما کا ویل آگ کا پہاڑ، متکبرین کا ویل غار، ظالموں کا ویل گرم پتھر، شرابیوں کا ویل خون اور پیپ کی ندی اور کافروں کا ویل جہنم کا کواں ہوگا۔ (عزیزی)

تعلیم قرآن ودیگر اعمال صالحہ پر اجرت:

بعض علما نے یہاں آیت کریمہ "لیشتروا به ثمنا قلیلا" کے تحت تعلیم قرآن وغیرہ پر اجرت لینے اور دینے کا مسئلہ اٹھایا ہے، جلالین کے دیوبندی شارحین نے بھی اس مقام پر بڑی گل افشانیاں کی ہیں، لہٰذا مناسب ہے کہ یہاں اس مسئلہ کے تعلق سے اہلسنت وجماعت کا موقف بیان کردیا جائے۔ اس سلسلہ میں اگرچہ متقدمین ومتاخرین علمائے احناف کا اختلاف ہے کہ متقدمین نے تعلیم قرآن اور فقہ وحدیث وغیرہ کی تعلیم وتدریس پر اجرت لینے کو ناجائز لکھا ہے، مگر متاخرین نے ضرورۃً اسے جائز قرار دیا ہے اور اب فتوٰی اسی پر ہے کہ دینی تعلیم دینے والے معلمین اور امام وموذن اسی طرح مقرر ومبلغ کے لئے اجرت لینا جائز ہے دم کرنے اور تعویذ لکھنے کا بھی یہی حکم ہے۔

علامہ مرغینانی حنفی تحریر فرماتے ہیں:

و بعض مشائخنا استحسنوا الاستیجار علی تعلیم القرآن الیوم لانه ظهر التوانی فی الامور الدینیه ففی الامتناع یضیع حفظ القرآن و علیه الفتوٰی

ہمارے بعض مشائخ نے دور حاضر میں تعلیم قرآن پر اجرت لینے کو استحسان دلیل سے جائز کہا ہے، کیونکہ اب دینی امور میں سستی ہونے لگی لہٰذا بچنے میں قرآن مجید کو حفظ کرنا ضائع ہوجائے گا، اور فتوٰی اسی قول پر ہے۔ (ہدایہ آخرین، ص ۳۰۳ مطبوعہ اشرفی بکڈپو دیوبند)

علامہ خوارزمی حنفی لکھتے ہیں:

و کذا یفتی بجواز الاجارة علی تعلیم الفقه و قال الامام الخیز اخزی فی زماننا یجوز للامام و المؤذن و المعلم اخذ الاجرة کذا فی الروضة.

اسی طرح تعلیم فقہ پر بھی اجرت کے جواز کا فتوٰی ہے اور امام خیزاخزی نے کہا ہے کہ ہمارے زمانہ میں امام، موذن اور معلم کے لئے اجرت لینا جائز ہے، اسی طرح روضہ میں ہے۔ (کفایہ علی ہامش فتح القدیر جلد ۹ ص ۱۰۰، پوربندر گجرات)

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

و یفتی الیوم بصحتها لتعلیم القرآن و الفقه و الامامة و الاذان و یجبر المستاجر علی دفع ما

اس زمانہ میں تعلیم قرآن، تعلیم فقہ، امامت اور اذان پر اجرت لینے کے جواز کا فتوٰی ہے اور اجرت پر رکھنے والے کو طے شدہ

قیل۔ اجرت دینے پر مجبور کیا جائے گا۔

(درمختار علی ہامش ردالمحتار جلد ۹ ص ۷۶، مکتبہ ذکریا، دیوبند)

مذکورہ فقہی عبارات سے واضح ہے کہ تعلیم قرآن اور دیگر دینی خدمات پر اجرت لینا جائز ہے، مگر خیال رہے کہ دینی خدمات پر اجرت لینے والوں کو اخروی اجر اس وقت ملے گا جب ان خدمات کی پیشگی اجرت مقرر نہ کی جائے بلکہ اجرت لینے کے لئے کسی شرعی حیلے کا سہارا لیا جائے اور دینی خدمت محض رضائے مولیٰ کی نیت سے کی جائے مثلاً معلم، امام اور موذن وغیرہ مسجد یا مدرسہ کو اپنا جو وقت دیتے ہیں اس وقت کی پابندی کے بدلہ میں اجرت لیں اور نفس تعلیم وامامت اور نفس اذان کی اجرت لینے کی نیت نہ کریں اسی طرح مقررین ومبلغین حضرات پروگرام میں آنے جانے میں اپنا جو وقت دیتے ہیں یا تقریر وتبلیغ کے لئے اپنا جو وقت صرف کرتے ہیں اس کے عوض میں اجرت لیں نفس تقریر وتبلیغ پر اجرت لینے کی نیت نہ کریں تو یہ حضرات آخرت میں ثواب کے مستحق ہوں گے ورنہ نہیں، تفصیل کے لئے بہار شریعت وغیرہ کی طرف رجوع کریں۔

﴿وَ قَالُوْا﴾ لَمَّا وَعَدَهُمُ النَّبِيُّ النَّارَ ﴿لَنْ تَمَسَّنَا﴾ تُصِيْبَنَا ﴿النَّارُ اِلَّا اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً﴾ قَلِيْلَةً اَرْبَعِيْنَ يَوْمًا مُدَّةَ عِبَادَةِ اٰبَائِهِمُ الْعِجْلَ ثُمَّ تَزُوْلُ ﴿قُلْ﴾ لَهُمْ يَا مُحَمَّدُ ﴿اَتَّخَذْتُمْ﴾ حُذِفَ مِنْهُ هَمْزَةُ الْوَصْلِ اِسْتِغْنَاءً بِهَمْزَةِ الْاِسْتِفْهَامِ ﴿عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا﴾ مِيْثَاقًا مِنْهُ بِذٰلِكَ ﴿فَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗ﴾ بِهِ لَا ﴿اَمْ﴾ بَلْ ﴿تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ○ بَلٰى﴾ تَمَسُّكُمْ وَ تَخْلُدُوْنَ فِيْهَا ﴿مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً﴾ شِرْكًا ﴿وَ اَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْئَتُهٗ﴾ بِالْاِفْرَادِ وَ الْجَمْعِ اَيِ اسْتَوْلَتْ عَلَيْهِ وَ اَحْدَقَتْ بِهٖ مِنْ كُلِّ جَانِبٍ بِاَنْ مَاتَ مُشْرِكًا ﴿فَاُولٰٓئِكَ اَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خَالِدُوْنَ ○﴾ رُوْعِيَ فِيْهِ مَعْنٰى مَنْ ﴿وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ○﴾

ترجمہ: ﴿اور انھوں نے کہا﴾ جب حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے انھیں جہنم سے ڈرایا ﴿ہمیں تو ہرگز نہ چھوئے گی﴾ ہمیں نہ پہنچے گی ﴿آگ مگر گنتی کے چند دن﴾ تھوڑے عرصہ یعنی چالیس دن جتنی مدت ان کے آباء واجداد نے بچھڑے کی پرستش کی پھر آگ ہٹالی جائے گی ﴿آپ ان سے فرمائیے﴾ اے محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ﴿کیا لے رکھا ہے تم نے﴾ یہاں (اَتَّخَذْتُمْ میں) ہمزۂ وصل حذف کر دیا گیا کیونکہ ہمزۂ استفہام کی وجہ سے اس کی ضرورت نہ رہی ﴿اللہ سے کوئی وعدہ﴾ اس کے متعلق اللہ سے کوئی معاہدہ کر رکھا ہے ﴿جب تو اللہ ہرگز اپنے وعدہ کی خلاف ورزی نہ کرے گا﴾ ایسا نہیں ہے ﴿بلکہ تم خدا پر وہ بات کہتے ہو جس کا تمہیں علم نہیں، ہاں کیوں نہیں﴾ نار جہنم تمہیں چھوئے گی اور تم ہمیشہ اس میں رہو گے۔ ﴿جس نے جان کر برائی کی﴾ یعنی شرک کیا ﴿اور گھیر لیا اس کو اس کی خطا نے﴾ یہاں خطیئۃ مفرد اور خطایا جمع کے ساتھ۔ (دونوں قراءتیں ہیں) معنی ہے برائی اس پر غالب آجائے اور اس کو ہر جانب سے گھیر لے اس طرح کہ وہ مشرک ہی مرے ﴿تو وہی دوزخی ہے اسے ہمیشہ اس میں رہنا ہے﴾ ھم ضمیر لانے میں مَنْ کے معنی کی رعایت کی گئی ہے۔ ﴿اور جو ایمان لائے اور اچھے کام کئے وہ جنت والے ہیں انھیں ہمیشہ اس میں رہنا ہے﴾

توضیح و تشریح: قولہ قلیلة اربعین یوما الخ مفسر علام نے لفظ قلیلة کے ذریعہ معدودة کا لازمی معنی بیان کیا ہے کیونکہ معدودة وہ ہے جس کا شمار کرنا آسان ہو، اور قلیل کی شان یہ ہے کہ وہ آسانی سے شمار میں آجائے گویا معدودة اور قلیلة لازم وملزوم ہیں لہٰذا معدودة کی تفسیر قلیلة سے تفسیر باللازم ہوا۔ آگے قلیلة کی توضیح اربعین یوماً کے ذریعہ دراصل ترجیح بین الاقوال ہے کیونکہ ایاما معدودة کے معنی مراد میں علما کا اختلاف ہے بعض نے کہا کہ اس سے مراد سات دن ہیں کیونکہ ایام جمع قلت ہے جو دس تک بولی جا سکتی ہے اور یہود سات دن اس لئے کہتے تھے کہ دنیا کی زندگی سات ہزار سال ہے اور قیامت کا ایک دن ایک ہزار برس کے مقابلہ میں ہے اس حساب سے ہم کو سات دن آگ پہنچے گی، بعض علما نے فرمایا کہ اس سے مراد چالیس سال ہے جس قدر کہ وہ میدان تیہ میں پریشان رہے، یہود کہتے تھے کہ جہنم کے دو کناروں میں چالیس سال کا فاصلہ ہے جب ہم جہنم میں جائیں گے تو وہاں ٹھہریں گے نہیں بلکہ اپنے آباء واجداد کی شفاعت سے گزرتے رہیں گے اور چالیس برس میں اس فاصلہ کو طے کرلیں گے، بعض نے کہا کہ اس سے چالیس دن مراد ہیں کیونکہ اسی قدر انھوں نے بچھڑے کی پوجا کی تھی اور ایام اگرچہ جمع قلت ہے مگر مجازاً دس سے زیادہ پر بولا جاتا ہے۔ مفسر علام کے نزدیک آخری قول پسندیدہ ہے اس لئے اسی کو بیان فرمایا۔

قولہ: حذف منه همزة الوصل. یہ اس وہم کا ازالہ ہے کہ باب افتعال میں ہمزہ وصل مکسور ہونا چاہئے مگر یہاں مفتوح ہے، حاصل ازالہ یہ ہے کہ "اتخذتم" میں ہمزہ وصل کا نہیں بلکہ ہمزۂ استفہام ہے، اور ابتداء بالسکون متعذر ہونے کی وجہ سے ہمزۂ وصل آیا تھا پھر جب ہمزۂ استفہام آیا تو ابتداء بالسکون لازم نہ آیا لہٰذا ہمزۂ وصل حذف کر دیا گیا۔

قولہ: بل. یہ اشارہ ہے ام کے منقطعہ ہونے کی طرف جس سے رد مقصود ہے ان علما کا جنھوں نے اسے متصل کہا ہے، وجہ رد یہ ہے کہ ام منقطعہ کی علامت یہ ہے کہ اس کے بعد جملہ ہوتا ہے اور یہاں ام کے بعد چونکہ جملہ ہے، لہٰذا یہ منقطعہ ہے۔

(ترویح الارواح)

قولہ: ای استولت علیه الخ یہ بھی ایک اشکال کا جواب ہے، اشکال یہ پیدا ہوا کہ احاطہ کرنا اور گھیرنا اجسام کی صفت ہے اور گناہ ایک معنوی چیز ہے لہٰذا گناہ کی طرف احاطہ کرنے کی نسبت درست نہیں، مفسر علام نے ای استولت سے اس کا جواب دیا جس کا حاصل یہ ہے کہ یہاں آیت میں استعارہ تبعیہ ہے یعنی گناہ کو تشبیہ دی گئی ہے مثلاً چہار دیواری سے اور مشبہ ومشبہ بہ کے درمیان وجہ جامع عدم تخلص و بے بسی ہے کہ جس طرح چہار دیواری کے اندر گھری ہوئی چیز اس سے نکل جانے میں بے بس ہے یونہی کافر وشرک کفر وشرک جیسے گناہوں کے احاطہ میں ہوتے ہیں اور نور ایمان کی طرف بڑھنے میں وہی گناہ روکاوٹ بنتے ہیں۔

قولہ: و روعی فیه الخ یہ اس شبہ کا ازالہ ہے کہ بہ میں ضمیر واحد اور ھم میں ضمیر جمع دونوں کا مرجع لفظ مَنْ ہے اس سے ایک لفظ کا واحد اور جمع دونوں ہونا لازم آیا اور یہ درست نہیں، جواب یہ ہے کہ لفظ من لفظاً واحد ہے اور معنی جمع ہے۔ لہٰذا بہ میں من کی لفظی رعایت ہے اور ھم میں من کی معنوی رعایت ہے اور ایک لفظ کا واحد اور جمع ہونا اس وقت درست نہیں جب

ایک ہی جہت سے واحد اور جمع ہونا لازم آئے مگر یہاں ایسا نہیں۔

﴿وَ﴾ اذْكُرْ ﴿إِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْ إِسْرَائِيْلَ﴾ فِي التَّوْرَاةِ وَ قُلْنَا ﴿لَا تَعْبُدُوْنَ﴾ بِالتَّاءِ وَ الْيَاءِ ﴿اِلَّا اللّٰهَ﴾ خَبَرٌ بِمَعْنَى النَّهْيِ وَ قُرِئَ لَا تَعْبُدُوْا ﴿وَ﴾ اَحْسِنُوْا ﴿بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا﴾ بِرًّا ﴿وَ ذِي الْقُرْبٰى﴾ اَلْقَرَابَةِ عَطْفٌ عَلَى الْوَالِدَيْنِ ﴿وَ الْيَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِيْنِ وَ قُوْلُوْا لِلنَّاسِ قَوْلًا حُسْنًا﴾ مِنَ الْاَمْرِ بِالْمَعْرُوْفِ وَ النَّهْيِ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ الصِّدْقِ فِيْ شَانِ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَ الرِّفْقِ بِهِمْ وَ فِيْ قِرَاءَةٍ بِضَمِّ الْحَاءِ وَ سُكُوْنِ السِّيْنِ مَصْدَرٌ وُصِفَ بِهٖ مُبَالَغَةً ﴿وَ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ﴾ فَقَبِلْتُمْ ذٰلِكَ ﴿ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ﴾ اَعْرَضْتُمْ عَنِ الْوَفَاءِ بِهٖ فِيْهِ الْتِفَاتٌ عَنِ الْغَيْبَةِ وَ الْمُرَادُ اٰبَائُهُمْ ﴿اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْكُمْ وَ اَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ ۝﴾ عَنْهُ كَاٰبَائِكُمْ.

ترجمہ: ﴿اور﴾ یاد کرو ﴿جب ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا﴾ توریت میں اور ہم نے فرمایا ﴿نہ عبادت کرنا﴾ لا تعبدون کو یا کے ساتھ یعنی لا یعبدون بھی پڑھا گیا ہے ﴿اللہ کے سوا﴾ یہ خبر نہی کے معنی میں ہے اور ایک قرأت میں لا تعبدوا بھی پڑھا گیا ہے ﴿اور﴾ احسان کرو ﴿ماں باپ کے ساتھ بھلائی کرو﴾ اچھا برتاؤ ﴿نیز رشتہ داروں﴾ قربیٰ بمعنی قرابت ہے اور عطف ہے علی الوالدین پر ﴿یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ بھی اور لوگوں سے اچھی بات کہو﴾ یعنی اچھائیوں کا حکم دو اور برائیوں سے روکو اور محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے متعلق سچائی سے کام لو اور لوگوں کی ساتھ نرمی سے پیش آؤ اور ایک قراءت میں حسنا یعنی حا کے ضمہ اور سین کے سکون کے ساتھ مصدر پڑھا گیا ہے اور بطور مبالغہ صفت ہے ﴿اور نماز قائم رکھو اور زکوٰۃ دو﴾ تو تم نے اسے قبول کیا ﴿پھر تم پھر گئے﴾ وعدہ وفائی سے منہ موڑ لیا اس میں غیبت سے التفات ہے (خطاب کی طرف) اور مراد ان کے آباء واجداد ہیں ﴿مگر چند آدمی تم میں سے اور تم روگردانی کرنے والے ہو﴾ اس حکم سے اپنے آباء کی طرح۔

توضیح و تشریح: قولہ: فی التوراۃ الخ اس لفظ سے حضرت مفسر نے اشارہ فرمایا ہے کہ یہاں جن احکامات سے بنی اسرائیل کی روگردانی کا ذکر مقصود ہے وہ احکامات زبانی یا مجموعہ توریت پر مستزاد نہیں تھے بلکہ وہ توریت ہی کے احکامات تھے اور چونکہ یہود سے پوری توریت پر عمل کرنے کا عہد لیا گیا تھا جس میں یہ احکام بھی موجود تھے لہٰذا ان کا بھی عہد ہو گیا۔ آگے لاتعبدون سے قبل لفظ قلنا مقدر مان کر مفسر علام نے اخذنا پر عطف کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ اور یہ کہ "لاتعبدون" میں غیبت سے خطاب کی طرف التفات نہیں ہے اور جن لوگوں نے "قلنا" کی تقدیر کا قول نہیں کیا ہے، ان کے یہاں التفات ہے۔

قولہ: خبر بمعنی النهی الخ یہ دفع دخل مقدر ہے، سوال یہ پیدا ہوا کہ لاتعبدون الا اللہ جملہ خبریہ ہے جس سے بظاہر یہ سمجھ میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی ہے کہ اس کے بندے غیر اللہ کی عبادت نہیں کریں گے، حالانکہ اس آیت کے نزول کے بعد بھی کفار و مشرکین غیر اللہ کی عبادت کرتے ہیں، حاصل جواب یہ ہے کہ آیت کا مذکورہ ٹکڑا اگرچہ بظاہر جملہ

خبریہ ہے لیکن معنی کے اعتبار سے جملہ انشائیہ ہے لہٰذا یہاں خبر دینا مقصود نہیں بلکہ غیر اللہ کی عبادت سے روکنا مقصود ہے گویا یہاں لاتعبدون بمعنی لاتعبدوا ہے۔ اور نہی کو بصورت نفی اس لئے ذکر فرمایا تا کہ اس سے دور رہنے میں اتنی جلدی ہو گویا کہ باز رہنا پالیا گیا اور اس کی خبر دی جارہی ہے۔ خیال رہے کہ یہی نکتہ دعائیہ جملوں میں صیغۂ ماضی استعمال کرنے میں بھی ملحوظ ہوتا ہے۔

قوله: و احسنوا۔ یہ بھی ایک اشکال کا جواب ہے، اشکال یہ پیدا ہوا کہ بالوالدین کا عطف لاتعبدون پر ہے لہٰذا جار مجرور کا عطف غیر جار مجرور پر ہو گیا اور یہ جائز نہیں، جواب یہ ہے کہ بالوالدین کا عطف لاتعبدون پر نہیں بلکہ اس کا متعلق احسنوا محذوف ہے اور اصل معطوف وہی ہے۔ فاندفع الاشکال

قولہ: برّا۔ اس لفظ سے اشارہ فرمایا کہ آیت میں لفظ احسان سے محض احسان بالمال مراد نہیں بلکہ مطلق حسن سلوک مراد ہے جس میں ہر قسم کا احسان شامل ہے، اس کی قدرے تفصیل یہ ہے کہ والدین سے ایسی کوئی بات نہ کہے اور ایسا کوئی کام نہ کرے جس سے انھیں تکلیف پہنچے، اپنے بدن اور مال سے ان کی خدمت میں دریغ نہ کرے، جب انھیں ضرورت ہو ان کے پاس حاضر رہے۔ اور دل سے ان کے ساتھ محبت رکھے، رفتار و گفتار اور نشست و برخاست میں ادب لازم جانے، ان کی شان میں تعظیم کا لفظ کہے، ان کو راضی کرنے کی سعی کرتا رہے۔ ان کے مرنے کے بعد ان کی وصیتیں جاری کرے، ان کے لئے فاتحہ، صدقات و تلاوت قرآن سے ایصال ثواب کرے، اللہ تعالیٰ سے ان کی مغفرت کی دعا کرے ہفتہ وار ان کی قبر کی زیارت کرے۔ (خزائن العرفان)

قوله: القرابة الخ یہ اشارہ اس امر کی طرف ہے کہ لفظ "قربیٰ" مصدر ہے بروزن "فُعلیٰ" صیغۂ تفضیل برائے مؤنث نہیں ہے کیونکہ لفظ ذو کا دخول جمع اور صفت پر نہیں ہوتا، آگے عطف علی الوالدین سے مفسر علام نے یہ اشارہ فرمایا کہ ذی حالت جر میں ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ وہ "الوالدین" مجرور پر عطف ہے۔

قولہ: قولًا. اس لفظ کے اضافہ سے یہ بتانا مقصود ہے کہ آیت میں لفظ "حسنا" مصدر محذوف کی صفت واقع ہونے کی وجہ سے منصوب ہے خود مصدر نہیں ہے۔ لہٰذا یہاں مصدر کا حمل ذات پر ہونے کا اعتراض نہیں کیا جاسکتا۔

قوله: وصف به الخ یہ حسناً میں ایک دوسری قرأت کا بیان ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ ایک متواتر قراءۃ میں حا کے ضمہ اور سین کے سکون کے ساتھ حُسنا پڑھا گیا ہے اس صورت میں مصدر ہے اور یہ "قولاً" مفعول مطلق کی صفت بطور مبالغہ ہے جیسا کہ کہہ دیا جائے جاء نی زید العدل تو یہاں زید کا عدل سے اتصاف بطور مبالغہ ہے۔

قوله: فيه التفات. اس عبارت کا ماحصل یہ ہے کہ یہاں غیبت سے خطاب کی طرف کلام کا رخ موڑ دیا گیا تا کہ سامع کو کلام میں ایک نئی لذت ملے اور وہ اکتاہٹ کا شکار نہ ہو۔

خیال رہے کہ مذکورہ احکام کی خلاف ورزی اگرچہ گزرے ہوئے بنی اسرائیل نے کی تھی مگر یہاں خطاب زمانہ رسالت کے یہودیوں سے ہے جس کا مقصد یہ نصیحت کرنی ہے کہ اے یہودیو! تمہارے آباء و اجداد نے احکام الٰہی سے منہ موڑ

کر اپنی عاقبت خراب کر لی، اگر تم بھی انھیں کے نقش قدم پر چلتے رہے تو تمہارا بھی انجام برا ہو گا لہٰذا تم ان کی روش کو چھوڑ کر محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر ایمان لے آؤ تا کہ دارین کی سعادت سے بہرہ ور ہو سکو۔

قوله: کَآبَائِکُمْ. یہاں اس شبہ کا ازالہ مقصود ہے کہ ثم تولیتم کے بعد و انتم معرضون کہنے میں بے فائدہ تکرار لازم آ رہا ہے۔ جواب کا حاصل یہ ہے کہ ثم تولیتم میں زمانۂ رسالت کے یہودیوں کے آباء واجداد سے خطاب ہے اور انتم معرضون میں زمانۂ رسالت کے یہودیوں سے خطاب ہے۔ لہٰذا تکرار بے فائدہ نہیں۔

قوله: فقبلتم. یہ اشارہ اس امر کی طرف ہے کہ تولیتم کا عطف فعل مقدر یعنی قبلتم پر ہے نہ کہ اقیموا پر جیسا کہ بظاہر معلوم ہوتا ہے۔ لہٰذا یہاں اس اعتراض کی گنجائش نہیں کہ خبر کا عطف انشاء پر ہو رہا ہے۔

فائدہ: (۱) یتیم انسانوں میں اس نابالغ یا نابالغہ کو کہتے ہیں جس کا باپ مر گیا ہو، اور جانوروں میں یتیم وہ جانور ہے جس کی ماں مر گئی ہو۔ (۲) فقیر وہ ہے جس کے پاس نصاب سے کم مال ہو، مسکین وہ ہے جو مال کا بالکل مالک نہ ہو۔

﴿وَ اِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ﴾ وَ قُلْنَا ﴿لَاتَسْفِكُوْنَ دِمَائَكُمْ﴾ تُرِيْقُوْنَهَا بِقَتْلِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا ﴿وَ لَاتُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ مِنْ دِيَارِكُمْ﴾ لَايُخْرِجُ بَعْضُكُمْ بَعْضًا مِنْ دَارِهٖ ﴿ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ﴾ قَبِلْتُمْ ذٰلِكَ الْمِيْثَاقَ ﴿وَ اَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ۝﴾ عَلٰی اَنْفُسِكُمْ ﴿ثُمَّ اَنْتُمْ﴾ يَا ﴿هٰؤُلَاءِ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ﴾ بِقَتْلِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا ﴿وَ تُخْرِجُوْنَ فَرِيْقًا مِّنْكُمْ مِنْ دِيَارِهِمْ تَظَاهَرُوْنَ﴾ فِيْهِ اِدْغَامُ التَّاءِ فِي الْاَصْلِ فِي الظَّاءِ وَ فِيْ قِرَاءَةٍ بِالتَّخْفِيْفِ عَلٰی حَذْفِهَا تَتَعَاوَنُوْنَ ﴿عَلَيْهِمْ بِالْاِثْمِ﴾ اَلْمَعْصِيَةِ ﴿وَ الْعُدْوَانِ﴾ اَلظُّلْمِ ﴿وَاِنْ يَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰی﴾ وَ فِيْ قِرَاءَةٍ اَسْرٰی ﴿تُفْدُوْهُمْ﴾ وَ فِيْ قِرَاءَةٍ تَفْدُوْهُمْ تُنْقِذُوْهُمْ مِنَ الْاَسْرِ بِالْمَالِ اَوْ غَيْرِهٖ وَ هُوَ مِمَّا عُهِدَ اِلَيْهِمْ ﴿وَهُوَ﴾ اَیِ الشَّاْنُ ﴿مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ﴾ مُتَّصِلٌ بِقَوْلِهٖ وَ تُخْرِجُوْنَ وَ الْجُمْلَةُ بَيْنَهُمَا اِعْتِرَاضٌ اَیْ كَمَا حُرِّمَ تَرْكُ الْفِدَاءِ وَ كَانَتْ قُرَيْظَةُ حَالَفُوا الْاَوْسَ وَ النَّضِيْرُ الْخَزْرَجَ فَكَانَ كُلُّ فَرِيْقٍ يُقَاتِلُ مَعَ حُلَفَائِهٖ وَ يُخَرِّبُ دِيَارَهُمْ وَ يُخْرِجُهُمْ فَاِذَا اُسِرُوْا فَدَوْهُمْ وَ كَانُوْا اِذَا سُئِلُوْا لِمَ تُقَاتِلُوْنَهُمْ وَتَفْدُوْنَهُمْ قَالُوا اُمِرْنَا بِالْفِدَاءِ فَيُقَالُ فَلِمَ تُقَاتِلُوْنَهُمْ فَيَقُوْلُوْنَ حَيَاءً اَنْ تُسْتَذَلَّ حُلَفَائُنَا.

ترجمہ: ﴿اور جب ہم نے تم سے عہد لیا﴾ اور فرمایا ﴿اپنوں کا خون نہ کرنا﴾ ایک دوسرے کو قتل کر کے خون ریزی نہ کرنا ﴿اور اپنوں کو اپنی بستیوں سے نہ نکالنا﴾ تم آپس میں ایک دوسرے کو جلاوطن نہ کرنا ﴿پھر تم نے اس کا اقرار کیا﴾ اس عہد و پیمان کو قبول کیا ﴿اور تم گواہ ہو﴾ اپنے نفسوں پر ﴿پھر تم وہی ہو نا (جنھوں نے یہ وعدے کئے) کہ اپنوں کو قتل کرنے لگے﴾ تم میں کا بعض دوسرے بعض کو قتل کرنے لگا ﴿اور اپنے میں سے ایک گروہ کو ان کے وطن سے نکالتے ہو ان پر مدد دیتے ہو﴾ اس میں دراصل تا کا ظا میں ادغام ہے اور ایک قراءۃ میں تخفیف کے ساتھ ہے یعنی ایک تا محذوف ہے تعاون کرتے ہو (ان کے مخالف کی) ﴿گناہ اور زیادتی میں﴾ یعنی ظلم میں ﴿اور اگر وہ قیدی ہو کر تمہارے پاس آئیں﴾ اور ایک قراءۃ میں اسریٰ ہے ﴿تو بدلہ دے کر چھڑا لیتے ہو﴾ اور ایک قراءۃ میں تفدوھم ہے یعنی تم مال وغیرہ دے کر انھیں قید سے آزاد کرا لیتے

ہو اور یہ بھی ان سے لئے گئے عہدوں سے تھا ﴿اور وہ﴾ "ھو" ضمیر شان ہے ﴿ان کا نکالنا تم پر حرام ہے﴾ اس کا تعلق، و تخرجون سے ہے اور جملہ ان یاتوکم الخ دونوں کے درمیان جملہ معترضہ ہے یعنی جیسے ان پر ترک فدیہ حرام ہے۔ (ایسے ہی جلاوطن کرنا بھی) اور بنوقریظہ قبیلہ اوس کے، بنونضیر قبیلہ خزرج کے حلیف تھے، ہر فریق اپنے حلیف کے ساتھ مخالفین سے برسر پیکار رہتا، وہ ایک دوسرے کی آبادیوں کو تباہ کرتے اور ایک دوسرے کو جلاوطن کرتے پھر جب کوئی قیدی بن جاتا تو اسے فدیہ دے کر چھڑا لیتے اور جب ان سے پوچھا جاتا کہ تم ان سے جنگ کر کے کیوں فدیہ دیتے ہو؟ تو جواب دیتے کہ ہمیں فدیہ کا حکم دیا گیا ہے۔ پھر جب یہ سوال ہوتا کہ تم جنگ ہی کیوں کرتے ہو؟ تو کہتے کہ ہم اپنے حلیفوں کی ذلت سے شرماتے ہیں۔

توضیح و تشریح: قوله بقتل بعضكم بعضاً — یہ ایک شبہ کا ازالہ ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ یہود نے قتل نفس کے ذریعہ نقض عہد نہیں کیا تھا کیونکہ کسی یہودی نے خود کو قتل نہیں کیا تھا بلکہ ہر یہودی جدال وقتال میں غیر کو قتل کرتا تھا۔ پھر ان کے ذم میں تقتلون انفسكم کیوں ارشاد ہوا۔ جواب کا حاصل یہ ہے کہ آیت کا معنی تو یہی ہے کہ تم خود کو قتل نہ کرنا اور نہ ہی خود کو گھر سے بے گھر کرنا، مگر چونکہ یہود دین اور نسب میں متحد تھے اور بھائی کا خون اپنے خون کی مانند ہوتا ہے اس لئے مجازاً ایک دوسرے کے قتل واخراج کو قتل نفس اور اخراج نفس سے تعبیر فرمایا۔

قوله: یا هؤلاء. هؤلاء سے پہلے یا حرف ندا مقدر مان کر حضرت مفسر نے ایک سوال مقدر کا جواب دیا ہے، سوال یہ ہے کہ آیت میں لفظ انتم مبتداء ہے اور لفظ هؤلاء خبر ہے اس سے ذات واحد کا ایک ہی خطاب میں حاضر اور غائب ہونا لازم آتا ہے اور یہ جائز نہیں، جواب یہ ہے کہ یہاں هؤلاء میں حرف ندا مقدر ہے، لہٰذا هؤلاء خود خبر نہیں بلکہ مبتداء اور خبر کے درمیان جملہ معترضہ ہے یعنی انتم مبتداء کی خبر آگے تقتلون ہے لہٰذا مذکورہ اعتراض لازم نہیں آیا۔

قوله: و فی قرأة اسریٰ. یعنی ایک قراءۃ میں اُسریٰ کی بجائے اَسریٰ ہے اس صورت میں یہ اسیر کی جمع ہے جیسے جرحیٰ جریح کی جمع ہے، اور اُسریٰ، اسری کی جمع ہے جیسے سُکاریٰ جمع ہے سکریٰ کی اس لحاظ سے اُساریٰ جمع الجمع ہے نہ کہ اسیر مفرد کی لہٰذا یہ شبہ نہیں کیا جاسکتا کہ فعیل کی جمع فعالیٰ کے وزن پر نہیں آتی۔ (ترویح الارواح)

قوله: هو. چونکہ ھو کا مرجع ماقبل میں مذکور نہیں ہے اس لئے حضرت مفسر نے اسے ضمیر شان قرار دیا۔

قَالَ تَعَالیٰ ﴿اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ﴾ وَهُوَ الْفِدَاءُ ﴿وَ تَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ﴾ وَهُوَ تَرْكُ الْقَتْلِ وَ الْاِخْرَاجِ وَ الْمُظَاهِرَةِ ﴿فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ﴾ هَوَانٌ وَ ذِلٌّ ﴿فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا﴾ وَ قَدْ خُزُوْا بِقَتْلِ قُرَيْظَةَ وَ نَفْيِ النُّضَيْرِ اِلَى الشَّامِ وَ ضَرْبِ الْجِزْيَةِ ﴿وَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰى اَشَدِّ الْعَذَابِ وَ مَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ﴾ بِالْيَاءِ وَ التَّاءِ ﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ﴾ بِاَنْ اٰثَرُوْهَا عَلَيْهَا ﴿فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَ لَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ٥﴾ يُمْنَعُوْنَ مِنْهُ.

ترجمہ: اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿تو کیا تم ایمان لاتے ہو کتاب کے کچھ حصہ پر﴾ اور وہ فدیہ ہے ﴿اور کچھ سے انکار کرتے ہو﴾ اور وہ خون ریزی، جلاوطنی اور ناجائز حمایت کا چھوڑنا ہے۔ ﴿تو جو تم میں ایسا کرے اس کا بدلہ کیا ہے سوائے

اس کے کہ رسوار ہے ﴿ حقیر و ذلیل ﴾ ﴿ دنیا کی زندگی میں ﴾ چنانچہ بنو قریظہ قتل کے ذریعہ اور بنو نضیر شام کی طرف جلاوطنی اور جزیہ کے تسلط کے ذریعہ ذلیل کئے گئے ﴿ اور قیامت میں سخت تر عذاب کی طرف پھیرے جائیں گے اور اللہ بے خبر نہیں اس سے جو تم کرتے ہو ﴾ تعملون یا اور تا کہ ساتھ ہے ﴿ یہ ہیں وہ لوگ جنھوں نے آخرت کے بدلے دنیا کی زندگی مول لی ﴾ اس طرح کہ دنیا کو آخرت پر ترجیح دے دی ﴿ تو نہ ان پر سے عذاب ہلکا ہو اور نہ ان کی مدد کی جائے ﴾ کہ اللہ کا عذاب روک دیا جائے۔

توضیح و تشریح: قوله: وهو ترك القتل الخ صورت واقعہ یہ ہے کہ مدینہ کے رہنے والوں میں مشرک بھی تھے اور یہودی بھی، مشرک آبادی دو قبیلوں اوس اور خزرج میں بٹی ہوئی تھی اور یہ ایک دوسرے کے دشمن تھے، یہودی آبادی بھی دو قبیلوں بنو قریظہ اور بنو نضیر پر مشتمل تھی، جب اوس و خزرج برسر پیکار ہوتے تو بنی قریظہ اوس کے اور بنی نضیر خزرج کے حلیف بن جاتے، اس طرح یہ یہودی آپس میں ایک دوسرے کو قتل کرتے، جب جنگ ختم ہو جاتی اور مغلوب فریق کے اسیران جنگ کو فدیہ ادا کر کے آزاد کرانے کا مرحلہ درپیش ہوتا تو اس وقت یہ یہود توریت کی صفحہ گردانی کرتے اور اس کی آیت سے فدیہ دینے اور فدیہ لینے کے جواز پر استدلال کرتے، قرآن حکیم انہیں کہتا ہے کہ توریت تو تمہیں قتل و غارت کرنے سے اور ایک دوسرے کو جلاوطن کرنے سے بھی روکتی ہے، وہ حکم تو تمہیں یاد نہ رہا، اور جب روپیہ کے لین دین کا سوال پیدا ہوا تو تمہیں توریت پر عمل کرنے کا شوق پیدا ہو گیا، بھلا یہ بھی کوئی ایمان ہے کہ کتاب کے آسان حصہ پر تو عمل کر لیا اور کتاب کا وہ حصہ جس پر عمل کرنا نفس پر گراں معلوم ہوا اسے چھوڑ دیا (ضیاء القرآن ملخصاً)

قوله: و قد خزوا بقتل قريظة الخ یہ یہود کی دنیوی سزا کا بیان ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ جب حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم مدینہ منورہ میں تشریف لائے اور اوس و خزرج دولت ایمان سے مشرف ہوئے تو بنو قریظہ اور بنو نضیر تنہا رہ گئے۔ چنانچہ ایک موقع پر ۳ھ میں عہد شکنی کے سبب بنو قریظہ کے سات سو آدمی قتل کر دئے گئے اور بنی نضیر اس سے قبل ہی شام کی طرف جلاوطن کر دئے گئے تھے اور جو بچے ان پر جزیہ کی ادائیگی لازم کر دی گئی۔ (خزائن العرفان ملخصاً)

قوله: بان آثروها علیها اس تفسیر سے مفسر علام نے اشارہ فرمایا کہ آیت میں شراء مجازی معنی میں ہے یعنی اشتراء بمعنی اختیار ہے اور یہ ذكر الملزوم وارادة اللازم کے قبیل سے ہے گویا یہود نے آخرت پر دنیا کو ترجیح دی تو انھوں نے آخرت کے بدلے دنیا کو خرید لیا، اس سے واضح ہوا کہ یہاں اشتراء حقیقی معنی میں نہیں لہٰذا یہ اعتراض نہیں کیا جا سکتا کہ اشتراء کا تحقق اعیان میں ہوتا ہے اور آخرت پر دنیا کو ترجیح دینا ایک معنوی چیز ہے پھر اس پر اشتراء کا اطلاق کیوں ہوا؟

ایک شبہ کا ازالہ: یہاں ایک شبہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا آیت کے ایک جز "و تکفرون ببعض" سے ثابت ہوتا ہے کہ گناہ کبیرہ کا ارتکاب کفر ہے، کیونکہ آپس میں قتال اور اخراج وغیرہ بنی اسرائیل پر حرام تھا مگر وہ اس کا ارتکاب کرتے تھے، جسے قرآن نے کفر کہا، حالانکہ اہلسنّت و جماعت کے نزدیک ارتکاب کبیرہ کفر نہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہود مذکورہ گناہ حلال سمجھ کر کرتے تھے اور حرام قطعی کو حلال سمجھنا یقیناً کفر ہے۔ (خزائن العرفان)

﴿ وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ ﴾ اَلتَّوْرَاةَ ﴿ وَ قَفَّيْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ ﴾ اَیْ اَتْبَعْنَاهُمْ رَسُوْلًا فِیْ

اِثْرِ رَسُوْلٍ ﴿وَ اٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ﴾ اَلْمُعْجِزَاتِ كَاِحْيَاءِ الْمَوْتٰى وَ اِبْرَاءِ الْاَكْمَهِ وَ الْاَبْرَصِ ﴿وَ اَيَّدْنَاهُ﴾ قَوَّيْنَاهُ ﴿بِرُوْحِ الْقُدُسِ﴾ مِنْ اِضَافَةِ الْمَوْصُوْفِ اِلَى الصِّفَةِ اَيِ الرُّوْحِ الْمُقَدَّسَةِ جِبْرِيْلَ لِطَهَارَتِهٖ يَسِيْرُ مَعَهٗ حَيْثُ سَارَ فَلَمْ تَسْتَقِيْمُوْا ﴿اَفَكُلَّمَا جَآئَكُمْ رَسُوْلٌ بِمَا لَا تَهْوٰٓى﴾ تُحِبُّ ﴿اَنْفُسُكُمُ﴾ مِنَ الْحَقِّ ﴿اسْتَكْبَرْتُمْ﴾ تَكَبَّرْتُمْ عَنْ اِتِّبَاعِهٖ جَوَابُ كُلَّمَا وَ هُوَ مَحَلُّ الْاِسْتِفْهَامِ وَ الْمُرَادُ بِهِ التَّوْبِيْخُ ﴿فَفَرِيْقًا﴾ مِنْهُمْ ﴿كَذَّبْتُمْ﴾ كَعِيْسٰى ﴿وَ فَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ ٥﴾ اَلْمُضَارِعُ لِحِكَايَةِ الْحَالِ الْمَاضِيَةِ اَیْ قَتَلْتُمْ زَكَرِيَّا وَ يَحْيٰى ﴿وَ قَالُوْا﴾ لِلنَّبِيِّ اِسْتِهْزَاءً ﴿قُلُوْبُنَا غُلْفٌ﴾ جَمْعُ اَغْلَفَ اَیْ مُغَشَّاةٌ بِاَغْطِيَةٍ فَلَا تَعِيْ مَا تَقُوْلُ قَالَ تَعَالٰى ﴿بَلْ﴾ لِلْاِضْرَابِ ﴿لَعَنَهُمُ اللّٰهُ﴾ اَبْعَدَهُمْ عَنْ رَحْمَتِهٖ وَ خَذَلَهُمْ عَنِ الْقَبُوْلِ ﴿بِكُفْرِهِمْ﴾ وَ لَيْسَ عَدَمُ قَبُوْلِهِمْ لِخَلَلٍ فِیْ قُلُوْبِهِمْ ﴿فَقَلِيْلًا مَّا يُؤْمِنُوْنَ ٥﴾ مَا زَائِدَةٌ لِتَاكِيْدِ الْقِلَّةِ اَیْ اِيْمَانُهُمْ قَلِيْلٌ جِدًّا ﴿وَ لَمَّا جَآئَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ﴾ مِنَ التَّوْرَاةِ هُوَ الْقُرْاٰنُ ﴿وَ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ﴾ قَبْلَ مَجِيْئِهٖ ﴿يَسْتَفْتِحُوْنَ﴾ يَسْتَنْصِرُوْنَ ﴿عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا﴾ يَقُوْلُوْنَ اَللّٰهُمَّ انْصُرْنَا عَلَيْهِمْ بِالنَّبِيِّ الْمَبْعُوْثِ اٰخِرَ الزَّمَانِ ﴿فَلَمَّا جَآئَهُمْ مَا عَرَفُوْا﴾ مِنَ الْحَقِّ وَ هُوَ بِعْثَةُ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ﴿كَفَرُوْا بِهٖ﴾ حَسَدًا وَ خَوْفًا عَلَى الرِّيَاسَةِ وَ جَوَابُ لَمَّا الْاُوْلٰى دَلَّ عَلَيْهِ جَوَابُ الثَّانِيَةِ ﴿فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ٥ بِئْسَمَا اشْتَرَوْا﴾ بَاعُوْا بِهٖ ﴿اَنْفُسَهُمْ﴾ اَیْ حَظَّهَا مِنَ الثَّوَابِ وَ مَا نَكِرَةٌ بِمَعْنٰى شَيْئًا تَمِيْزٌ لِفَاعِلِ بِئْسَ وَالْمَخْصُوْصُ بِالذَّمِّ ﴿اَنْ يَّكْفُرُوْا﴾ اَیْ كُفْرُهُمْ ﴿بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ﴾ مِنَ الْقُرْاٰنِ ﴿بَغْيًا﴾ مَفْعُوْلٌ لَهٗ لِيَكْفُرُوْا اَیْ حَسَدًا عَلٰى ﴿اَنْ يُّنَزِّلَ اللّٰهُ﴾ بِالتَّخْفِيْفِ وَ التَّشْدِيْدِ ﴿مِنْ فَضْلِهٖ﴾ اَلْوَحْيِ ﴿عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ﴾ لِلرِّسَالَةِ ﴿مِنْ عِبَادِهٖ فَبَآءُوْا﴾ رَجَعُوْا ﴿بِغَضَبٍ﴾ مِنَ اللّٰهِ بِكُفْرِهِمْ بِمَا اَنْزَلَ وَ التَّنْكِيْرُ لِلتَّعْظِيْمِ ﴿عَلٰى غَضَبٍ﴾ اِسْتَحَقُّوْهُ مِنْ قَبْلُ بِتَضِيْعِ التَّوْرَاةِ وَ الْكُفْرِ بِعِيْسٰى ﴿وَ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ٥﴾ ذُوْ اِهَانَةٍ.

حل اللغات: ﴿اتبعناهم﴾ ہم نے انہیں لگا تار بھیجا ﴿رسولًا فی اثر رسول﴾ ایک رسول کے بعد ایک رسول ﴿الاحیاء﴾ زندہ کرنا ﴿الموتی﴾ المیت کی جمع، مردہ ﴿الابراء﴾ شفا دینا ﴿الاکمہ﴾ مادرزاد اندھا ﴿الابرص﴾ صیغہ صفت ہے برص یعنی سفید داغ کی بیماری والا ﴿قوینا﴾ ہم نے اسے مضبوط کیا، توانائی دی ﴿التوبیخ﴾ سرزنش، تکلیف دہ ملامت ﴿مغشاۃ﴾ ڈھانکا ہوا ﴿اغطیۃ﴾ الغطاء کی جمع ہے، پردہ سرپوش ﴿فلا نعی ما تقول﴾ تو وہ دل سے یاد نہیں رکھتے جو آپ کہتے ہیں ﴿حسدا و خوفا علی الریاسۃ﴾ قلبی جلن اور زوال حکومت کے خوف سے ﴿الوحی﴾ اللہ تعالیٰ کی جانب سے انبیاء کرام علیہم السلام پر القا ہونے والا پیغام ﴿ذو اہانۃ﴾ ذلت والا، رسوائی والا۔

ترجمہ: ﴿اور بے شک ہم نے موسیٰ کو کتاب عطا کی﴾ توریت ﴿اور اس کے بعد پے در پے رسول بھیجے﴾ یعنی برابر ایک رسول کے بعد دوسرا رسول بھیجتے رہے۔ ﴿اور ہم نے عیسیٰ بن مریم کو کھلی نشانیاں عطا فرمائیں﴾ یعنی معجزات مثلاً

مردوں کو زندہ کرنا، مادرزاد اندھوں اور کوڑھیوں کو اچھا کرنا ﴿اور ہم نے اس کی مدد کی﴾ ہم نے انہیں تقویت دی ﴿پاک روح سے﴾ یہاں (روح القدس میں) موصوف کی اضافت صفت کی جانب ہے یعنی اصل الروح المقدسة ہے، مراد جبرئیل ہیں اپنی پاکیزگی کی وجہ سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ہمیشہ رہتے تھے، پھر بھی تم راہ راست پر نہ آئے ﴿تو کیا جب تمہارے پاس کوئی رسول وہ لے کر آئے جو خواہش نہیں﴾ پسند نہیں ﴿تمہارے نفس کی﴾ [ما سے مراد] امر حق ہے ﴿تکبر کرتے ہو﴾ روگردانی کرتے ہو اس کی پیروی سے، یہ کلما کا جواب اور محل استفہام میں ہے اور مقصود اس سے زجر و توبیخ ہے ﴿تو ایک گروہ کو﴾ ان میں سے ﴿تم جھٹلاتے ہو﴾ جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ﴿اور ایک گروہ کو شہید کرتے ہو﴾ اور مضارع حال ماضیہ کی حکایت کے لئے بمعنی قتلتم ہے جیسے زکریا و یحییٰ علیہما السلام [شہید کردیئے گئے] ﴿اور یہودی بولے﴾ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے بطور استہزاء ﴿ہمارے دلوں پر پردے پڑے ہیں﴾ غلف جمع ہے اغلف کی یعنی غلاف سے ڈھانپ دیئے گئے ہیں کہ آپ کی باتیں سمجھ میں نہیں آتی ہیں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿بلکہ﴾ یہ "بل" اضراب کے لئے ہے ﴿اللہ نے ان پر لعنت کی﴾ انہیں اپنی رحمت سے دور کردیا اور انہیں قبولیت سے محروم کردیا ﴿ان کے کفر کے سبب﴾ اور ان کی عدم قبولیت ان کے دلوں میں کسی خلل کے سبب نہیں ﴿تو ان میں تھوڑے ایمان لاتے ہیں﴾ ما زائدہ ہے قلت کی تاکید کے لئے یعنی ان کا ایمان بہت کم ہے۔ ﴿اور جب ان کے پاس اللہ کی وہ کتاب [قرآن] آئی جو ان کے ساتھ والی کتاب [توریت] کی تصدیق فرماتی ہے اور وہ اس سے پہلے﴾ اس کے آنے سے پہلے ﴿فتح مانگتے تھے﴾ مدد طلب کرتے تھے ﴿کافروں پر﴾ کہا کرتے تھے اے اللہ! ہمیں ان پر غلبہ عطا فرما نبی آخر الزماں کے صدقہ میں ﴿تو جب تشریف لایا ان کے پاس وہ جانا پہچانا﴾ امر حق اور وہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بعثت ہے ﴿اس سے منکر ہو بیٹھے﴾ حسد کی وجہ سے یا زوال ریاست کے خوف سے اور پہلے لمّا کے جواب پر دوسرے لمّا کا جواب دلالت کرتا ہے ﴿تو اللہ کی لعنت منکروں پر بہت بری چیز ہے جس کے بدلے سودا چکایا انھوں نے﴾ بیچ کر ﴿اپنی جانوں کا﴾ یعنی ثواب کا حصہ اور ما بمعنی شی نکرہ ہے اور بئس کے فاعل کی تمیز ہے اور مخصوص بالذم "أن یکفروا الخ" ہے۔ ﴿وہ یہ کہ کفر کرتے ہیں﴾ یعنی ان کا کفر کرنا ﴿اس کے ساتھ جو اللہ نے نازل فرمائی﴾ یعنی قرآن ﴿جلن سے﴾ یہ یکفروا کا مفعول لہ ہے یعنی اس پر حسد کرتے ہوئے کہ ﴿نازل کرتا ہے اللہ تعالیٰ﴾ تخفیف اور تشدید دونوں طرح ہے ﴿اپنا فضل﴾ یعنی وحی ﴿جس پر چاہتا ہے﴾ رسالت کے لئے ﴿اپنے بندوں سے تو حق دار ہوگئے مسلسل ناراضگی کے﴾ اللہ کی، اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ وحی کے انکار کے سبب اور غضب پر تنوین تنکیر تعظیم کے لئے ہے یعنی وہ پہلے ہی مستحق عذاب ہوگئے تھے توریت کو ضائع کرکے اور عیسیٰ علیہ السلام کے منکر ہو کر ﴿اور کافروں کے لئے ذلت کا عذاب ہے﴾ رسوا کرنے والا

توضیح وتشریح: قولـه: التوراة. یہ ایک شبہ کا ازالہ ہے، شبہ یہ پیدا ہوا کہ "الکتٰب" پر الْ جنس کے لئے ہے جس سے یہ لازم آتا ہے کہ ساری آسمانی کتابیں حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ہی نازل ہوئی ہیں، حالانکہ ایسا نہیں، حاصل ازالہ ہے کہ الکتٰب پر ال عہد کے لئے ہے جس سے مراد توریت ہے، ال جنسی نہیں کہ مذکورہ شبہ پیدا ہو۔

قوله: ای اتبعناھم الخ یہ آیت کریمہ وقفینا الخ کے مفہوم کی طرف اشارہ ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ قفینا باب تفعیل سے ماضی جمع متکلم کا صیغہ ہے، مصدر تقفیہ ہے جس کا معنی ہے ''پیچھے بھیجنا'' قفی متعدی بدو مفعول ہوتا ہے جیسے قفّیت زیدا عمرا میں نے زید کو عمر کے پیچھے بھیجا، لہٰذا یہاں آیت دراصل یوں ہے وقفینا موسیٰ بالرسل مفعول اول کو حذف کرکے "من بعدہ" کو اس کا قائم مقام کردیا تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ انبیاء بنی اسرائیل جن کا ذکر آیت میں ہے وہ سب حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پردہ فرمانے کے بعد یکے بعد دیگرے آئے، اس توضیح سے یہ اعتراض بھی ختم ہوگیا کہ قفینا متعدی بنفسہ ہے تو حرف من لانے کی کیا ضرورت تھی؟ توضیح مذکور ہی کی طرف مفسر علام نے ای اتبعنا ھم الخ سے اشارہ فرمایا ہے۔

خیال رہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد ایک روایت کے مطابق چار ہزار اور ایک روایت کے مطابق ستر ہزار انبیاء کرام آئے سب کے سب شریعت موسوی کے ناشر و شارح تھے مگر ان کا کار تبلیغ وحی الٰہی سے تھا موسیٰ علیہ السلام کی تقلید میں نہیں، بنی اسرائیل میں آخری نبی حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں جو نئی کتاب اور نئی شریعت کے ساتھ مبعوث ہوئے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کو منسوخ فرمایا اسی لئے اگلی آیت میں خصوصیت کے ساتھ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر ہے اگرچہ وہ بھی وقفینا من بعدہ بالرسل کے عموم میں شامل ہیں۔

قوله: من اضافة الموصوف الخ یعنی روح القدس کی اصل ''الروح المقدسۃ'' ہے معنی اختصاص پیدا کرنے کے لئے موصوف کی اضافت صفت کی طرف کردی گئی ہے، یہ ایسے ہی ہے جیسے الحاتم الجود کو حاتم الجود کہہ دیا جائے، یہاں روح القدس سے مراد حضرت جبرئیل علیہ السلام ہیں کہ آپ جسم نورانی رکھتے ہیں اور معاصی وغیرہ سے پاک ہیں۔

خیال رہے حضرت جبرئیل علیہ السلام پر روح کا اطلاق بطور مجاز ہے، کیونکہ روح حقیقۃً اس ہوا کا نام ہے جو جاندار کے مسامات میں پھر کر اس کو زندہ رکھتی ہے، اور یہ معنی یہاں درست نہیں مگر علاقۂ تشبیہ موجود ہے اس طرح کہ جیسے روح ایک نورانی جسم ہے اور اس سے بدن کی بقا ہے۔ اسی طرح حضرت جبرئیل علیہ السلام بھی نورانی جسم رکھتے ہیں اور آپ وحی لانے پر مامور ہیں جس میں قلوب کی زندگی ہے، لہٰذا مجازاً آپ کو روح فرمایا۔ (تفسیر کبیر)

قوله: فلم تستقیموا. اس جملہ سے حضرت مفسر نے اشارہ فرمایا ہے کہ آنے والی آیت کا معطوف علیہ محذوف ہے اور خطاب موجودہ یہودیوں سے ہے گویا یوں فرمایا: فلم تستقیموا فاستکبرتم کلما جائکم رسول الخ۔

قوله: تکبرتم عن اتباعه الخ اس عبارت سے مفسر علام نے اشارہ فرمایا کہ استکبرتم میں سین زائدہ برائے مبالغہ ہے اور کلما کا جواب ہے جو محل استفہام انکاری میں ہے، یعنی کلمۂ استکبرتم ہی بطور استفہام ناگواری اور انکار کا محل ہے۔ اور تکبر پر ناگواری کا اظہار کیا جارہا ہے، تقدیری عبارت یوں ہوگی۔ "أاستکبرتم کلما جائکم رسول الخ (صاوی)

قوله: المضارع لحکایة الخ یعنی مقتضاء ظاہر کے خلاف ماضی کی جگہ مضارع کا صیغہ ہے، کیونکہ قتل انبیاء کا ارتکاب موجودہ یہودیوں نے نہیں بلکہ ان کے آباء واجداد نے کیا تھا، لہٰذا ظاہر کا تقاضا یہ تھا کہ تقتلون کی جگہ قتلتم ہوتا، مگر

مضارع کا صیغہ اس لئے آیا کہ قتل انبیاء چونکہ انتہائی درجے کا قبیح فعل ہے لہٰذا موجودہ یہودیوں کے ذہن ودماغ میں ان کے اجداد کے اس فعل قبیح کا نقشہ کھینچنا مقصود ہے گویا واقعہ کی اہمیت کے پیش نظر ماضی کو حال کے درجہ میں اتار لیا گیا، اور یہ فصاحت کلام کی ایک کثیر الاستعمال صورت ہے جو معانی وبیان کے طالب علم سے پوشیدہ نہیں۔

قولہ: ای ایمانهم قلیل جدا. دراصل یہاں فقليلا ما يؤمنون میں تین احتمالات نکلتے ہیں، پہلا یہ کہ قلیل ایمان کی صفت ہو، اس صورت میں ایمان کا لغوی معنی ''یقین'' مراد ہوگا، اور آیت کا معنی ہوگا کہ ''یہ لوگ بہت کم یقین کرتے ہیں'' دوسرا یہ کہ قلیل مومن کی صفت ہو، اس صورت میں معنی ہوگا کہ ان میں بہت کم لوگ ایمان لاتے ہیں، تیسرا یہ کہ یہاں قلیل مطلقا نفی کے لئے ہو، اس صورت میں معنی ہوگا کہ ''یہ لوگ ایمان نہ لائیں گے، مفسر علام نے پہلے احتمال کو پسند فرمایا ہے۔

قولہ: قبل مجیئہ. اس تقدیری عبارت سے مفسر علام نے اشارہ فرمایا ہے کہ آیت میں لفظ قبل مبنی علی الضم ہے اور مضاف الیہ محذوف منوی ہے آگے یستفتحون کی تفسیر یستنصرون سے کر کے اس امر کی طرف اشارہ فرمایا کہ یستفتحون میں سین اور تا طلب کے لئے ہے نیز تعیین معنی کی طرف بھی اشارہ کیا ہے، کیونکہ استفتاح کا معنی آغاز کرنا بھی ہوتا ہے۔ (صاوی)

قولہ: من الحق. یہ آیت میں لفظ "ما" کا بیان ہے جس سے ایک سوال کا جواب دینا مقصود ہے، سوال یہ ہے کہ یہود حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو نبی آخر الزماں کی حیثیت سے پہچانتے تھے۔ کما قال اللہ تعالیٰ یعرفونہ کما یعرفون ابنائہم پھر یہاں حضور کو لفظ "ما" سے کیوں تعبیر کیا؟ جواب یہ ہے کہ آیت میں لفظ "ما" سے مراد ''حق'' ہے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ذات پاک مراد نہیں۔ (ترویح الارواح)

قولہ: و جواب لما الاولیٰ الخ یعنی پہلے لما کا جواب "کفروا بہ" پوشیدہ ہے، اصل عبارت یوں ہے و لما جائهم کتاب من عند الله مصدق لما معهم کفروا به" مگر دوسرے لما کا جواب بھی چونکہ لفظ کفروا بہ ہے اس لئے پہلے کو حذف کر کے دوسرے کو اس کے قائم مقام کر دیا گیا۔

قولہ: باعوا. آیت میں لفظ اشتروا بنا ہے شَرْیٌ سے، یہ لفظ جب ضرب یضرب سے آتا ہے تو بیچنے اور فروخت کرنے کا معنی دیتا ہے، اور باب افتعال میں آ کر خریدنے کا معنی دیتا ہے، یہاں چونکہ ضرب یضرب سے ہے اس لئے مفسر علام نے اس کی تفسیر لفظ باعوا سے کی ہے۔ آیت کا معنی ہوگا ''وہ چیز بری ہے جس کے عوض انھوں نے اپنی جانوں کو بیچا''، مگر مذکورہ معنی پر شراء کا اطلاق بطور استعارہ ہے کما مر۔

قولہ: ما نکرۃ بمعنی شیئاً الخ یہ ترکیب نحوی کی طرف اشارہ ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ لفظ بئس فعل ذم ہے جس میں ھو کی پوشیدہ ضمیر فاعل ممیز، ما نکرہ موصوفہ بمعنی شیئاً تمیز ہے، ممیز تمیز مل کر موصوف ہوا۔ اشتروا بہ انفسهم یہ پورا جملہ بتاویل مفرد ہو کر صفت واقع ہے۔ موصوف، صفت سے مل کر فاعل بئس فعل ذم اپنے فاعل سے مل کر جملہ فعلیہ انشائیہ ہو کر مبتدا ہوا، ان یکفروا بتاویل مصدر مخصوص بالذم خبر واقع ہے۔ اصل عبارت یوں ہوگی: بئس الشئ شیئاً اشتروا

به انفسهم ان یکفروا (صاوی)

قولہ: ای حسداً علی. بغیا کالغوی معنی ہے ''سرکشی، بغاوت، مگر مفسر علام نے اس کی تفسیر حسد سے فرمائی ہے کیونکہ بغاوت عموماً حسد سے ہوتی ہے اور حاسد بالآخر باغی بن جاتا ہے گویا یہاں مسبب کی تفسیر سبب سے کی گئی ہے۔

قولہ: الوحی اس لفظ کے ذریعہ حضرت مفسر نے ینزل کے مفعول محذوف کی طرف اشارہ فرماتے ہوئے فضل کا معنی مراد واضح کیا ہے جس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ نبوت و رسالت اپنی محنت یا استحقاق سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ صرف اللہ رب العزت کے فضل و کرم سے ہی ملتی ہے۔

قولہ: استحقوه من قبل الخ یعنی حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے ہی یہود اللہ تعالیٰ کے غضب کے مستحق ہو چکے تھے کہ اولاً حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے اور پھر ان کی وفات کے بعد کفر میں مبتلا ہو گئے، ثانیاً توریت شریف میں ردو بدل کر کے گویا اسے ضائع کر دیا، ثالثاً حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے پھر ان کے بھی منکر ہو بیٹھے۔ اب حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا انکار کر کے اپنے کفر کو اور بڑھا لیا، اس لئے غضب پر غضب یعنی قسم قسم کے بے شمار غضب کے مستحق ہو گئے۔

قولہ: ذو اهانة. اس تفسیر سے یہ بتانا مقصود ہے کہ عذاب کی جانب اہانت کی اسناد بطور مجاز ہے، کیونکہ عذاب درحقیقت ذلیل کرنے والا نہیں بلکہ ذلیل کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے۔ لہٰذا آیت میں لفظ مہین عذاب کی صفت حقیقی نہیں۔

خیال رہے کہ اہانت اور ذلت والا عذاب کافروں کے ساتھ خاص ہے اور گنہگار مسلمانوں کو جو عذاب ہوگا وہ ذلت آمیز نہیں ہوگا کہ اللہ عزوجل کا فیصلہ ہے۔ للّٰہ العزة و لرسوله و للمؤمنين.

فوائد نافعه (۱) تائید روح القدس حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی عظیم فضیلت ہے، ہمارے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے صدقہ میں حضور کے بعض امتیوں کو بھی تائید روح القدس میسر ہوئی جیسا کہ صحیح بخاری وغیرہ میں ہے کہ حضرت حسان رضی اللہ عنہ کے لئے ممبر بچھایا جاتا، وہ نعت شریف پڑھتے اور حضور ان کے لئے دعا کرتے۔ ''اللّٰهم ایده بروح القدس'' (خزائن العرفان)

(۲) حضرت عیسیٰ علیہ السلام ۳۳ سال کی عمر شریف میں آسمان پر اٹھائے گئے۔ (ایضاً)

(۳) موجودہ دور کے وہابی، دیوبندی، یہودیوں سے بھی گئے گزرے ہیں کہ یہودی وسیلہ کے قائل ہیں اور یہ وسیلہ کو شرک کہتے ہیں ثبوت کے لئے تقویت الایمان وغیرہ دیکھی جائے۔

﴿وَ اِذَا قِیْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ﴾ اَلْقُرْآنِ وَغَيْرِهٖ ﴿قَالُوْا نُؤْمِنُ بِمَاۤ اُنْزِلَ عَلَیْنَا﴾ اَیِ التَّوْرٰةِ قَالَ تَعَالٰى ﴿وَ یَكْفُرُوْنَ﴾ اَلْوَاوُ لِلْحَالِ ﴿بِمَا وَرَآءَهٗ﴾ سِوَاهُ اَوْ بَعْدَهٗ مِنَ الْقُرْآنِ ﴿وَ هُوَ الْحَقُّ﴾ حَالٌ ﴿مُصَدِّقًا﴾ حَالٌ ثَانِيَةٌ مُؤَكِّدَةٌ ﴿لِمَا مَعَهُمْ قُلْ﴾ لَهُمْ ﴿فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ﴾ اَیْ قَتَلْتُمْ ﴿اَنْۢبِیَآءَ اللّٰهِ مِنْ قَبْلُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ۝﴾ بِالتَّوْرٰةِ وَ قَدْ نُهِيْتُمْ فِيْهَا عَنْ قَتْلِهِمْ وَ الْخِطَابُ لِلْمَوْجُوْدِيْنَ فِيْ زَمَنِ نَبِيِّنَا

صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِمَا فَعَلَ اٰبَائُهُمْ لِرِضَاهُمْ بِهٖ.

ترجمہ: ﴿اور جب ان سے کہا جائے کہ اللہ کے اتارے پر ایمان لاؤ﴾ قرآن وغیرہ پر ﴿تو کہتے ہیں وہ جو ہم پر اترا اس پر ایمان لاتے ہیں﴾ یعنی توریت پر، اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿اور کفر کرتے ہیں﴾ واؤ حالیہ ہے ﴿اس کی علاوہ کے ساتھ﴾ یعنی اس کے علاوہ [دوسری کتابوں کے ساتھ] یا اس کے بعد قرآن کے ساتھ ﴿حالانکہ وہ حق ہے﴾ یہ حال ہے ﴿تصدیق کرتا ہے﴾ یہ دوسرا حال ہے تاکید کے لئے ﴿اس کتاب کی جوان کے پاس ہے، آپ فرمادیجئے﴾ ان سے ﴿پھر تم کیوں قتل کرتے رہے﴾ یعنی تم نے کیوں شہید کیا ﴿اللہ کے پیغمبروں کو اس سے پہلے اگر تمہیں اپنی کتاب پر ایمان تھا﴾ یعنی توریت پر حالانکہ تمہیں اس میں قتل انبیاء سے منع کیا گیا تھا اور خطاب حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے زمانہ میں موجود یہودیوں سے ہے کیونکہ وہ اپنے آباء واجداد کے کرتوت پر راضی تھے۔

توضیح و تشریح: قوله سواه او بعده الخ یہ لفظ وراء کے معنی کا بیان ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ وراء کا اطلاق تین معانی پر ہوتا ہے سویٰ، بعد، اَمام، یہاں پہلے دو معانی درست ہو سکتے ہیں اس میں بھی پہلا معنی انسب ہے کہ قرآن پاک سمیت جملہ آسمانی کتابوں اور صحائف کو شامل ہے اور مفسر علام نے اسی معنی کو اولیت دی ہے۔

قوله: حال ثانية موكدة. یہ ترکیب نحوی کی طرف اشارہ ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ "اذا قيل الخ شرط ہے قالوا الخ جواب شرط ہے، یکفرون الخ قالوا کی ضمیر سے حال ہے اور "و هو الحق" "بما" میں "ما" سے حال اول ہے اور مصدقا حال ثانی ہے جو مضمون جملہ کی تاکید کرتا ہے۔

قوله: اى قتلتم. تقتلون کی تفسیر صیغہ ماضی سے کر کے اشارہ فرمایا حکایت حال ماضیہ کی جانب، آگے بما فعل اٰبائهم سے اشارہ فرمایا کہ تقتلون میں اسناد مجازی ہے کیونکہ انبیاء علیہم السلام کے قاتل زمانہ رسالت کے یہودی نہیں تھے بلکہ ان کے آباء واجداد تھے چونکہ موجودہ یہودی اپنے آباء کے اس فعل قبیح پر راضی تھے اس لئے قتل کی نسبت ان کی طرف کر دی گئی۔

خیال رہے یہاں یہود کے ایمانی دعویٰ کے بطلان پر دلیل کی طرف اشارہ ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ یہود نے چونکہ قرآن کا انکار کر دیا اور قرآن مصدق توراۃ ہے، لہٰذا قرآن کے انکار سے توریت کا انکار لازم آیا اور اگر تسلیم بھی کر لیا جائے کہ قرآن کے انکار سے توریت کا انکار لازم نہیں آتا، تو ایک دوسری وجہ سے انکار توریت لازم آتا ہے اور وہ یہ ہے کہ توریت میں قتل انبیاء سے ممانعت ہے اور تمہارے آباواجداد نے انبیاء کو شہید کیا جس سے تم بھی راضی ہو یہ اس بات پر دلیل ہے کہ تم توریت پر ایمان رکھنے کے دعویٰ میں جھوٹے ہو کہ اگر ایمان رکھتے تو قتل انبیاء کا ارتکاب نہ کرتے

﴿وَ لَقَدْ جَائَكُمْ مُوسىٰ بِالْبَيِّنٰتِ﴾ اَيِ الْمُعْجِزَاتِ كَالْعَصَا وَ الْيَدِ وَ فَلْقِ الْبَحْرِ ﴿ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ﴾ اِلٰهًا ﴿مِنْۢ بَعْدِهٖ﴾ اَىْ بَعْدَ ذِهَابِهٖ اِلَى الْمِيْقَاتِ ﴿وَ اَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ۝﴾ بِاتِّخَاذِهٖ ﴿وَ اِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ﴾ عَلَى الْعَمَلِ بِمَا فِى التَّوْرٰةِ ﴿وَ﴾ قَدْ ﴿رَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ﴾ اَلْجَبَلَ حِيْنَ امْتَنَعْتُمْ مِنْ قَبُوْلِهَا

لِيُسْقَطَ عَلَيْكُمْ وَ قُلْنَا ﴿خُذُوا مَا اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ﴾ بِجِدٍّ وَّ اِجْتِهَادٍ ﴿وَ اسْمَعُوا﴾ مَا تُؤْمَرُوْنَ بِهٖ سِمَاعَ قَبُوْلٍ ﴿قَالُوا سَمِعْنَا﴾ قَوْلَكَ ﴿وَ عَصَيْنَا﴾ اَمْرَكَ ﴿وَ اُشْرِبُوْا فِیْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ﴾ اَیْ خَالَطَ حُبُّهٗ قُلُوْبَهُمْ كَمَا يُخَالِطُ الشَّرَابُ ﴿بِكُفْرِهِمْ قُلْ﴾ لَهُمْ ﴿بِئْسَمَا﴾ شَيْئًا ﴿يَاْمُرُكُمْ بِهٖ اِيْمَانُكُمْ﴾ بِالتَّوْرٰةِ عِبَادَةَ الْعِجْلِ ﴿اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ۝﴾ بِهَا كَمَا زَعَمْتُمُ الْمَعْنٰى لَسْتُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ لِاَنَّ الْاِيْمَانَ لَا يَاْمُرُ بِعِبَادَةِ الْعِجْلِ وَ الْمُرَادُ اٰبَاؤُهُمْ اَیْ فَكَذٰلِكَ اَنْتُمْ لَسْتُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ بِالتَّوْرٰةِ وَ قَدْ كَذَّبْتُمْ مُحَمَّدًا صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَ الْاِيْمَانُ بِهَا لَا يَاْمُرُ بِتَكْذِيْبِهٖ.

ترجمہ: ﴿اور بے شک تمہارے پاس موسیٰ کھلی نشانیاں لے کر آئے﴾ یعنی معجزات جیسے عصا، ید بیضا اور دریائے قلزم کا پھاڑنا ﴿پھر تم نے بنالیا بچھڑے کو﴾ معبود ﴿اس کے بعد﴾ یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے میقات کو تشریف لے جانے کے بعد ﴿اور تم ظالم تھے﴾ اسے معبود بنا کر ﴿اور یاد کرو جب ہم نے لیا تم سے پختہ وعدہ﴾ توریت کے احکام پر عمل کرنے کا ﴿اور کوہ طور کو تمہارے سروں پر بلند کیا﴾ یعنی طور نام کا پہاڑ جب کہ تم نے اسے قبول کرنے سے انکار کردیا، تم پر گرانے کے لئے اور ہم نے فرمایا ﴿پکڑلو جو ہم نے تمہیں دیا مضبوطی سے﴾ پوری کوشش سے ﴿اور سنو﴾ جو تمہیں حکم دیا جاتا ہے قبولیت کے سننے کے طور پر ﴿بولے ہم نے سن لیا﴾ تیرا قول ﴿اور نہ مانا﴾ تیرے حکم کو ﴿اور ان کے دلوں میں بچھڑا رچ رہا تھا﴾ یعنی اس کی محبت ان کے دلوں میں پیوست ہوگئی تھی جیسے شراب سرایت کر جاتی ہے ﴿ان کے کفر کے سبب، تم فرمادو﴾ ان سے ﴿کیا برا حکم دیتا ہے تم کو تمہارا ایمان﴾ یعنی ایمان بالتورات، بچھڑے کی پرستش کی ﴿اگر ایمان رکھتے ہو﴾ توریت پر جیسا کہ تمہارا گمان ہے مطلب یہ کہ تم مومن نہیں ہو کیونکہ ایمان بچھڑا پوجنے کا حکم نہیں دیتا اور مراد ان کے آباء واجداد ہیں یعنی انھیں کی طرح تمہارا ابھی توریت پر ایمان نہیں کہ تم نے تو محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو جھٹلا دیا حالانکہ توریت حضور کو جھٹلانے کی اجازت نہیں دیتی۔

توضیح و تشریح: قوله: المعجزات. یہ بینات کا معنی مراد ہے، بعض حضرات نے اس سے کتاب تورات مراد لی ہے مگر یہ بہتر نہیں کہ توریت واحد اور بینات جمع ہے۔

قولہ: الھاً. یہ اتخاذ کے مفعول ثانی محذوف کی طرف اشارہ ہے، جس سے یہ وضاحت مقصود ہے کہ یہاں اتخاذ ابتداء صنعت کے معنی میں نہیں جو صرف ایک مفعول چاہتا ہے جیسے اتخذت سیفا ای صنعته کیونکہ اس صورت میں لازم آئے گا کہ عجل سازی کا کام بنی اسرائیل نے انجام دیا ہو، اور یہ خلاف واقعہ ہے، لہٰذا مفسر علام نے مفعول ثانی الٰھا محذوف مان کر واضح کیا کہ یہاں اتخاذ بمعنی جعل ہے جو متعدی بدو مفعول ہوتا ہے، اس صورت میں مذکورہ خرابی لازم نہیں آئے گی اور اول نظر میں ذہن کا تبادر سامری ہی کی طرف ہوگا کیونکہ اللہ کے طور پہ عجل سازی کا کام اسی نے انجام دیا تھا۔ (ترویح الارواح ملخصاً)

قولہ: بعد ذھابہ — یہ حذف مضاف کی طرف اشارہ ہے جس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ من بعدہ سے بظاہر یہ مفہوم ہوتا ہے کہ بچھڑا بنانے کا عمل حضرت موسیٰ علیہ السلام کے وصال کے بعد ہوا تھا تو اشارہ فرمایا کہ یہاں ایک مضاف

محذوف ہے اور مراد یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کوہ طور پر جانے کے بعد یہ واقعہ ہوا۔

قوله: على العمل بما في التوراة. اس تفسیر سے اشارہ فرمایا کہ یہاں میثاق سے وہ عمومی میثاق مراد نہیں جو ازل میں تمام بنی نوع انسان سے الست بربکم کی صورت میں ہوا تھا آگے لفظ قد محذوف مان کر حضرت مفسر نے اشارہ کر دیا کہ یہاں ماضی بتقدیر قد حال واقع ہے اس سے یہ اعتراض بھی ختم ہو گیا کہ "رفعنا" پر قد داخل نہیں لہٰذا اس کا حال بننا بھی صحیح نہیں۔

قوله: حبه قلوبهم. اس میں بھی مضاف محذوف کی طرف اشارہ ہے کہ بچھڑا کا دل میں سمانا ممکن نہیں۔

قوله: الشراب. یعنی یہاں اشربوا الخ میں استعارہ بالکنایہ ہے جس کی توضیح یہ ہے کہ گوسالہ پرستی کی محبت کو شراب لذیذ سے تشبیہ دی گئی ہے۔ وجہ شبہ لذت ہے، پھر مشبہ بہ "شراب" کو حذف کر دیا گیا اور اس کی طرف اشارہ اس کے لوازم میں سے ایک چیز "اشراب" سے کر دیا گیا، اور عجل کے لئے اشراب کا ثبوت استعارہ تخییلیہ ہے آیت کا مفہوم یہ ہے کہ جس طرح شراب معدہ میں پہنچ کر انسان کو مست اور مخمور کر دیتی ہے اسی طرح بچھڑے کی محبت کی لذت نے انھیں مخمور بنا دیا تھا۔ (صاوی ملخصاً)

قوله: المغنى لستم بمؤمنين الخ یہاں سے حضرت مفسر نے آیت کے مفہوم سے قیاس حملی کی شکل اول بنا کر اس کا نتیجہ ذکر کیا ہے جس کی تقریر یوں ہے کہ: "اعتقادكم ما يأمركم بعبادة العجل (صغریٰ) و كلّ ما يأمر بعبادة العجل فهو كفر (کبریٰ) فاعتقادكم كفر (نتیجہ ہے) آگے فكذلك انتم سے بھی مفسر علام نے قیاس حملی کی شکل اول کی طرف اشارہ فرمایا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ "اعتقادكم يأمركم بتكذيب محمد (صغریٰ) و كلّ ما يأمر بذلك فهو كفر (کبریٰ) فاعتقادكم كفر (نتیجہ) یہ دراصل یہود کے ایمانی دعویٰ کا ایک اور بطلان ہے۔

فائدہ: شریعت کے احکام پر جبراً عمل کرانا جائز ہے جیسا کہ بنی اسرائیل کے سروں پر کوہ طور لا کر ان سے احکام توریت پر جبراً عمل کرایا گیا مگر یہ جبر بادشاہ اسلام یا اس کے نائب کی طرف سے ہو۔

(۲) بچھڑے کی پرستش اور بنی اسرائیل کے سروں پر کوہ طور اٹھانے کا ذکر پہلے بھی ہو چکا ہے مگر وہاں سمعنا و عصینا کے ذکر کے ساتھ نہ تھا اور یہاں ہے، لہٰذا حقیقۃً واقعہ کا تکرار نہیں۔

﴿قُلْ﴾ لَهُمْ ﴿إِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْآخِرَةُ﴾ أَيِ الْجَنَّةُ ﴿عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَةً﴾ خَاصَّةً ﴿مِنْ دُوْنِ النَّاسِ﴾ كَمَا زَعَمْتُمْ ﴿فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ إِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ۝﴾ تَعَلَّقَ بِتَمَنِّيْهِ الشَّرْطَانِ عَلٰى أَنَّ الْأَوَّلَ قَيْدٌ فِي الثَّانِيْ أَيْ إِنْ صَدَقْتُمْ فِيْ زَعْمِكُمْ أَنَّهَا لَكُمْ وَ مَنْ كَانَتْ لَهُ يُؤْثِرُهَا وَ الْمُوْصِلُ إِلَيْهَا الْمَوْتُ فَتَمَنَّوْهُ ﴿وَ لَنْ يَّتَمَنَّوْهُ أَبَدًا بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيْهِمْ﴾ مِنْ كُفْرِهِمْ بِالنَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْمُسْتَلْزِمِ لِكَذِبِهِمْ ﴿وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ بِالظّٰلِمِيْنَ۝﴾ الْكَافِرِيْنَ فَيُجَازِيْهِمْ ﴿وَ لَتَجِدَنَّهُمْ﴾ لَامُ قَسَمٍ ﴿أَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ﴾ وَ أَحْرَصَ ﴿مِنَ الَّذِيْنَ أَشْرَكُوْا﴾ الْمُنْكِرِيْنَ لِلْبَعْثِ عَلَيْهَا لِعِلْمِهِمْ بِأَنَّ مَصِيْرَهُمْ إِلَى النَّارِ دُوْنَ الْمُشْرِكِيْنَ

لِاِنْكَارِهِمْ لَهٗ ﴿يَوَدُّ﴾ يَتَمَنّٰى ﴿اَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ﴾ لَوْ مَصْدَرِيَّةٌ بِمَعْنٰى اَنْ وَهِيَ بِصِلَتِهَا فِيْ تَاْوِيْلِ مَصْدَرٍ مَفْعُوْلُ يَوَدُّ ﴿وَ مَا هُوَ﴾ اَيْ اَحَدُهُمْ ﴿بِمُزَحْزِحِهٖ﴾ مُبْعِدِهٖ ﴿مِنَ الْعَذَابِ﴾ اَلنَّارِ ﴿اَنْ يُعَمَّرَ﴾ فَاعِلُ مُزَحْزِحِهٖ اَيْ تَعْمِيْرُهٗ ﴿وَ اللّٰهُ بَصِيْرٌ بِمَا يَعْمَلُوْنَ٥﴾ بِالْيَاءِ وَ التَّاءِ فَيُجَازِيْهِمْ.

ترجمہ: ﴿آپ فرمائیے﴾ ان سے ﴿اگر تمہارے لئے ہی دار آخرت﴾ یعنی جنت ﴿اللہ کے نزدیک مخصوص ہے تمام لوگوں کو چھوڑ کر﴾ جیسا کہ تمہارا گمان ہے ﴿تو بھلا موت کی آرزو تو کرو اگر تم سچے ہو﴾ تمنائے موت کے ساتھ دو شرطیں اس طرح متعلق ہیں کہ پہلی شرط دوسری کے لئے قید ہے یعنی اگر تم اپنے گمان میں سچے ہو کہ دار آخرت تمہارے لئے مخصوص ہے اور جس کے لئے آخرت مخصوص ہوگی وہ اس کو ترجیح دے گا اور اس تک پہنچانے والی چیز چونکہ موت ہے لہٰذا تم موت کی تمنا کرو ﴿اور ہرگز کبھی اس کی آرزو نہ کریں گے ان بداعمالیوں کے سبب جو آگے کر چکے﴾ یعنی حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ساتھ اپنے کفر کے سبب جو حضور کی تکذیب کو مستلزم ہے ﴿اور اللہ خوب جانتا ہے ظالموں کو﴾ یعنی کافروں کو تو وہ انھیں سزا دے گا ﴿اور بے شک تم ضرور انھیں پاؤ گے﴾ لام قسمیہ ہے ﴿کہ سب لوگوں سے زیادہ جینے کی ہوس رکھتے ہیں﴾ اور زیادہ حریص ہیں ﴿مشرکوں سے﴾ جو کہ بعث بعد الموت کے منکر ہیں، کیونکہ انھیں یقین ہے کہ ان کا ٹھکانہ جہنم ہے۔ نہ کہ مشرکین کو کہ وہ آخرت ہی کے منکر ہیں ﴿چاہتا ہے﴾ تمنا کرتا ہے ﴿ہر ایک ان میں سے کہ کہیں ہزار برس جیئے﴾ لو مصدر یہ بمعنی ان ہے اور اپنے صلہ کے ساتھ مل کر بتاویل مفرد ہو کر یود کا مفعول ہے ﴿اور وہ﴾ ان میں سے کوئی بھی ﴿نہیں بچا سکتا اسے﴾ دور نہیں کر سکتا اس کو ﴿عذاب سے﴾ آگ سے ﴿جیتے رہنا﴾ یہ مزحزحہ کا فاعل ہے یعنی تعمیرہ کے معنی میں ہے ﴿اور اللہ ہر وقت دیکھ رہا ہے جو کچھ وہ کرتے ہیں﴾ یعملون یا اور تا کے ساتھ ہے لہٰذا وہ انھیں بدلہ دے گا۔

توضیح و تشریح: قولہ: ای الجنۃ. یہ دوزخ سے احتراز کے لئے ہے چونکہ دار آخرت میں عموم ہے، جنت اور دوزخ دونوں کو شامل ہے مگر یہود خود کو صرف جنت کا مستحق تصور کرتے تھے اس لئے مفسر علام نے دار الآخرت کی تفسیر جنت سے کی۔

قولہ: تعلق بتمنیہ الشرطان الخ یہاں سے مفسر علام نے ایک قاعدہ کی طرف اشارہ کیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ جب دو شرطیں جمع ہو جائیں اور دونوں کا ایک ہی جواب دونوں کے درمیان واقع ہو تو شرط اول دوسری شرط کی قید ہو جاتی ہے اور جواب دوسری شرط کا ہوتا ہے، یہاں آیت میں ترکیب کی یہی صورت ہے کہ شرط اول ان کانت الخ اور شرط ثانی ان کنتم الخ ہے اور دونوں کا جواب فتمنوا الموت درمیان میں واقع ہے، لہٰذا یہاں شرط اول شرط ثانی کی قید ہوگی اور جواب دوسری شرط کا ہوگا، تقدیری عبارت یوں ہوگی، ان کنتم صدقین فی زعمکم ان الدار الآخرۃ لکم خاصۃ فتمنوا الموت (صاوی)

قولہ: المستلزم لکذبھم. یہ بھی شکل اول کا نتیجہ ہے جس سے یہود کے اس دعویٰ کا بطلان ثابت ہوتا ہے کہ لن یدخل الجنۃ الا من کان ھودا، شکل اور اس کا نتیجہ یوں ہے۔ ان کانت لکم الدار الآخرۃ (مقدم) فتمنوا

الموت (تالی) یعنی اس سے تالی مستفاد ہے جو یہ ہو سکتی ہے "فلا محالة من أن یوجد منکم تمنی الموت" لن یتمنوه ابداً (نقیض تالی) اور تالی کا عدم مقدم کے عدم کا نتیجہ برآمد ہوتا ہے اور یہاں چونکہ تالی معدوم ہے۔ لہٰذا مقدم بھی معدوم ہوا گویا یہود کا موت کی تمنا نہ کرنا اپنے لئے دار آخرت کی تخصیص کے دعویٰ کے کذب کو مستلزم ہے، مفسر علام کے قول المستلزم لکذبهم کا یہی مطلب ہے۔

قوله: الکافرین فیجازیهم. یہ اشارہ ہے اس امر کی طرف کہ آیت میں ظلم سے ظلم کامل یعنی کفر مراد ہے اور علم کنایہ ہے جزاء سے کہ اگر ظلم کا عام معنی مراد ہو تو کافر و مسلم سبھی اس کے عموم میں داخل ہو جائیں گے، اور ظاہر ہے یہ معنی یہاں مراد نہیں، اسی طرح اگر لفظ علیم کو اس کے اصلی معنی پر محمول کیا جائے تو تحصیل حاصل لازم آئے گا کیونکہ ہر عاقل جانتا ہے کہ اللہ علیم و خبیر ہے پھر یہاں یہ خبر دینا کہ اللہ تعالیٰ علیم ہے چہ معنی دارد؟

قوله: لام قسم. اس تفسیر سے حضرت مفسر نے اشارہ فرمایا ہے کہ و لتجدنهم کا عطف لن یتمنوه پر ہے اور عدم تمنائے موت کی تاکید ہے، جملہ معترضہ نہیں جیسا کہ بعضوں نے کہا ہے کیونکہ اس صورت میں لام تاکید کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ (ترویح الارواح)

قوله: لعلمهم بان الخ یہ دفع دخل مقدر ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ بنی اسرائیل آخرت اور نعمائے آخرت کے نہ صرف یہ کہ قائل ہیں بلکہ خود کو اس کا مستحق سمجھتے ہیں، رہے مشرکین، تو وہ سرے سے بعث بعد الموت کے ہی منکر ہیں پھر یہاں مشرکین کے مقابلہ میں بنی اسرائیل کو دنیاوی زندگی پر زیادہ حریص کیوں بتایا جا رہا ہے؟ جب کہ عقلاً مشرکین کو دنیاوی زندگی پر زیادہ حریص ہونا چاہئے تھا۔

مفسر علام نے اسی مذکورہ شبہ کے جواب کی طرف اشارہ کیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ مشرکین چونکہ آخرت کے قائل نہیں ہیں، اس لئے وہ آخرت کی جزا و سزا سے بے پرواہ اور غافل ہیں کہ مرنے کے بعد کا کھٹکا نہیں رکھتے، مگر یہود کو بعث بعد الموت کا یقین ہے اور وہ جزا و سزا کے اسباب سے خوب واقف ہیں اور چونکہ وہ کفر کے دلدل میں پھنسے ہیں اس لئے انھیں اپنے جہنم رسید ہونے کا پورا یقین ہے لہٰذا وہ دنیاوی زندگی کو عذاب آخرت سے بچے رہنے کا ذریعہ سمجھتے ہیں اور اس پر مشرکین کے مقابلہ میں زیادہ حریص ہیں۔

قوله: لو مصدریة الخ یہ آیت کی ترکیب نحوی کی طرف اشارہ ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ یود احدهم فعل با فاعل لو مصدریہ بمعنی ان یعمر الف سنة صلہ ہے پورا جملہ بتاویل مفرد ہو کر یود کا مفعول ہے۔

قوله: فاعل مزحزحه الخ یہ بھی ترکیب نحوی کی طرف اشارہ ہے، اس کا ماحصل یہ ہے کہ ما هو میں ما حجازیہ نافیہ ہے اور هو راجع بسوئے احد اس کا اسم ہے، بمزحزحه میں با زائد ہے اور مزحزحه دراصل یزحزحه کی تاویل میں فعل ہے، من العذاب اسی کے متعلق ہے اور ان یعمر بتاویل مصدر مزحزحه کا فاعل ہے پھر مزحزحہ اپنے متعلق اور فاعل سے مل کر جملہ خبریہ ہو کر ما کی خبر واقع ہے۔ اصل عبارت یوں ہے و ما احدهم بمن یزحزحه من النار تعمیره

ایک شبہ کا ازالہ: یہاں یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ قرآن وحدیث نے موت کی تمنا سے منع فرمایا ہے، پھر یہود کو تمنائے موت کی ترغیب کیوں دی گئی؟ اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ بلا ضرورت محض دنیوی تکلیف سے گھبرا کر موت کی تمنا کرنا ممنوع ہے، مگر اخروی راحت حاصل کرنے کے لئے تمنائے موت جائز ہے۔ جیسے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے لشکر کفار کے سردار رستم بن فرخ زاد کے پاس خط بھیجا اور اس میں تحریر فرمایا تھا کہ ان معنا قوم یحبون الموت کما یحب الاعاجم الخمر یعنی میرے ساتھ ایسی قوم ہے جو موت کو اتنا محبوب رکھتی ہے جتنا عجمی شراب کو اور چونکہ یہود سے اخروی راحت حاصل کرنے کے لئے ہی تمنائے موت کرائی گئی تھی اس لئے وہ بلاشبہ جائز ہے۔ (خزائن العرفان ملخصاً)

وَسَأَلَ ابْنُ صُورِيَا النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَوْ عُمَرَ عَمَّنْ يَأْتِيْ بِالْوَحْيِ مِنَ الْمَلَائِكَةِ فَقَالَ جِبْرَئِيْلُ! فَقَالَ هُوَ عَدُوُّنَا يَأْتِيْ بِالْعَذَابِ وَ لَوْكَانَ مِيْكَائِيْلُ لَاٰمَنَّا لِاَنَّهُ يَأْتِيْ بِالْخِصْبِ وَ السِّلْمِ فَنَزَلَ ﴿قُلْ﴾ لَهُمْ ﴿مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ﴾ فَلْيَمُتْ غَيْظًا ﴿فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ﴾ اَيِ الْقُرْاٰنَ ﴿عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ﴾ بِاَمْرِ ﴿اللّٰهِ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ﴾ قَبْلَهٗ مِنَ الْكِتَابِ ﴿وَ هُدًى﴾ مِنَ الضَّلَالَةِ ﴿وَ بُشْرٰى﴾ بِالْجَنَّةِ ﴿لِلْمُؤْمِنِيْنَ ٥ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَ مَلٰٓئِكَتِهٖ وَ رُسُلِهٖ وَ جِبْرِيْلَ﴾ بِكَسْرِ الْجِيْمِ وَ فَتْحِهَا بِلَا هَمْزَةٍ وَ بِهٖ بِيَاءٍ وَ دُوْنِهَا ﴿وَمِيْكٰلَ﴾ عَطْفٌ عَلَى الْمَلَائِكَةِ مِنْ عَطْفِ الْخَاصِّ عَلَى الْعَامِّ وَ فِيْ قِرَاءَةٍ مِيْكَائِيْلَ بِهَمْزَةٍ وَ يَاءٍ وَ فِيْ اُخْرٰى بِلَا يَاءٍ ﴿فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ ٥﴾ اَوْقَعَهٗ مَوْقِعَ لَهُمْ بَيَانًا لِحَالِهِمْ ﴿وَ لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ﴾ يَا مُحَمَّدُ ﴿اٰيٰتٍ بَيِّنٰتٍ﴾ وَاضِحَاتٍ حَالٌ رَدٌّ لِقَوْلِ ابْنِ صُوْرِيَا لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا جِئْتَنَا بِشَيْءٍ ﴿وَ مَا يَكْفُرُ بِهَآ اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ﴾ أَكَفَرُوْا بِهَا ﴿اَوَ كُلَّمَا عٰهَدُوْا﴾ اللّٰهَ ﴿عَهْدًا﴾ عَلَى الْاِيْمَانِ بِالنَّبِيِّ اِنْ خَرَجَ اَوِ النَّبِيِّ اَنْ لَا يُعَاوِنُوْا عَلَيْهِ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿نَّبَذَهٗ﴾ طَرَحَهٗ ﴿فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ﴾ بِنَقْضِهٖ جَوَابُ كُلَّمَا وَهُوَ مَحَلُّ الْاِسْتِفْهَامِ الْاِنْكَارِيِّ ﴿بَلْ﴾ لِلْاِنْتِقَالِ ﴿اَكْثَرُهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ٥ وَ لَمَّا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ﴾ مُحَمَّدٌ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ﴿مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ نَبَذَ فَرِيْقٌ مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ كِتٰبَ اللّٰهِ﴾ اَيِ التَّوْرٰةَ ﴿وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ﴾ اَيْ لَمْ يَعْمَلُوْا بِمَا فِيْهَا مِنَ الْاِيْمَانِ بِالرَّسُوْلِ وَغَيْرِهٖ ﴿كَاَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ٥﴾ مَا فِيْهَا مِنْ اَنَّهٗ نَبِيٌّ حَقٌّ اَوْ اَنَّهَا كِتٰبُ اللّٰهِ

ترجمہ: ابن صوریا نے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم یا حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا کہ فرشتوں میں سے کون سا فرشتہ وحی لاتا ہے؟ فرمایا جبریل! ابن صوریا نے کہا وہ تو ہمارا دشمن ہے، عذاب لے کر آتا ہے، اگر وحی لانے والے میکائیل ہوتے تو ہم ضرور ایمان لے آتے کہ وہ خوش حالی اور سلامتی لے کر آتے ہیں۔ تو یہ آیت نازل ہوئی۔ ﴿آپ فرمایئے﴾ ان سے ﴿جو کوئی جبریل کا دشمن ہو﴾ تو چاہئے کہ وہ غصہ سے مرجائے ﴿کہ اس نے اتارا﴾ قرآن ﴿آپ کے دل پر اللہ تعالیٰ کے حکم سے اگلی کتابوں کی تصدیق فرماتا﴾ قرآن سے پہلی کتابوں کی ﴿اور ہدایت﴾ گمراہی سے ﴿اور خوش خبری ہے﴾ جنت کی ﴿ایمان والوں کے لئے جو کوئی دشمن ہو اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کے رسولوں اور جبریل

کا﴾ جیم کے کسرہ اور فتحہ کے ساتھ اور ہمزہ و یا کے ساتھ اور بغیر یاء کے بھی ہے ﴿اور میکائیل کا﴾ ملائکہ پر عطف ہے عطف خاص علی العام کے طور پہ اور ایک قراءت میں میکائیل ہمزہ اور یا کے ساتھ ہے اور دوسری میں بغیر یاء کے ہے ﴿تو اللہ دشمن ہے کافروں کا﴾ اسم ظاہر (کافرین) کا استعمال ضمیر (لهم) کی جگہ ہوا ہے ان کا حال بیان کرنے کے لئے ﴿اور بے شک ہم نے اتارے ہیں آپ پر﴾ اے محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ﴿روشن آیتیں﴾ واضح دلائل، یہ حال واقع ہے اور ابن صوریا کے اس قول کا رد ہے جو اس نے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے کہا تھا کہ آپ ہمارے پاس کچھ لے کر نہیں آئے ﴿اور ان کے منکر نہ ہوں گے مگر فاسق لوگ﴾ کیا انھوں نے ان آیات کا انکار کیا ﴿اور کیا جب کبھی کوئی عہد کرتے ہیں﴾ اللہ تعالیٰ سے، حضور پر ایمان لانے کا اگر آپ مبعوث ہوں، یا حضور سے کہ ان کے خلاف مشرکین کی مدد نہ کریں گے ﴿اسے توڑ دیتا ہے﴾ اسے پھینک دیتا ہے ﴿ان میں کا ایک فریق﴾ عہد شکنی کر کے، یہ کلما کا جواب اور محل استفہام انکاری ہے ﴿بلکہ﴾ یہ لفظ انتقال کے لئے ہے (ایک غرض سے دوسری غرض کی جانب) ﴿ان میں بہتیروں کو ایمان نہیں، اور جب ان کے پاس تشریف لایا اللہ کے یہاں سے ایک رسول﴾ محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ﴿ان کی کتابوں کی تصدیق فرماتا تو کتاب والوں سے ایک گروہ نے پھینک دی اللہ کی کتاب﴾ یعنی توریت کو ﴿اپنی پشتوں کے پیچھے﴾ یعنی عمل نہ کیا اس کے احکام مثلاً ایمان بالرسول وغیرہ پر ﴿گویا وہ کچھ علم نہیں رکھتے﴾ جو کچھ اس میں ہے آپ کے نبی برحق ہونے یا قرآن کے کتاب اللہ ہونے کے متعلق۔

توضیح و تشریح: قوله النبی او عمر الخ یہ شان نزول سے متعلق دو روایتوں کی طرف اشارہ ہے ایک روایت یہ ہے کہ یہودیوں کے عالم عبد اللہ بن صوریا نے حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے کہا، آپ کے پاس آسمان سے کون فرشتہ آتا ہے؟ فرمایا جبریل! ابن صوریا نے کہا وہ ہمارا دشمن ہے، عذاب شدت اور خسف اتارتا ہے، کئی مرتبہ ہم سے عداوت کر چکا ہے، اگر آپ کے پاس میکائیل آتے تو ہم آپ پر ایمان لے آتے۔ (خزائن العرفان)

دوسری روایت یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی زمین مدینہ منورہ سے باہر تھی اور اس کے قریب یہودیوں کا ایک مدرسہ تھا، آپ جب اپنی زمین دیکھنے جاتے تو اس مدرسہ میں ضرور جاتے، ایک دن آپ اس مدرسہ میں پہنچے تو وہاں بہت سارے یہود علما جمع تھے، سب نے آپ کا خیر مقدم کیا اور کہا کہ ہم آپ سے محبت کرتے ہیں اور غالباً آپ بھی ہم سے محبت رکھتے ہیں کہ آپ کے سوا اور کوئی صحابی ہمارے مدرسہ میں نہیں آتا فرمایا اے یہودیو! میں اس لئے نہیں آتا ہوں کہ مجھے تم سے کوئی محبت ہے، یا اپنے دین میں کوئی شک یا تمہارے دین کی طرف کچھ میلان ہے، میں تو صرف اس لئے آتا ہوں کہ تمہاری کتابوں سے قرآن کی حقانیت اور حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے فضائل معلوم کر کے اپنا ایمان اور قوی کروں۔ الحمد للہ اتنے روز کی آمد و رفت میں اپنے دین پر میرا یقین اور بڑھ گیا ہے اور تمہاری بدنصیبی پر افسوس کرتا ہوں کہ تم توریت میں اس نبی کے ایسے فضائل دیکھ کر بھی ان پر ایمان نہیں لاتے۔ تب ان یہودیوں نے کہا کہ جبریل ہمارے دشمن ہیں وہ ہمارے راز تمہارے نبی تک پہنچا دیتے ہیں اور ہم پر ساری مصیبتیں انھیں کے ہاتھوں آئیں، میکائیل ہمارے دوست ہیں کہ وہ بارش اور رحمت لاتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ جبریل اور میکائیل کا بارگاہ الٰہی میں کیا درجہ ہے؟، وہ بولے کہ دونوں بہت ہی مقرب بارگاہ ہیں

دونوں پر تجلی الٰہی ہوتی ہے، جبرئیل داہنی طرف اور میکائیل بائیں طرف رہتے ہیں حضرت عمر نے فرمایا کہ تم جیسے گدھوں سے زیادہ بے عقل کون ہوگا؟ جب وہ دونوں مقبول بارگاہ ہیں پھر جو ایک کا دشمن ہے وہ دونوں کا دشمن اور جو دونوں کا دشمن وہ رب کا دشمن، یہ کہہ کر آپ حضور کی خدمت میں روانہ ہوئے ابھی راستہ ہی میں تھے کہ حضور پر اسی مضمون کی یہ آیت کریمہ نازل ہوئی، جب حاضر بارگاہ ہوئے تو حضور نے فرمایا اے عمر! رب نے تیرے کلام کی موافقت فرمائی۔ (تفسیر عزیزی)

قوله: بکسر الجیم الخ یہ لفظ جبریل میں چار قراءتوں کا بیان ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ لفظ جبریل چار طرح سے پڑھا جاتا ہے، اولاً جِبریل بروزن قندیل، یعنی بکسر الجیم بلا ہمزہ، ثانیاً جَبریل بروزن شمویل یعنی بفتح الجیم بلا ہمزہ، ثالثاً جَبرئیل بروزن سلسبیل، یعنی بفتح الجیم مع ہمزہ اور یاء کے ساتھ، رابعاً جَبرَئل بروزن جحمرش یعنی بفتح الجیم مع ہمزہ بغیر یاء کے ہے (صاوی)

خیال رہے یہ چاروں قراءتیں سبعی ہیں اور عبارت میں بلا ہمزہ کا تعلق کسرۂ جیم اور فتح جیم دونوں سے ہے اور بہ کا مرجع صرف فتح جیم ہے۔

قوله: من عطف الخاص علی العام یہ دفع دخل مقدر ہے جس کی توضیح یہ ہے کہ ملائکہ میں جبریل ومیکائیل داخل ہیں پھر الگ سے ان کا ذکر تحصیل حاصل ہوا۔

حاصل جواب یہ ہے کہ اگرچہ یہ دونوں حضرات بھی ملائکہ میں داخل ہیں مگر چونکہ انھیں دیگر فرشتوں پر فضل وشرف حاصل ہے اور محل نزاع یہی تھے اس لئے عام پر خاص کا عطف کرتے ہوئے ان کا ذکر علیحدہ کردیا گیا، لہٰذا یہاں کسی اعتراض کی گنجائش نہیں۔

قوله: بھمز و یاء الخ یہ لفظ میکائیل میں دیگر دو سبعی قراءتوں کا بیان ہے، اس کا حاصل یہ ہے کہ لفظ میکائیل میں تین قراءتیں ہیں۔ اولاً میکائیل یعنی ہمزہ اور یاء کے ساتھ، ثانیاً میکائَل یعنی ہمزہ کے ساتھ بغیر یاء کے۔ ثالثاً میکال یعنی بغیر ہمزہ اور یاء کے یہی قراءت آیت میں ہے۔

قوله: اوقعه موقع لھم الخ اسم ضمیر کی جگہ اسم ظاہر لانے کے فائدہ کا بیان ہے، یعنی کافرین کا ذکر ماقبل میں ہوچکا تھا اس لئے عدو للکفرین کی بجائے عدولھم کہنا کافی تھا مگر اسم ضمیر "ھم" کی جگہ اسم ظاہر "کافرین" اس لئے آیا کہ یہود کا حال بیان کرنا مقصود ہے یعنی یہ کہ یہود ملائکہ کی عداوت کی وجہ سے کافر ہوگئے۔

قوله: کفروا بھا. اس تفسیر سے مفسر علام نے اشارہ فرمایا ہے کہ آیت میں ہمزہ استفہامیہ محذوف پر داخل ہے اور واؤ عاطفہ ہے اسی محذوف پر آگے عاھدوا کے بعد کلمۂ جلالت ظاہر کرکے اشارہ فرمایا کہ آیت میں لفظ عاھدوا بمعنی اعطوا ہے جو دو مفعول چاہتا ہے ایک مفعول کلمۂ جلالت ہے جو مقدر ہے اور دوسرا مفعول عہداً ہے۔

قوله: علی الایمان بالنبی الخ یہاں سے لفظ عہد میں دو احتمال کی طرف اشارہ ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہاں عہد کے معنی مراد میں دو احتمال ہیں اولاً یہ کہ اس سے وہ عہد مراد ہو جو کہ توریت میں حضور نبی آخرالزماں صلی اللہ تعالیٰ علیہ

وسلم پر ایمان لانے کے متعلق یہود سے لیا گیا تھا، ثانیاً یہ کہ اس سے مراد وہ عہد ہو جو یہود مدینہ یعنی بنی قریظہ اور بنی نضیر نے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے کیا تھا کہ ہم آپ کے دشمنوں کی آپ کے مقابلہ میں کبھی مدد نہ کریں گے۔

قوله: بنقضه. عہد کا پہلا معنی مراد ہو تو مطلب یہ ہوا کہ انھوں نے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی رسالت کا انکار کر کے عہد شکنی کی، اور اگر دوسرا معنی مراد ہو تو عہد شکنی یہ ہے کہ انھوں نے جنگ خندق کے موقع پر مشرکین مکہ کی مدد کی تھی اور مسلمانوں کی خفیہ خبریں کفار قریش کو بھیجتے تھے۔

قوله: ای لم یعلموا الخ یہاں سے بتانا مقصود ہے کہ آیت میں لفظ نبذ کا حقیقی معنی ''پھینکنا'' مراد نہیں ہے بلکہ اس سے احکام توریت پر عمل نہ کرنا مراد ہے۔

فوائد نافعه: (۱) جبرئیل عبرانی لفظ ہے ایل کا معنی خدا، جبر کا معنی ''عبد'' جبرئیل کا معنی ہوا عبداللہ، آپ کا اصل نام ''عبدالجلیل'' اور کنیت ''ابوالفتوح'' ہے۔ انبیاء کرام کے پاس پیغام خداوندی لانے کی خدمت انھیں کے سپرد تھی۔ (نزہۃ القاری جلد اول ص ۲۰۶، دائرۃ البرکات، گھوسی)

(۲) جبرئیل امین کی ملکوتی شکل یہ ہے، ان کے چھ سو بازو ہیں جن سے موتی اور یاقوت جھڑتے ہیں، اتنے عظیم ہیں کہ پورے افق کو گھیر لیتے ہیں۔ (ایضاً)

(۳) حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حضرت جبرئیل امین کو دو مرتبہ ان کی ملکوتی شکل میں دیکھا۔ (ایضاً)

﴿وَ اتَّبَعُوْا﴾ عَطفٌ عَلٰی نَبَذَ ﴿مَا تَتْلُوْا﴾ اَیْ تَلَتْ ﴿الشَّیٰطِیْنُ عَلٰی﴾ عَهْدِ ﴿مُلْكِ سُلَیْمٰنَ﴾ مِنَ السِّحْرِ وَ كَانَتْ دَفَنَتْهُ تَحْتَ كُرْسِیِّهٖ لَمَّا نُزِعَ مُلْكُهٗ اَوْ كَانَتْ تَسْتَرِقُ السَّمْعَ وَ تَضُمُّ اِلَیْهِ اَكَاذِیْبَ وَ تُلْقِیْهِ اِلَی الْكَهَنَةِ فَیُدَوِّنُوْنَهٗ وَ فَشَا ذٰلِكَ وَ شَاعَ اَنَّ الْجِنَّ تَعْلَمُ الْغَیْبَ فَجَمَعَ سُلَیْمٰنُ الْكُتُبَ وَ دَفَنَهَا فَلَمَّا مَاتَ دَلَّتِ الشَّیٰطِیْنُ عَلَیْهَا النَّاسَ فَاسْتَخْرَجُوْهَا فَوَجَدُوْا فِیْهَا السِّحْرَ فَقَالُوْا اِنَّمَا مَلَكَكُمْ بِهٰذَا فَتَعَلَّمُوْهُ وَ رَفَضُوْا كُتُبَ اَنْبِیَائِهِمْ قَالَ تَعَالٰی تَبْرِیَةً لِسُلَیْمٰنَ وَرَدًّا عَلَی الْیَهُوْدِ فِیْ قَوْلِهِمْ اُنْظُرُوْا اِلٰی مُحَمَّدٍ یَذْكُرُ سُلَیْمٰنَ فِی الْاَنْبِیَاءِ وَ مَا كَانَ اِلَّا سَاحِرًا ﴿وَ مَا كَفَرَ سُلَیْمٰنُ﴾ اَیْ لَمْ یَعْمَلِ السِّحْرَ لِاَنَّهٗ كُفْرٌ ﴿وَ لٰكِنَّ﴾ بِالتَّشْدِیْدِ وَ التَّخْفِیْفِ ﴿الشَّیٰطِیْنَ كَفَرُوْا یُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ﴾ اَلْجُمْلَةُ حَالٌ مِنْ ضَمِیْرِ كَفَرُوْا.

ترجمه: ﴿اور اس کے پیرو ہوئے﴾ اس کا عطف نبذ پر ہے ﴿جو پڑھا کرتے تھے﴾ تتلو امضارع بمعنی تلت ماضی ہے۔ ﴿شیطان، سلیمان کے عہد حکومت میں﴾ یعنی جادو جسے حضرت سلیمان علیہ السلام کی سلطنت کے زوال کے وقت شیاطین نے ان کی کرسی کے نیچے دفن کر دیا تھا، یا شیاطین فرشتوں کی باتیں چھپ کر سن لیتے تھے اور اس میں بہت سے جھوٹ ملا کر کاہنوں کو سنا دیتے پھر کاہن اسے مرتب کر لیتے، اس طرح جادو پھیل گیا اور یہ بات مشہور ہوگئی کہ جنات غیب جانتے ہیں، پھر حضرت سلیمان علیہ السلام نے جادو کی کتابیں جمع کر کے انہیں دفن کر دیا، مگر جب آپ کی وفات ہوگئی تو شیاطین نے لوگوں کو اس کی خبر دے دی، چنانچہ لوگوں نے اسے نکالا تو اس میں انھیں سحر ملا، شیاطین نے کہا حضرت سلیمان علیہ

السلام اسی سحر کی وجہ سے تم پر حکومت کرتے تھے پھر لوگ اسے سیکھنے لگے اور انبیاء کی کتابیں چھوڑ بیٹھے اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کی براءت اور یہود کے اس قول کے رد میں "محمد کو دیکھو سلیمان کو انبیاء میں شمار کرتے ہیں حالانکہ وہ محض ایک جادوگر تھے" ارشاد فرمایا ﴿اور سلیمان نے کفر نہ کیا﴾ یعنی سحر کا عمل نہ کیا کہ وہ کفر ہے ﴿ہاں﴾ لکن تشدید اور تخفیف کے ساتھ ہے ﴿شیاطین کافر ہوئے لوگوں کو جادو سکھاتے ہیں﴾ یہ جملہ کفروا کی ضمیر سے حال واقع ہے۔

توضیح و تشریح: قولہ: ای تلت. اس سے اشارہ فرمایا کہ آیت میں لفظ تتلو امضارع بمعنی ماضی حکایت حال ماضیہ کے طور پہ ہے کیونکہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد شیاطین کا آسمان پر جانے اور فرشتوں کی گفتگو سننے کا سلسلہ موقوف ہو گیا، لہٰذا استراق سماع ماضی میں ہوا ہے جسے مضارع کے صیغہ سے بیان فرمایا۔

قولہ: عہد. اس لفظ سے اشارہ فرمایا کہ آیت میں "علی" بمعنی "فی" ہے اور چونکہ فی ظرفیت کے لئے آتا ہے اس لئے لفظ ملک سے پہلے "عہد" پوشیدہ ہوگا تقدیری عبارت یہ ہے: "و اتبعوا ما تلت الشیطن فی عهد ملك سلیمان"

قولہ: لما نزع ملکه الخ زوال سلطنت کا اجمالی واقعہ یہ ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس وہ انگوٹھی تھی جسے حضرت آدم علیہ السلام جنت سے لے کر آئے تھے۔ اس کی خاصیت یہ تھی کہ جو اسے پہنتا وہ دنیا و مافیہا کا مالک ہو جاتا ایک مرتبہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے بیت الخلاء جاتے وقت وہ انگوٹھی اپنی بیوی "امینہ" کو دے دیا، ادھر شیطان آپ کی صورت بنا کر آیا اور انگوٹھی طلب کی، آپ کی بیوی نے اسے انگوٹھی دے دی، شیطان نے وہ انگوٹھی پہن لی اور تخت سلیمان پر جا بیٹھا، جب حضرت سلیمان علیہ السلام آئے اور انگوٹھی طلب کی تو بیوی حیران سی رہ گئی اور واقعہ بیان کیا، حضرت سلیمان علیہ السلام سمجھ گئے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے کوئی آزمائش ہے۔

شیطان جس کا نام صخر المارد تھا چالیس دن تک آپ کی کرسی پر بیٹھا حکومت کرتا رہا، اس درمیان شیاطین نے جادو کی کتابیں کرسی کے نیچے دفن کر دیا، پھر چالیس دن مکمل ہونے پر حضرت سلیمان علیہ السلام بحکم الٰہی دوبارہ تخت نشین ہوئے اور شیطان کو سزا دی۔ (صاوی)

قولہ: قال تعالیٰ تبریة الخ یہ شان نزول کا بیان ہے، حضرت صدر الافاضل علیہ الرحمہ نے تفسیر خزائن العرفان میں فرمایا کہ یہودی حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے زمانہ تک اسی حال میں رہے یعنی سحر کو حضرت سلیمان علیہ السلام کا علم اور انھیں ساحر کہتے رہے یہاں تک کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی براءت میں یہ آیت نازل ہوئی۔

قولہ: لانه کفر۔ یہ حکم شریعت موسوی کا ہے کہ اس میں سحر کرنا کرانا مطلقاً کفر تھا مگر شریعت محمدیہ میں حکم سحر میں تفصیل ہے جو آگے آرہی ہے۔

قولہ: الجملة حال الخ یہ ترکیب نحوی کی طرف اشارہ ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ لکن حرف مشبہ بالفعل ہے اور شیاطین اس کا اسم ہے، کفروا فعل ہے اس میں ضمیر فاعل ذوالحال ہے اور یعلمون الخ حال واقع ہے، ذوالحال حال سے مل کر فاعل ہوا پھر فعل فاعل سے مل کر جملہ فعلیہ خبریہ ہو کر خبر واقع ہے۔

سحر کی تعریف اور اس کے احکام:

سحر کا لغوی معنی ہے ''چھپی چیز'' جادو کو سحر اسی لئے کہتے ہیں کہ اس کی حقیقت چھپی ہوتی ہے۔ صاحب تاج العروس سحر کی حقیقت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں و اصل السحر صرف الشئ عن حقیقته الی غیره فکان الساحر لما اری الباطل فی صورة الحق و خیل الشئ علی غیر حقیقته فقد سحر الشئ عن وجهه ای صرفه یعنی سحر کا اصل معنی ہے کسی چیز کو اس کی حقیقت سے دوسری طرف پھیر دینا گویا جب ساحر جھوٹ کو سچ کر کے دکھاتا ہے اور پھر چیز اپنی حقیقت کے خلاف نظر آنے لگتی ہے تو گویا اس نے اس شی کی حقیقت کو بدل دیا۔ (بحوالہ ضیاء القرآن)

اصطلاح میں اسباب خفیہ سے بے توسل جناب الٰہی افعال عجیبہ پر قدرت حاصل کرنے کو سحر کہتے ہیں۔ (حقانی)

سحر کے احکام حسب ذیل ہیں، جو شخص سحر کی صحت کا اعتقاد رکھے یعنی اسے مباح تصور کرے اور اسے موثر حقیقی جانے وہ کافر ہے۔ (۲) جو سحر کفر ہے اس کا عامل اگر مرد ہو تو قتل کر دیا جائے اور عورت ہو تو اسے قید میں ڈال دیا جائے گا۔ (۳) جو سحر کفر نہیں مگر اس سے جانیں ہلاک کی جاتی ہیں اس کا عامل قطاع طریق کے حکم میں ہے۔ (۴) ساحر کی توبہ قبول ہے۔ (۵) سحر کا سیکھنا سکھانا اس وقت کفر ہے جب کہ اس میں کفریہ کلمات یا کفریہ شرطیں ہوں اور اسے عمل کے لئے سیکھا یا سکھایا جائے۔ اور اگر حق و باطل میں امتیاز کے لئے ہو تو سیکھنا سکھانا دونوں جائز ہے بشرطیکہ اس کے کفریات کا معتقد نہ ہو۔ (خزائن العرفان وغیرہ)

﴿وَ﴾ يُعَلِّمُونَهُمْ ﴿مَا اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ﴾ اَیْ اُلْهِمَاهُ مِنَ السِّحْرِ وَ قُرِئَ بِكَسْرِ اللَّامِ الْكَائِنَيْنِ ﴿بِبَابِلَ﴾ بَلَدٌ فِیْ سَوَادِ الْعِرَاقِ ﴿هَارُوْتَ وَ مَارُوْتَ﴾ بَدَلٌ اَوْ عَطْفُ بَيَانٍ لِلْمَلَكَيْنِ قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ هُمَا سَاحِرَانِ كَانَا يُعَلِّمَانِ السِّحْرَ وَ قِيْلَ مَلَكَانِ اُنْزِلَا لِتَعْلِيْمِهٖ اِبْتِلَاءً مِّنَ اللّٰهِ لِلنَّاسِ ﴿وَ مَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ﴾ زَائِدَةٌ ﴿اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَا﴾ لَهٗ نُصْحًا ﴿اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ﴾ بَلِيَّةٌ مِنَ اللّٰهِ لِلنَّاسِ لِيَمْتَحِنَهُمْ بِتَعْلِيْمِهٖ فَمَنْ تَعَلَّمَهٗ كَفَرَ وَ مَنْ تَرَكَهٗ فَهُوَ مُؤْمِنٌ ﴿فَلَا تَكْفُرْ﴾ بِتَعَلُّمِهٖ فَاِنْ اَبٰى اِلَّا التَّعَلُّمَ عَلَّمَاهُ ﴿فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَ زَوْجِهٖ﴾ بِاَنْ يُّبْغِضَ كُلًّا اِلَى الْاٰخَرِ ﴿وَ مَا هُمْ﴾ اَيِ السَّحَرَةُ ﴿بِضَارِّيْنَ بِهٖ﴾ بِالسِّحْرِ ﴿مِنْ﴾ زَائِدَةٌ ﴿اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾ بِاِرَادَتِهٖ ﴿وَ يَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّهُمْ﴾ فِی الْاٰخِرَةِ ﴿وَ لَا يَنْفَعُهُمْ﴾ وَ هُوَ السِّحْرُ ﴿وَ لَقَدْ﴾ لَامُ قَسَمٍ ﴿عَلِمُوْا﴾ اَيِ الْيَهُوْدُ ﴿لَمَنْ﴾ لَامُ اِبْتِدَاءٍ مُعَلِّقَةٌ لِمَا قَبْلَهَا مِنَ الْعَمَلِ وَ مَنْ مَوْصُوْلَةٌ ﴿اشْتَرٰهُ﴾ اِخْتَارَهٗ اَوْ اِسْتَبْدَلَهٗ بِكِتَابِ اللّٰهِ ﴿مَا لَهٗ فِی الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ﴾ نَصِيْبٌ فِی الْجَنَّةِ ﴿وَ لَبِئْسَمَا﴾ شَيْئًا ﴿شَرَوْا﴾ بَاعُوْا بِهٖ ﴿اَنْفُسَهُمْ﴾ اَيِ الشَّارِيْنَ اَیْ حَظَّهَا مِنَ الْاٰخِرَةِ اَنْ تَعَلَّمُوْهُ حَيْثُ اَوْجَبَ لَهُمُ النَّارَ ﴿لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝﴾ حَقِيْقَةَ مَا يَصِيْرُوْنَ اِلَيْهِ مِنَ الْعَذَابِ مَا تَعَلَّمُوْهُ ﴿وَ لَوْ اَنَّهُمْ﴾ اَیِ الْيَهُوْدُ ﴿اٰمَنُوْا﴾ بِالنَّبِیِّ وَ الْقُرْاٰنِ ﴿وَ اتَّقَوْا﴾ عِقَابَ اللّٰهِ بِتَرْكِ مَعَاصِيْهِ كَالسِّحْرِ وَ جَوَابُ لَوْ مَحْذُوْفٌ اَیْ لَاُثِيْبُوْا دَلَّ عَلَيْهِ ﴿لَمَثُوْبَةٌ﴾ ثَوَابٌ وَ هُوَ مُبْتَدَأٌ وَ اللَّامُ فِيْهِ لِلْقَسَمِ

﴿مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ خَيْرٌ﴾ خَبَرُهٗ مِمَّا شَرَوْا بِهٖ اَنْفُسَهُمْ ﴿لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ﴾ اِنَّهٗ خَيْرٌ لَمَا اٰثَرُوْهُ عَلَيْهِ.

حل اللغات: ﴿الهماه من السحر﴾ جو جادو ان دونوں کو الہام کیا گیا ﴿فی سواد العراق﴾ عراق کے اطراف میں ﴿ابتلاء﴾ آزمائش کرنا ﴿نصحاً﴾ بطور نصیحت ﴿بلیة﴾ آزمائش ﴿فان ابی الا التعلم﴾ تو اگر سیکھنے پر اصرار کرتے ﴿ما یفرقون به﴾ جس کے ذریعہ جدائی کرتے ﴿بان یبغض کلا الی الآخر﴾ کہ دونوں ایک دوسرے کے دشمن ہو جائیں ﴿اختاره﴾ اسے اختیار کیا ﴿حظها من الآخرة﴾ اپنا آخرت کا حصہ ﴿لما اٰثروه﴾ اسے ترجیح نہ دیتے۔

ترجمہ: ﴿اور﴾ انھیں سکھاتے تھے ﴿وہ جو اتارا گیا دو فرشتوں پر﴾ یعنی جس سحر کا دونوں پر الہام ہوا، اور ایک قراءت میں لام کے کسرہ کے ساتھ (ملِکین) پڑھا گیا ہے، رہتے تھے۔ ﴿بابل میں﴾ اطراف عراق کا ایک شہر ہے۔ ﴿جن کے نام ہاروت اور ماروت تھے﴾ یہ بدل ہے یا ملکین کا عطف بیان ہے، حضرت ابن عباس نے فرمایا کہ وہ دونوں جادوگر تھے (لوگوں کو) جادو سکھاتے تھے اور کہا گیا ہے کہ وہ دو فرشتے تھے جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے بطور آزمائش لوگوں کو جادو سکھانے کے لئے اتارے گئے تھے ﴿اور وہ دونوں کچھ نہ سکھاتے﴾ من زائدہ ہے ﴿کسی کو جب تک یہ نہ کہہ لیتے﴾ سیکھنے والے سے بطور نصیحت ﴿ہم تو نری آزمائش ہیں﴾ لوگوں کے لئے اللہ تعالیٰ کی جانب سے آزمائش ہیں تاکہ اسے سکھا کر لوگوں کا امتحان لیا جائے تو جو اسے سیکھے گا کافر ہو جائے گا اور جو اسے چھوڑ دے گا مومن رہے گا۔ ﴿تو اپنا ایمان نہ کھو﴾ اسے سیکھ کر تو جو اس کے سیکھنے پر اصرار کرتا اسے سکھا دیتے ﴿تو ان سے سیکھتے وہ جس سے جدائی ڈالیں مرد اور اس کی عورت میں﴾ کہ دونوں ایک دوسرے کے دشمن ہو جائیں ﴿اور نہیں پہنچا سکتے وہ﴾ جادوگر ﴿اس کے ذریعہ نقصان﴾ سحر کے ذریعہ ﴿کسی کو مگر خدا کے حکم سے﴾ اس کے ارادہ سے ﴿اور وہ سیکھتے ہیں جو انھیں نقصان دے گا﴾ آخرت میں ﴿نفع نہ دے گا﴾ یعنی سحر ﴿اور بے شک ضرور﴾ لام قسمیہ ہے ﴿انھیں معلوم ہے﴾ یعنی یہود کو ﴿کہ جس نے﴾ لام ابتدائیہ ہے جس نے اپنے ماقبل (علموا) کو عمل سے روک دیا اور من موصولہ ہے ﴿یہ سودا لیا﴾ اسے اختیار کیا یا کتاب اللہ کے بدلہ میں لیا ﴿آخرت میں اس کا کچھ حصہ نہیں﴾ جنت کا حصہ مراد ہے ﴿اور بے شک کیا بری چیز ہے وہ جس کے عوض انھوں نے بیچا﴾ جس کے عوض بیچا ﴿اپنی جانوں کو﴾ یعنی بیچنے والے اپنے آخرت کے حصہ کو، (اور وہ عوض) ان کا جادو سیکھنا ہے کیونکہ اس نے ان کے لئے جہنم واجب کر دیا ہے ﴿کاش وہ کچھ جانتے﴾ یعنی اس عذاب کی حقیقت کو جان لیتے جس کی طرف وہ جائیں گے تو وہ جادو نہ سیکھتے ﴿اور اگر وہ ایمان لاتے﴾ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور قرآن پر ﴿اور ڈرتے﴾ اللہ کے عذاب سے اس کی نافرمانیوں مثلاً سحر وغیرہ کو ترک کر کے، لو کا جواب محذوف ہے یعنی لاثیبوا جس پر دلالت کرتا ہے (آنے والا کلمہ) ﴿تو ثواب﴾ (لمثوبة) مبتدا ہے اور اس میں لام قسم کا ہے ﴿اللہ کے یہاں بہت اچھا ہوتا﴾ (خیر) اس کی خبر ہے یعنی بہت اچھا ہوتا اس سے جس کے عوض انھوں نے اپنے اخروی حصہ کو بیچ ڈالا ہے۔ ﴿کاش وہ کچھ جانتے﴾ کہ وہ بہتر ہے تو اس پر جادو کو ترجیح نہ دیتے۔

توضیح و تشریح: قوله: ای الهماه من السحر. یہ آیت میں لفظ "انزل" کے معنی مراد کا بیان ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ انزال جس طرح اتارنے کے معنی میں آتا ہے اسی طرح پیدا کرنے اور ڈالنے کے معنی میں بھی آتا ہے جیسا کہ

قرآن پاک میں ہے: "و انزلنا الحدید" (سورہ الحدید) "ہم نے لوہا پیدا کیا یا کانوں میں ڈالا" تو چونکہ سحر بذریعہ وحی نہیں آیا بلکہ قدرتی طور پہ ان کے دل پر القا ہوا، لہٰذا یہاں انزال اتارنے کے معنی میں نہیں بلکہ القاء یعنی ڈالنے کے معنی میں ہے اسی لئے مفسر علام نے اس کی تفسیر الہام سے کی۔

قوله: و قرئ بكسر اللام. یہ ملکین میں ایک قراءۃ شاذہ کا بیان ہے، اس تقدیر پر ہاروت ماروت حقیقی فرشتے نہیں بلکہ فرشتہ صفت انسان تھے جن پر علم سحر القاء ہوا اور نیک سیرت انسان پر ملک کا اطلاق ہوتا ہے جیسا کہ قرآن مجید میں حضرت یوسف علیہ السلام کے لئے ملك کا لفظ استعمال ہوا ہے ارشاد ہے: "ما هذا بشرا ان هذا الا ملك كريم.

لہٰذا قراۃ شاذہ میں ہاروت و ماروت کی ذات مراد ہے اور قراءۃ مشہورہ میں ان کی صفت، یہی حضرت ابن عباس اور بعض دیگر مفسرین کا قول ہے۔

قوله: الكائنين. یہ ببابل کے متعلق محذوف کی طرف اشارہ ہے، آگے مفسر علام نے بلد الخ سے شہر بابل کے محل وقوع کی نشاندہی فرمائی ہے، مورخین کے مطابق یہ دریائے فرات پر واقع ایک آباد اور مشہور شہر تھا جو ایک عرصہ تک عراق کا دار السلطنت رہا، پھر بخت نصر کے مرنے کے بعد تباہ ہو گیا اور اب دریائے فرات کے دونوں طرف اس شہر کے محض کھنڈرات ہیں۔

خیال رہے کہ لفظ "بابل" علمیت اور عجمہ کی وجہ سے غیر منصرف ہے۔

قوله: قال ابن عباس الخ مفسر علام نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا یہ قول بیان میں مقدم فرما کر اس کے قوی ہونے کی طرف اور دوسرے قول کو لفظ "قيل" سے ذکر کر کے اس کے ضعف کی طرف اشارہ فرمایا ہے، حالانکہ تحقیق اس کے برعکس ہے۔ کما سیاتی۔

قوله: لام ابتداء الخ یعنی لمن میں لام ابتداء ہے جس نے اپنے ماقبل یعنی علموا کو عمل سے روک دیا کیونکہ عمل کی صورت میں لام ابتداء کی صدارت باطل ہو جاتی۔

قوله: فمن تعلمه كفر. اس کا مطلب یا تو یہ ہے کہ شریعت موسوی میں مطلقاً جادو کا سیکھنا اور اس پر عمل کرنا کفر تھا، یا یہ مطلب ہے کہ جو اسے مؤثر حقیقی اور مباح جان کر سیکھے وہ کافر ہو جائے گا۔ واللہ تعالیٰ اعلم.

قوله: اختاره أو استبدل له یہ اشارہ ہے اس امر کی طرف کی یہاں اشتراء مجازاً اختیار یا استبدال کے معنی میں ہے، حقیقی معنی مراد نہیں، آگے شروا کی تفسیر باعوا سے کر کے یہ اشارہ فرمایا کہ کبھی شراء کا اطلاق بیع پر بھی ہوتا ہے جیسے "و شروه بثمن بخس" میں شراء بمعنی بیع ہے۔

قوله: شيئاً. اس سے اشارہ اس امر کی طرف ہے کہ آیت میں "ما" بمعنی شیئاً فاعل بئس کی تمیز ہے اور بئس کا فاعل اس میں پوشیدہ ضمیر "هو" ہے، بئس کا فاعل "ما" نہیں، لہٰذا یہ شبہ ختم ہو گیا کہ فاعل ذم مرفوع ہوتا ہے اور یہاں فاعل ذم یعنی ما بمعنی شیئاً منصوب ہے۔

قوله: اى الشارين الخ یہ انفسهم میں هم ضمیر کے مرجع کا تعین ہے کہ یہ ضمیر شارین کی طرف لوٹتی ہے جو

شروا کے ضمن میں موجود ہے، لہٰذا اضمار قبل الذکر لازم نہیں آتا، آگے ان تعلموہ سے اشارہ فرمایا کہ مخصوص بالذم مقدر ہے کیونکہ ما بمعنی شئ نکرہ ہے جو مخصوص بالذم نہیں بن سکتا کہ اس کا معرفہ ہونا ضروری ہوتا ہے۔

قولہ: حقیقۃ ما یصیرون الخ یہ ایک سوال مقدر کا جواب ہے، سوال یہ ہے کہ ماقبل میں یہود سے متعلق فرمایا، "و لقد علموا" جس سے معلوم ہوا یہود کو علم ہے، اور یہاں یہود ہی کے متعلق فرمایا "لو کانوا یعلمون" اس سے معلوم ہوا کہ انھیں علم نہیں، لہٰذا آیت کے دونوں حصوں میں تضاد ہوگیا، جواب کا حاصل یہ ہے کہ "و لقد علموا" کا معنی یہ ہے کہ یہود عذاب کو جانتے ہیں، اور "لو کانوا یعلمون" کا مطلب یہ ہے کہ حقیقت عذاب اور اس کی کیفیت کو نہیں جانتے، لہٰذا تضاد لازم نہیں آتا۔ (ترویح الارواح)

قولہ: وجواب لو الخ یہ بھی دفع دخل مقدر ہے، سوال یہ ہے کہ لو کے جواب کا فعل ماضی ہونا ضروری ہے مگر یہاں اس کا جواب "لمثوبۃ" جملہ اسمیہ ہے اور یہ درست نہیں، جواب کا حاصل یہ ہے کہ لو کا جواب لمثوبۃ نہیں کہ مذکورہ اعتراض لازم آئے بلکہ جواب لو محذوف ہے اور وہ لاثیبوا ہے جس پر لمثوبۃ دلالت کر رہا ہے۔ (ایضاً)

فائدہ: (۱) بابل کی وجہ تسمیہ یہ بیان کی گئی ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام نے کشتی سے اتر کر پہلے اسی جگہ قیام کیا اور اسی شہر کو بنایا اور اس کا نام ثمانین رکھا، ایک ہی دن میں یہاں اَسّی زبانیں جاری ہوگئیں تو حضرت نوح علیہ السلام نے فرمایا "قد تبلبلت السنتھم" یعنی ان کی زبانیں مختلف ہوگئیں، اسی مناسبت سے اس شہر کا نام بابل پڑ گیا۔ (صاوی)

(۲) ہاروت و ماروت سے جو سحر نکلا اس کا نام کلدائیں ہے، اس کی حقیقت یہ ہے کہ ہر جسم میں ایک قدرتی روح ہے خواہ وہ چاند سورج ہوں یا عناصر اربعہ (پانی، ہوا، آگ، مٹی) سحر کلدائیں میں تمام چیزوں کی ارواح کو اپنے تابع کر لیا جاتا ہے اس طرح کہ جس روح سے جیسا کام چاہے لے سکتا ہے۔ (تفسیر عزیزی)

قصۂ ہاروت و ماروت کے متعلق قول راجح:

قصۂ ہاروت ماروت تین طریقوں سے کتب تفاسیر میں منقول ہے، صحیح اور راجح قول یہ ہے کہ ہاروت ماروت دو فرشتے تھے جنھیں اللہ تعالیٰ نے بندوں کی آزمائش کے لئے علم سحر دے کر دنیا میں بھیجا، یہ فرشتے لوگوں کو علم سحر سکھاتے مگر پہلے بتا دیتے تھے کہ عمل سحر کفر و شرک ہے جو اسے سیکھے اور اس پر عمل کرے گا وہ کافر ہو جائے گا، اور جو اس سے بچے گا وہی مومن رہے گا، اس تصریح کے بعد بھی جو اپنے ایمان کی پرواہ نہ کرتا اور علم سحر کے سیکھنے پر مصر ہوتا اسے سکھا دیتے، اس طرح بندوں کا امتحان ہو جاتا کہ کون خدا کی رضا چاہتا ہے اور کون شیطان کی پیروی کرتا ہے۔

ہاروت ماروت کے واقعہ کی حقیقت اسی قدر ہے جو مذکور ہوئی اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ بے اصل گڑھی ہوئی کہانیاں ہیں، ثبوت کے لئے اعلیٰ حضرت محدث بریلوی قدس سرہ کی تحقیق پڑھئے فرماتے ہیں کہ "قصۂ ہاروت ماروت جس طرح عوام میں شائع ہے ائمہ کرام کو اس پر انکار شدید ہے جس کی تفصیل شفا شریف اور اس کی شرح میں ہے یہاں تک کہ امام

اجل قاضی عیاض رضی اللہ عنہ نے فرمایا "ھذہ الاخبار من کتب الیھود و افترائھم" یعنی یہ خبریں یہود کی کتابوں اور ان کی افتراء پردازیوں سے ہیں، راجح یہی ہے کہ ہاروت ماروت دو فرشتے ہیں جن کو رب عز و جل نے ابتلائے خلق کے لئے مقرر فرمایا جو سحر سیکھنا چاہے اسے نصیحت کریں کہ "انما نحن فتنة فلا تکفر" ہم تو آزمائش ہی کے لئے مقرر ہوئے ہیں تو کفر نہ کر، اور جو نہ مانے اپنے پاؤں جہنم میں جائے اسے تعلیم کریں، تو وہ طاعت میں ہیں نہ کہ معصیت میں۔ "بہ قال اکثر المفسرین علی ما عزا الیھم فی الشفاء الشریف۔ (فتاویٰ رضویہ، جلد۳، ص۲۰، رضا اکیڈمی بمبئی)

﴿یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا﴾ لِلنَّبِیِّ اَمْرٌ مِنَ الْمُرَاعَاةِ وَ کَانُوْا یَقُوْلُوْنَ لَهٗ ذٰلِکَ وَهِیَ بِلُغَةِ الْیَهُوْدِ سَبٌّ مِنَ الرُّعُوْنَةِ فَسُرُّوْا بِذٰلِکَ وَ خَاطَبُوْا بِهَا النَّبِیَّ فَنُهِیَ الْمُؤْمِنُوْنَ عَنْهَا ﴿وَ قُوْلُوْا﴾ بَدَلَهَا ﴿انْظُرْنَا﴾ اَیْ اُنْظُرْ اِلَیْنَا ﴿وَ اسْمَعُوْا﴾ مَا تُؤْمَرُوْنَ بِهٖ سِمَاعَ قَبُوْلٍ ﴿وَ لِلْکٰفِرِیْنَ عَذَابٌ اَلِیْمٌ﴾ مُؤْلِمٌ هُوَ النَّارُ ﴿مَا یَوَدُّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْکِتٰبِ وَ لَا الْمُشْرِکِیْنَ﴾ مِنَ الْعَرَبِ عَطْفٌ عَلٰی اَهْلِ الْکِتٰبِ وَ مِنْ لِلْبَیَانِ ﴿اَنْ یُّنَزَّلَ عَلَیْکُمْ مِنْ﴾ زَائِدَةٌ ﴿خَیْرٍ﴾ وَحْیٍ ﴿مِنْ رَّبِّکُمْ﴾ حَسَدًا لَکُمْ ﴿وَ اللّٰهُ یَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ﴾ بِنُبُوَّتِهٖ ﴿مَنْ یَّشَاءُ وَ اللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِیْمِ﴾

ترجمہ: ﴿اے ایمان والو! راعنا نہ کہو﴾ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بارگاہ میں، راع صیغہ امر ہے مراعاۃ سے مشتق ہے اور لوگ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بارگاہ میں اسے بولتے تھے حالانکہ یہ یہود کی زبان میں گالی ہے، رعونت (بمعنی حماقت) سے مشتق مان کر تو وہ اس لفظ سے خوش ہوتے اور حضور کو اسی کے ذریعہ مخاطب کرتے۔ لہٰذا مؤمنین کو اس سے روک دیا گیا، ﴿اور یوں عرض کرو﴾ بجائے اس کلمہ کے ﴿انظرنا﴾ یعنی حضور ہم پر نظر رکھیں ﴿اور پہلے ہی سے بغور سنو﴾ جس کا حکم تمہیں دیا جائے، قبولیت کے کان سے ﴿اور کافروں کے لئے دردناک عذاب ہے﴾ الیم بمعنی مؤلم ہے مراد جہنم ہے ﴿وہ جو کافر ہیں کتابی یا مشرک وہ نہیں چاہتے﴾ مشرکین سے مراد مشرکین عرب ہیں اس کا عطف اھل الکتب پر ہے اور من بیانیہ ہے ﴿کہ اتاری جائے تم پر﴾ من زائدہ ہے ﴿کوئی بھلائی﴾ مراد وحی ہے ﴿تمہارے رب کی طرف سے﴾ تم سے حسد کی وجہ سے ﴿اور اللہ اپنی رحمت سے خاص کرتا ہے﴾ یعنی نبوت سے ﴿جسے چاہے اور اللہ بڑے فضل والا ہے﴾

توضیح و تشریح: قولہ امر من المراعاۃ الخ یہ لفظ راع کی توضیح اور آیت کے شان نزول کا بیان ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ لفظ راع مراعات کا امر ہے لہٰذا راعنا کا معنی ہوا "ہماری رعایت فرمائیے"، مگر یہی لفظ راع اگر رعونت سے مشتق مانا جائے تو سوء ادب کا معنی پیدا ہوگا کہ رعونت کا معنی ہے احمق، کم عقل چنانچہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم صحابہ کو کچھ تعلیم و تلقین فرماتے تو وہ کبھی کبھی درمیان میں عرض کیا کرتے "راعنا یا رسول اللہ" اس کے یہ معنی تھے کہ "یا رسول اللہ ہمارے حال کی رعایت فرمائیے"، یعنی کلام اقدس کو اچھی طرح سمجھ لینے کا موقع دیجئے مگر یہود کی زبان میں یہ کلمہ چونکہ سوء ادب کا معنی رکھتا تھا لہٰذا انھوں نے اسی نیت سے کہنا شروع کیا، حضرت سعد بن معاذ یہود کی اصطلاح سے واقف تھے آپ نے ایک دن یہ کلمہ ان کی زبان سے سن کر فرمایا، اے دشمنان خدا! تم پر اللہ کی لعنت ہو اگر میں نے اب کسی کی زبان سے یہ کلمہ سنا تو اس کی

گردن ماردوں گا۔ یہود نے کہا ہم پر تو آپ برہم ہوتے ہیں مگر مسلمان بھی تو یہی کہتے ہیں، اس پر آپ رنجیدہ ہو کر خدمت اقدس میں حاضر ہوئے ہی تھے کہ یہ آیت نازل ہوئی جس میں "راعنا" کہنے کی ممانعت فرمادی گئی اور اس معنیٰ کا دوسرا لفظ "انظرنا" کہنے کا حکم ہوا۔ (صاوی، خزائن العرفان)

قوله: سماع قبول. اس سے مراد حضور قلب کے ساتھ سننا ہے یعنی مؤمنین کو یہ حکم دیا گیا کہ جب حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کوئی گفتگو فرمائیں تو اسے ہمہ تن گوش ہو کر سنو، تاکہ انظرنا بھی کہنے کی نوبت نہ آئے کیونکہ یہ بھی شان نبوت کے مناسب نہیں کہ ایک ایک بات تم بار بار پوچھتے رہو۔

قوله: حسداً لکم. یہ علت ہے ماقبل کے نفی کی یعنی یہود اور مشرکین عرب آپ پر نزول رحمت اور آپ کو منصب نبوت پر نہیں دیکھنا چاہتے کیونکہ وہ آپ سے حسد رکھتے ہیں، چنانچہ یہود کو یہ رنج تھا کہ نبوت جوان کی وراثت تھی بنی اسمٰعیل کو کیوں ملی، اور مشرکین کو یہ صدمہ تھا کہ نبی کا انتخاب مکہ وطائف کے رئیسوں میں سے کیوں نہیں کیا گیا، عبدالمطلب کے یتیم پوتے کا انتخاب ان کی ظاہر بیں نگاہوں میں ہرگز موزوں نہ تھا۔

فائدہ: (۱) حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی جناب میں راعنا کہنے کی ممانعت سے یہ ثابت ہوا کہ بارگاہ رسالت میں ہر ایسے لفظ کا استعمال ممنوع ہے جس میں کسی طرح کی تنقیص یا بے ادبی کا احتمال اور شائبہ ہو۔

(۲) مذکورہ ممانعت سے یہ بھی ثابت ہوا کہ انبیائے کرام کی انتہائی درجہ کی تعظیم وتوقیر مسلمانوں پر فرض ہے۔

(۳) بے ادبی کی نیت سے شان رسالت میں راعنا کا لفظ بولنے والوں کو قرآن نے کافر کہا جس سے یہ ثابت ہوا کہ انبیاء کرام کی بارگاہ میں ادنیٰ درجہ کی بے ادبی بھی کفر ہے۔ (خزائن العرفان وغیرہ)

وَ لَمَّا طَعَنَ الْكُفَّارُ فِى النَّسخِ وَ قَالُوا اِنَّ مُحَمَّدًا يَأمُرُ اَصحَابَهُ الْيَومَ بِاَمرٍ وَ يَنْهٰى عَنْهُ غَدًا نَزَلَ ﴿مَا﴾ شَرطِيَّةٌ ﴿نَنسَخْ مِنْ اٰيَةٍ﴾ اَىْ نُزِلَ حُكمُهَا اِمَّا مَعَ لَفظِهَا اَوْلَا وَ فِى قِرَاءَةٍ بِضَمِّ النُّونِ مِنْ اَنسَخَ اَىْ نَأمُرُكَ اَوْ جِبرَئِيلُ بِنَسْخِهَا ﴿اَوْ نُنسِهَا﴾ نُؤَخِّرْهَا فَلَا نُزِلَ حُكمُهَا وَ نَرفَعُ تِلَاوَتَهَا اَوْ نُؤَخِّرُهَا فِى اللَّوحِ الْمَحفُوظِ وَ فِى قِرَاءَةٍ بِلَا هَمزٍ مِنَ النِّسيَانِ اَىْ نُنسِهَا وَ نَمحُهَا مِنْ قَلبِكَ وَ جَوَابُ الشَّرطِ ﴿نَأتِ بِخَيرٍ مِّنْهَا﴾ اَنفَعَ لِلعِبَادِ فِى السُّهُولَةِ اَوْ كَثرَةِ الْاَجرِ ﴿اَوْ مِثلِهَا﴾ فِى التَّكلِيفِ وَ الثَّوَابِ ﴿اَلَم تَعلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيرٌ﴾ وَ مِنْهُ النَّسخُ وَ التَّبدِيلُ وَ الْاِستِفهَامُ لِلتَّقرِيرِ ﴿اَلَم تَعلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهُ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرضِ﴾ يَفعَلُ فِيهِمَا مَا يَشَاءُ ﴿وَ مَا لَكُمْ مِنْ دُونِ اللّٰهِ﴾ اَىْ غَيرِهِ ﴿مِنْ﴾ زَائِدَةٌ ﴿وَّلِيٍّ﴾ يَحفَظُكُمْ ﴿وَ لَا نَصِيرٍ﴾ يَمنَعُ عَذَابَهُ عَنكُمْ اِنْ اَتٰكُمْ.

ترجمہ: اور کفار نے جب نسخ کے تعلق سے طعنہ زنی کی اور کہنے لگے کہ محمد اپنے اصحاب کو آج ایک کام کرنے کا حکم دیتے ہیں اور کل اسی سے روک دیتے ہیں تو یہ آیت نازل ہوئی ﴿جب﴾ ماشرطیہ ہے ﴿کوئی آیت ہم منسوخ فرمائیں﴾ یعنی ہم اس کا حکم اٹھالیں خواہ لفظ کے ساتھ یا بغیر لفظ کے اور ایک قراءۃ میں نون کے ضمہ کے ساتھ (نُنسخ) ہے انسخ سے

مشتق ہے۔ یعنی ہم یا جبرئیل آپ کو اس کے نسخ کا حکم دیتے ہیں ﴿یا بھلا دیں﴾ یعنی ہم اسے مؤخر کر دیں کہ اس کا حکم تو زائل نہ کریں مگر اس کی تلاوت منسوخ کر دیں یا اسے ہم لوح محفوظ ہی میں مؤخر کر دیں اور ایک قراءۃ میں بلا ہمزہ (ننس) ہے نسیان سے مشتق ہے یعنی ہم اسے بھلا کر آپ کے دل سے محو کر دیں اور جواب شرط یہ ہے ﴿تو لاتے ہیں اس سے بہتر﴾ جو بندوں کے لئے زیادہ نفع بخش ہو سہولت یا کثرت ثواب کے لحاظ سے ﴿یا اس جیسی﴾ تکلیف اور ثواب میں ﴿کیا تجھے خبر نہیں کہ اللہ سب کچھ کر سکتا ہے﴾ اور اسی میں سے نسخ و تبدیل بھی ہے یہاں استفہام تقریری ہے ﴿کیا تجھے خبر نہیں کہ اللہ ہی کے لئے ہے آسمانوں اور زمین کی بادشاہی﴾ ان میں جو چاہتا ہے کرتا ہے ﴿اور تمہارا اللہ کے سوا﴾ علاوہ ﴿نہ کوئی حمایتی ہے﴾ جو تمہیں بچا سکے ﴿نہ مددگار﴾ کہ اگر تم پر اس کا عذاب آئے تو وہ تم سے روک دے۔

توضیح و تشریح: قولہ و لما طعن الکفار الخ یہ شان نزول کا بیان ہے جو ترجمہ سے واضح ہے، آگے حضرت مفسر نے ''شرطیہ'' کہہ کر ما کے شرطیہ ہونے کی طرف اشارہ فرمایا ہے جس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ ننسخ اسی ما شرطیہ کی وجہ سے مجزوم ہے۔ اور ترکیب میں ما ننسخ کا مفعول مقدم ہے۔

قولہ: ای نزل حکمھا الخ یہ نسخ کا معنی اور اس کی قسموں کا بیان ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ نسخ کا لغوی معنی ہے زائل کرنا، باطل کرنا، نقل کرنا، اور اصطلاح میں کسی حکم یا آیت کی تلاوت کی مدت کی انتہا بیان کرنے کو نسـخ کہتے ہیں (احمدیہ) اس کی تین قسمیں ہیں: (۱) نسخ حکم و تلاوت (۲) نسخ حکم، (۳) نسخ تلاوت۔ نسخ حکم و تلاوت یہ ہے کہ نہ آیت کا حکم باقی رہے اور نہ اس کی تلاوت جیسے ایک آیت تھی: "عشر رضعات معلومات" جس سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ عورت کا دودھ دس گھونٹ پینے سے رضاعت ثابت ہوگی، مگر اب نہ اس آیت کی تلاوت رہی نہ اس کا حکم رہا بلکہ اب ایک گھونٹ سے بھی رضاعت ثابت ہو جاتی ہے۔ نسخ حکم یہ ہے کہ آیت قرآن میں موجود ہے، اس کی تلاوت بھی ہوتی ہے مگر اس کا حکم باقی نہیں، جیسے متاعاً الی الحول غیر اخراج اس سے ثابت ہوتا ہے کہ عدت وفات ایک سال ہے، مگر یہ حکم باقی نہیں بلکہ اب عدت وفات چار ماہ دس دن ہے، مفسر علام نے اما مع لفظھا او لا سے مذکورہ دونوں قسموں کی طرف اشارہ فرمایا تیسری قسم کا ذکر آگے ہے۔

قولہ: و فی قراءۃ بضم النون الخ یہ ننسخ میں ایک اور متواتر قراءۃ کا بیان ہے یعنی دوسری قراءۃ میں "ننسخ" بضم النون ہے۔ اس صورت میں یہ باب افعال سے مشتق ہوگا اور اس میں تصییر کی خاصیت پائی جائے گی۔ اور اس قراءت کی تقدیر پر معنی ہوگا کہ ''ہم اس کے نسخ کا حکم دیتے ہیں'' یا یہ معنی ہوگا کہ ''جبرئیل اس کے نسخ کا حکم دیتے ہیں''۔

قولہ: فلا نزل حکمھا الخ یہ نسخ کی تیسری قسم یعنی نسخ تلاوت کا بیان ہے اور نسخ تلاوت یہ ہے کہ آیت کے الفاظ قرآن میں نہ ہوں اور نہ ہی نماز وغیرہ میں اس کی تلاوت جائز ہو مگر اس کا حکم باقی رہے جیسے "الشیخ و الشیخۃ اذا زنیا فارجموھما" جب شادی شدہ مرد اور عورت زنا کر بیٹھیں تو انھیں سنگسار کر دو، اس آیت کی تلاوت منسوخ ہے مگر اس کا حکم باقی ہے۔

قولہ: و فی قراءۃ بلا ھمز الخ ہماری قراءۃ "ننسھا" بلا ہمزہ ہے اور دوسری قراءۃ "ننسأھا" ہمزہ کے ساتھ

ہے، جسے مفسر علام نے اپنے پیش نظر نسخہ کے مطابق برعکس بیان کیا ہے، بہر حال ننسأھا مشتق ہے نساء سے جس کا لغوی معنی ہے ''دیر کرنا'' اور ''ننسھا مشتق ہے نسیان سے جس کا لغوی معنی ہے ''بھول جانا'' پہلی صورت میں معنی ہوگا جس آیت کے اتارنے میں ہم دیر لگاتے ہیں اسے مفسر علام نے نوخرھا الخ سے بیان فرمایا یعنی ہم اسے لوح محفوظ میں مؤخر کر دیتے ہیں کہ تمہیں اس کی خبر نہ دیں گے، دوسری صورت میں معنی ہوگا کہ ''جس آیت کو ہم بھلا دیتے ہیں'' یہ دراصل آیت کے منسوخ ہونے کی ایک کیفیت کا بیان ہے کہ بعض آیتیں اس طرح منسوخ ہو جاتی تھیں کہ صحابۂ کرام اسے بھول جاتے یعنی قدرتی طور پر ان کے اذہان سے آیت محو ہو جاتی تھی جیسا کہ حضرت صدر الافاضل قدس سرہ نے بیہقی کے حوالہ سے یہ روایت نقل فرمائی کہ ایک انصاری صحابی شب کو تہجد کے لئے اٹھے اور سورۂ فاتحہ کے بعد جو سورت ہمیشہ پڑھا کرتے تھے اس کو پڑھنا چاہا، لیکن وہ بالکل یاد نہ آئی اور سوائے بسم اللہ کے کچھ نہ پڑھ سکے، صبح کو دوسرے صحابہ سے اس کا ذکر کیا، ان حضرات نے فرمایا ہمارا بھی یہی حال ہے، وہ سورت ہمیں بھی یاد تھی اور اب ہمارے حافظہ میں بھی نہ رہی، سب نے حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی خدمت میں واقعہ عرض کیا حضور نے فرمایا، آج شب وہ سورت اٹھالی گئی اس کے حکم اور تلاوت دونوں منسوخ ہوئے۔ جن کاغذوں پر وہ لکھی گئی تھی ان پر نقش تک باقی نہ رہے۔ (خزائن العرفان)

قولہ: انفع للعباد الخ یہ ناسخ کے بندوں کے حق میں بہتر ہونے اور نسخ کی ایک دوسری تقسیم کی طرف اشارہ ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ جہت کے اعتبار سے نسخ کی تین قسمیں ہیں (۱) آسان حکم سے مشکل حکم کا نسخ، جیسے وفات کی ایک سال کی عدت چار ماہ دس دن سے منسوخ ہوئی۔ (۲) مشکل حکم سے آسان حکم کا نسخ مگر اس مشکل میں ثواب زیادہ ہو، جیسے ترک جہاد کا حکم آیات جہاد سے منسوخ ہے مگر جہاد میں ثواب زیادہ ہے۔ (۳) مساوی کا مساوی سے نسخ یعنی منسوخ اور ناسخ آسانی اور ثواب میں برابر ہوں، جیسے بیت المقدس کا قبلہ ہونا منسوخ ہوا اور کعبہ شریف قبلہ بنا مگر ان دونوں قبلوں میں ثواب اور آسانی برابر ہے، اس آخری قسم کو مفسر علام نے فی التکلیف والثواب کہہ کر بیان کیا ہے۔

قولہ: و الاستفھام للتقریر — یہاں آیت الم تعلم الخ میں استفہام تقریر و اثبات کے لئے ہے۔ لہٰذا آیت کا معنی ہوگا کہ ''بے شک تم جانتے ہو کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے'' یہی مطلب آنے والی آیت کا بھی ہے، واللہ اعلم.

فائدہ: (۱) قیاس اور اجماع نہ منسوخ ہو سکتے ہیں نہ ناسخ صرف قرآنی آیات اور احادیث میں نسخ ہوا ہے۔ (تفسیر احمدیہ)

(۲) مستقل واجب اور مستقل حرام کی آیتیں منسوخ نہیں ہو سکتیں، جیسے ایمان کے وجوب اور کفر کی حرمت کی آیتیں۔ (تفسیر نعیمی)

(۳) قرآن و حدیث میں جس قدر نسخ ہونا تھا ہو گیا، اب حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی وفات شریف کے بعد کسی قسم کا نسخ ممکن نہیں کیونکہ اب نہ وحی آسکتی ہے اور نہ کوئی نئی حدیث۔ (حقانی ملخصاً)

(۴) نسخ کی چند وجوہات ہیں اولاً یہ کہ پہلا حکم عارضی طور پر کسی حکمت سے جاری کیا گیا تھا بعد میں ختم کر دیا گیا جیسے شریعت آدم علیہ السلام میں بہن سے نکاح اس لئے جائز تھا کہ دوسری عورتیں نہیں ملتی تھیں پھر سہولت پیدا ہونے پر یہ حکم منسوخ ہو گیا۔ ثانیاً یہ کہ کسی فعل کے لوگ عادی ہو چکے تھے اسے تدریجاً بند کرانا منظور تھا مثلاً اہل عرب پہلے شراب کے عادی تھے، اس

لئے پہلے شراب سے نفرت دلائی گئی، پھر نشہ کی حالت میں نماز سے روکا گیا پھر بالکل حرام کردی گئی۔ ثالثاً یہ کہ نسخ سے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی عظمت کا اظہار ہو جیسے قبلہ کی تبدیلی کا حکم کہ اس میں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی خواہش کا احترام مقصود تھا۔ رابعاً یہ کہ نسخ سے ناسخ کی عظمت معلوم ہو جیسے اسلام سے دوسرے ادیان کا منسوخ ہو جانا۔ (تفسیر نعیمی)

وَ نَزَلَ لَمَّا سَأَلَهُ اَهلُ مَكَّةَ اَنْ يُوَسِّعَهَا وَ يَجْعَلَ الصَّفَا ذَهَبًا ﴿اَمْ﴾ بَلْ ﴿تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَسْئَلُوا رَسُوْلَكُمْ كَمَا سُئِلَ مُوْسٰى﴾ اَىْ سَأَلَهُ قَوْمُهُ ﴿مِنْ قَبْلُ﴾ مِنْ قَوْلِهِمْ اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً وَ غَيْرَ ذٰلِكَ ﴿وَ مَنْ يَّتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ﴾ اَىْ يَاْخُذْهُ بَدَلَهُ بِتَرْكِ النَّظَرِ فِى الْاٰيَاتِ الْبَيِّنَاتِ وَ اقْتِرَاحِ غَيْرِهَا ﴿فَقَدْ ضَلَّ سَوَاءَ السَّبِيْلِ﴾ اَخْطَأَ طَرِيْقَ الْحَقِّ وَ السَّوَاءُ فِى الْاَصْلِ الْوَسَطُ ﴿وَدَّ كَثِيْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ﴾ مَصْدَرِيَّةٌ ﴿يَرُدُّوْنَكُمْ مِّنْ بَعْدِ اِيْمَانِكُمْ كُفَّارًا حَسَدًا﴾ مَفْعُوْلٌ لَهُ كَائِنًا ﴿مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ﴾ اَىْ حَمَلَتْهُمْ عَلَيْهِ اَنْفُسُهُمُ الْخَبِيْثَةُ ﴿مِّنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ﴾ فِى التَّوْرٰةِ ﴿الْحَقُّ﴾ فِىْ شَانِ النَّبِىِّ ﴿فَاعْفُوْا﴾ عَنْهُمْ اَىْ اُتْرُكُوْهُمْ ﴿وَ اصْفَحُوْا﴾ اَعْرِضُوْا فَلَا تُجَازُوْهُمْ ﴿حَتّٰى يَاْتِىَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ﴾ فِيْهِمْ مِنَ الْقِتَالِ ﴿اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ ٥ وَ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ وَ مَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ ٥﴾ طَاعَةٍ كَصَلٰوةٍ وَ صَدَقَةٍ ﴿تَجِدُوْهُ﴾ اَىْ ثَوَابَهُ ﴿عِنْدَ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ﴾ فَيُجَازِيْكُمْ بِهٖ.

ترجمہ: اور جب اہل مکہ نے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے مطالبہ کیا کہ آپ مکہ کو کشادہ فرما دیں اور کوہ صفا کو سونا بنا دیں تو یہ آیت نازل ہوئی ﴿کیا﴾ ام منقطعہ بمعنی بل ہے ﴿تم یہ چاہتے ہو کہ اپنے رسول سے ویسا سوال کرو جیسے پوچھے گئے موسیٰ﴾ یعنی ان سے ان کی قوم نے پوچھا ﴿اس سے پہلے﴾ مثلاً ان کا قول "ارنا اللہ جھرۃ وغیرہ" ﴿اور جو ایمان کے بدلہ کفر لے﴾ یعنی واضح نشانیوں میں غور وفکر نہ کر کے دوسری لغویات میں مصروف ہو کر ایمان کی بجائے کفر اختیار کرے۔ ﴿وہ ٹھیک راستہ بہک گیا﴾ راہ حق بھلا بیٹھا، سواء کا لغوی معنی وسط ہے۔ ﴿بہت کتابیوں نے چاہا کاش﴾ لو مصدریہ ہے ﴿تمہیں ایمان کے بعد کفر کی طرف پھیر دیں بوجہ اس حسد کے﴾ حسداً مفعول لہ ہے ﴿جو ان کے دلوں میں ہے﴾ یعنی انھیں حسد پر ان کے نفوس خبیثہ ابھارتے ہیں ﴿بعد اس کے کہ ان پر خوب واضح ہو چکا ہے﴾ توریت میں ﴿حق﴾ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے متعلق ﴿تو معاف کرتے رہو﴾ یعنی انھیں چھوڑے رکھو ﴿اور درگزر کرتے رہو﴾ صرف نظر کرتے رہو اور انھیں کوئی سزا نہ دو ﴿یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم لائے﴾ ان کے بارے میں جہاد کا ﴿بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے، اور نماز قائم رکھو اور زکوٰۃ دو اور اپنی جانوں کے لئے جو بھلائی آگے بھیجو گے﴾ نماز اور صدقہ جیسی عبادت ﴿اسے پاؤ گے﴾ یعنی اس کا ثواب ﴿اللہ کے یہاں﴾ بے شک اللہ تعالیٰ تمہارا کام دیکھ رہا ہے﴾ لہٰذا تمہیں اس کا بدلہ دے گا۔

توضیح و تشریح: قولہ: و نزل لما سألہ الخ یہ آنے والی آیت کے شان نزول کا بیان ہے جو حضرت ابن عباس اور مجاہد سے مروی ہے۔ جس کا قدرے تفصیلی ذکر حضرات مفسرین نے یوں کیا ہے کہ "عبداللہ بن امیہ مخزومی نے مع چند قریش حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہو کر یہ کہا کہ ہم آپ پر اس وقت ایمان لائیں گے جب آپ ہمارے

لئے مکہ کے خشک پہاڑوں میں سے چشمہ جاری کر دیں یا وہاں کھجور اور انگور کا باغ پیدا کر دیں یا صفا پہاڑ کو سونا بنا دیں یا آپ سیڑھی لگا کر آسمان پر چڑھ جائیں یا ہم پر کوئی خدا کی کتاب اترے جس میں یوں لکھا ہو کہ اے عبداللہ تو محمد پر ایمان لا۔

مگر مذکورہ روایت پر یہ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ سورہ بقرہ مدنی ہے اور اہل مکہ نے مذکورہ سوالات ہجرت سے قبل مکہ میں ہی کیا تھا لہٰذا یہ روایت شان نزول کے مطابق نہیں اس لئے آنے والی آیت کے شان نزول کے سلسلہ میں وہ روایت صحیح معلوم ہوتی ہے جسے حقانی اور ضیاء القرآن وغیرہ نے بیان کیا ہے اور جو جبائی اور ابو مسلم سے یوں مروی ہے کہ ''یہود مدینہ اہل اسلام کو طرح طرح کے شکوک وشبہات میں مبتلا کیا کرتے تھے تاکہ یہ لوگ دین اسلام سے برگشتہ ہو جائیں حالانکہ یہودیوں کو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی نبوت کا یقین کتب انبیاء اور حضور کے معجزات سے ہو چکا تھا مگر وہ حسد کی وجہ سے مسلمانوں میں شکوک پیدا کرتے تھے جس کی وجہ سے بعض سیدھے سادھے مسلمان حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے الٹے سیدھے سوالات کیا کرتے تھے کوئی یہ سمجھ کر کہ نسخ تو ہوتا ہی رہتا ہے یہ کہتا کہ فلاں حکم قائم رہنا چاہیے اور فلاں حکم منسوخ ہو جانا چاہیے، کوئی سوال کرتا کہ اس حاملہ کے پیٹ میں بیٹا ہے یا بیٹی اسم قسم کے لغو سوالات کرتے رہتے اس لئے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو متنبہ کر دیا کہ تم اپنے رسول سے بے جا سوالات نہ کیا کرو۔

قوله: ای یاخذه بدله. یہ ایک اشکال کا جواب ہے، اشکال یہ ہے کہ ظاہری آیت سے یہ متبادر ہوتا ہے کہ ایمان ماخوذ اور کفر متروک ہے یعنی کفار نے کفر چھوڑ کر اس کے عوض ایمان قبول کر لیا، کیونکہ باء کا دخول عموماً شئی ماخوذ پر ہوتا ہے جیسے بدلت هذا بذالك اس میں مدخول باء ماخوذ ہے اور معنی ہے کہ ''میں نے اس کے بدلے اس کو لیا'' حالانکہ آیت کا مفہوم یہ نہیں، حاصل جواب یہ ہے کہ آیت میں لفظ "یتبدل" باب تفعل سے مضارع معروف کا صیغہ ہے، اور قاعدہ یہ ہے کہ باب تفعل میں باء کا مدخول متروک ہوتا ہے اور فعل جس کی طرف متعدی بنفسہ ہوتا ہے وہ ماخوذ ہوتا ہے، اور چونکہ آیت میں فعل، کفر کی طرف متعدی بنفسہ ہے اور ایمان پر باء داخل ہے لہٰذا کفر ماخوذ اور ایمان متروک ہوا، البتہ باب تفعیل کا معاملہ برعکس ہے کہ اس میں مدخول باء ماخوذ ہوتا ہے جیسا کہ مثال مذکور میں، فلا اشکال۔ (ترویح الارواح)

قوله: اخطأ الخ -ضل کی تفسیر اخطأ سے کر کے اشارہ فرمایا کہ آیت میں لفظ ضل بمعنی اضل متعدی ہے۔ تاکہ یہ اعتراض لازم نہ آئے کہ ضلالت لازم ہے تو اسے سواء کی طرف متعدی بنفسہ کیوں کیا گیا؟ آگے سواء الطریق میں یہ اشارہ موجود ہے کہ آیت میں مطلق راستہ چھوڑنے کی نفی نہیں ہے کیونکہ کفار شیطانی راستوں پر تو گامزن ہی ہیں، بلکہ معتدل راستہ چھوڑنے کی نفی ہے جو موصل الی المطلوب ہے۔

قوله: مصدریه — یعنی لو مصدریہ ہے شرطیہ نہیں، اور اس کے مصدریہ ہونے پر دلیل یہ ہے کہ وہ ایسے فعل کے بعد واقع ہے جس سے معنی تمنی مفہوم ہوتا ہے اور وہ ہے "ود" اور اس کا شرطیہ ہونا اس لئے صحیح نہیں ہے کہ شرط کے لئے جزا کا ہونا ضروری ہے جب کہ یہاں جزا نہ مذکور ہے نہ محذوف بلکہ لو کا مابعد بتاویل مصدر ہو کر ماقبل میں مذکور فعل "ود" کا مفعول بنے گا اور تقدیری عبارت یوں ہوگی "ود كثير من اهل الكتب لو ردكم" (صاوی)

قولہ: کائناً - اس سے اشارہ فرمایا کہ جار مجرور یعنی من عند انفسھم کا متعلق حسداً ہے نہ کہ یردونکم، لبعدہ عنہ لفظاً و معنی آگے حملتم الخ سے محض انفس سے حسد کی نسبت بیان کرنا مقصود ہے، ورنہ تو ظاہر ہے کہ حسد نفس ہی کی پیداوار ہے۔

قولہ: ای اترکوھم - یہ عفوکا اور آگے اعرضوا، اصفحوا کا اصطلاحی ترجمہ ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ لفظ عَفْوٌ بنا ہے عُفُوٌ سے جس کا لغوی معنی ہے مٹا دینا، اہل عرب کہتے ہیں عفت الریح المنزل ہوا نے گھر کے آثار مٹا دیئے، اور اصطلاح میں اس کا معنی ہے جرم کی سزا نہ دینا یعنی چھوڑ دینا اسی طرح اصفحوا بنا ہے صفح سے جس کا لغوی معنی ہے کروٹ لینا اور اصطلاحی معنی ہے توجہ نہ کرنا در گذر کر دینا، یہاں معاف کرنے اور در گذر کرنے کا مطلب ہے کہ یہود سے ابھی جنگ نہ کرو اور ان کی بدکلامیوں کا جواب نہ دو۔

قولہ: ای ثوابہ اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ آخرت میں نفس اعمال نہیں بلکہ ان کا ثواب ذخیرہ ہے اور نیکوکاروں کو ان کے اعمال صالحہ کا ثواب ہی ملے گا، مگر یہاں ثواب سے نفس اعمال مراد لینا بھی درست ہے کہ روایت میں ہے کہ قیامت میں اچھے اعمال اچھی شکل میں سامنے آئیں گے۔ (تفسیر نعیمی)

ایک شبہ کا ازالہ: یہاں ایک شبہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ فاعفوا و اصفحوا الخ کا نزول جہاد کا حکم آنے کے بعد ہوا، اور جب حکم جہاد آچکا تو پھر در گزر کرنے اور معاف کرنے کا حکم کیوں دیا گیا؟

اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ جہاد کا جو حکم پہلے آچکا تھا وہ کفار و مشرکین کے ساتھ خاص تھا اور یہاں کتابیوں سے درگزر کرنے کا حکم ہے جو بعد میں منسوخ ہوا، واقعہ دراصل یہ تھا کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے مدینہ کے یہود سے اس شرط پر صلح کر لی تھی کہ وہ غیر جانب دار رہیں اور ہمارے دشمنوں کی ہمارے مقابل مدد نہ کریں، مگر یہود خفیہ طور پہ مسلمانوں کو بہکانے لگے، اس پر فرمایا گیا کہ اس بہکانے پر ان سے جہاد نہ کرو اور ان کا قصور معاف کردو، جب خاص ان کے لئے حکم آئے تب انھیں قتل کرنا، پھر جب غزوۂ خندق میں یہود مدینہ نے کھل کر کفار کی مدد کی اور ان کی بدعہدی واضح ہوگئی تو بنی نضیر کو جلاوطن اور بنی قریظہ کو قتل کیا گیا۔ (صاوی و تفسیر نعیمی ملخصاً)

﴿وَ قَالُوْا لَنْ یَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ کَانَ هُوْدًا﴾ جَمْعُ هَائِدٍ ﴿اَوْ نَصٰرٰی ۵﴾ قَالَ ذٰلِكَ یَهُوْدُ الْمَدِیْنَةِ وَ نَصٰرٰی نَجْرَانَ لَمَّا تَنَاظَرُوْا بَیْنَ یَدَیِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَیْ قَالَ الْیَهُوْدُ لَنْ یَّدْخُلَهَا اِلَّا الْیَهُوْدُ وَ قَالَ النَّصٰرٰی لَنْ یَّدْخُلَهَا اِلَّا النَّصٰرٰی ﴿تِلْكَ﴾ الْمَقُوْلَةُ ﴿اَمَانِیُّهُمْ﴾ شَهَوَاتُهُمُ الْبَاطِلَةُ ﴿قُلْ﴾ لَهُمْ ﴿هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ﴾ حُجَّتَكُمْ عَلٰی ذٰلِكَ ﴿اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ۵﴾ فِیْهِ ﴿بَلٰی﴾ یَدْخُلُ الْجَنَّةَ غَیْرُهُمْ ﴿مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ﴾ اَیْ اِنْقَادَ لِاَمْرِهٖ خَصَّ الْوَجْهَ لِاَنَّهٗ اَشْرَفُ الْاَعْضَاءِ فَغَیْرُهٗ اَوْلٰی ﴿وَ هُوَ مُحْسِنٌ﴾ مُوَحِّدٌ ﴿فَلَهٗ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ﴾ اَیْ ثَوَابُ عَمَلِهِ الْجَنَّةُ ﴿وَ لَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَ لَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ۵﴾ فِی الْاٰخِرَةِ.

ترجمہ: ﴿اور اہل کتاب بولے ہرگز جنت میں نہ جائے گا مگر وہ جو یہودی ہو﴾ ہود، ہائد کی جمع ہے ﴿یا نصرانی﴾ یہ گفتگو یہود مدینہ اور نجران کے نصاریٰ کے درمیان ہوئی جس وقت انھوں نے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بارگاہ میں مناظرہ کیا یعنی یہود نے کہا کہ جنت میں صرف یہودی جائیں گے اور نصاریٰ نے کہا کہ اس میں فقط نصرانی جائیں گے ﴿یہ﴾ گفتگو ﴿ان کی خیال بندیاں ہیں﴾ باطل خواہشات ہیں ﴿آپ فرمایئے﴾ ان سے ﴿لاؤ اپنی دلیل﴾ مقولہ مذکور پر اپنی دلیل لاؤ ﴿اگر تم سچے ہو﴾ اس قول میں ﴿ہاں کیوں نہیں﴾ جنت میں ان کے غیر جائیں گے ﴿جس نے بھی اپنا منہ جھکایا اللہ کے لئے﴾ یعنی اس کا فرمانبردار ہوگیا اور وجہ کی تخصیص اس لئے فرمائی کہ وہ اشرف الاعضاء ہے لہٰذا دوسرے اعضاء بدرجۂ اولیٰ جھکیں گے ﴿اور وہ نیکوکار ہے﴾ موحد مسلمان ﴿تو اس کے لئے اس کا اجر ہے اپنے رب کے پاس﴾ یعنی اس کے عمل کا بدلہ جنت ہے ﴿اور انھیں نہ کچھ اندیشہ ہو اور نہ کچھ غم﴾ آخرت میں

توضیح و تشریح: قولہ: جمع هائد. یعنی ہود جمع ہے، ہائد کی جس کا لغوی معنی ہے "توبہ کرنے والا" چونکہ انھوں نے گوسالہ پرستی سے سخت توبہ کی تھی اس لئے انھیں ہود کہا گیا بعد میں یہ قوم بنی اسرائیل کا علم ہوگیا۔ اسی طرح نصاریٰ جمع ہے نصران کی جیسے سکاریٰ جمع ہے سکران کی، نصاریٰ کا لغوی معنی ہے "مددگار" چونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں نے ان سے مدد کرنے کا وعدہ کیا تھا، اس لئے ان کا نام نصاریٰ ہوا۔

قولہ: قال ذلك الخ یہ شان نزول ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ ایک بار نجران کے عیسائی اور مدینہ کے یہودی حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور آپس میں مناظرہ کرنے لگے، ان میں سے ہر ایک نے دوسرے کو جھوٹا کہا، یہودی بولے کہ جنت میں یہود کے سوا کسی کا داخلہ نہیں ہوسکتا، عیسائیوں نے جواب دیا کہ نصاریٰ کے سوا کسی کو جنت نہیں مل سکتی، تب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔

قولہ: المقولة. چونکہ تلك مفرد مبتداء ہے اور اس کی خبر "امانيهم" جمع ہے اس لئے مفسر علام نے لفظ المقولة محذوف مان کر اشارہ فرمایا کہ تلك سے مراد مقولہ ہے جو مفرد اور جمع دونوں کو شامل ہے لہٰذا مبتداء اور خبر کے درمیان عدم مطابقت کا شبہ نہیں رہا۔

قولہ: شهواتهم الباطلة. اس تفسیر سے اشارہ فرمایا کہ آیت میں لفظ امانی کا اطلاق اہل کتاب کے مقولہ پر بطور مجاز ہے کیونکہ مقولہ سے مراد یہ اقوال ہیں "ود كثير من اهل الكتب الخ، لو يردونكم الاية، لن يدخل الجنة الا من كان هودا الاية" اور امانی کا اطلاق اکاذیب پر ہوتا ہے لہٰذا قول اخیر پر اس کا اطلاق تو درست ہے مگر اول کے دونوں اقوال پر امانی کا اطلاق صحیح نہیں کہ وہ اکاذیب سے نہیں ہیں، اسی شبہ کے ازالہ کی طرف مفسر علام نے امانی کی تفسیر شهواتهم الباطلة سے کرکے اشارہ فرمایا ہے کہ یہاں امانی سے مجازاً باطل خواہشات مراد ہیں خواہ وہ اکاذیب سے ہوں یا نہ ہوں۔

(ترویح الارواح)

قولہ: حجتكم على ذلك. اس تفسیر میں لفظ حجت آیت میں وارد لفظ برہان کا ترجمہ ہے جو مشتق ہے برهنة

بمعنی مضبوطی سے، اصطلاح میں سچی اور قوی دلیل کو برہان کہتے ہیں، مگر یہاں برہان سے مراد محض عقلی دلائل نہیں بلکہ توریت کی صریح آیت یا حضرت موسیٰ علیہ السلام کا صریح فرمان مراد ہے جو ان تک بطریق متواتر پہنچا ہو۔

قولہ: انقاد لامرہ الخ یعنی یہاں وجہ مستعار ہے ذات کے لئے جیسے "کل شیٔ ھالک الا وجھہ" میں وجھہ سے مراد ذات ہے، لہٰذا آیت کا مفہوم یہ ہوا کہ جس نے اپنے ظاہری اور باطنی اعضاء کو اللہ کی اطاعت میں لگا دیا وہی مومن اور مستحق اجر ہے۔

قولہ: موحد، یہ اس وہم کا ازالہ ہے کہ اسلام یعنی انقیاد لامر اللہ تمامی حسنات کو شامل ہے پھر وھو محسن کی قید کا کیا فائدہ؟ حاصل ازالہ یہ ہے کہ آیت میں اسلام سے مراد انقیاد بالاعمال ہے اور احسان سے مراد توحید ہے، علاوہ ازیں اس امر پر تنبیہ مقصود ہے کہ قبولیت اعمال توحید کے ساتھ مشروط ہے۔

﴿وَ قَالَتِ الْيَهُوْدُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَيْءٍ﴾ مُعْتَدٍّ بِهٖ وَ كَفَرَتْ بِعِيْسٰى ﴿وَ قَالَتِ النَّصٰرٰى لَيْسَتِ الْيَهُوْدُ عَلٰى شَيْءٍ﴾ مُعْتَدٍّ بِهٖ وَ كَفَرَتْ بِمُوْسٰى ﴿وَ هُمْ﴾ اَيِ الْفَرِيْقَانِ ﴿يَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ﴾ اَلْمُنَزَّلَ عَلَيْهِمْ وَ فِيْ كِتَابِ الْيَهُوْدِ تَصْدِيْقُ عِيْسٰى وَ فِيْ كِتَابِ النَّصَارٰى تَصْدِيْقُ مُوْسٰى وَ الْجُمْلَةُ حَالٌ ﴿كَذٰلِكَ﴾ كَمَا قَالَ هٰؤُلَاءِ ﴿قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ﴾ اَيِ الْمُشْرِكُوْنَ مِنَ الْعَرَبِ وَ غَيْرِهِمْ ﴿مِثْلَ قَوْلِهِمْ﴾ بَيَانٌ لِمَعْنٰى ذٰلِكَ اَيْ قَالُوْا لِكُلِّ ذِيْ دِيْنٍ لَيْسُوْا عَلٰى شَيْءٍ ﴿فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ۝﴾ مِنْ اَمْرِ الدِّيْنِ فَيُدْخِلُ الْمُحِقَّ الْجَنَّةَ وَ الْمُبْطِلَ النَّارَ ﴿وَ مَنْ اَظْلَمُ﴾ اَيْ لَا اَحَدَ اَظْلَمُ ﴿مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ﴾ بِالصَّلٰوةِ وَ التَّسْبِيْحِ ﴿وَ سَعٰى فِيْ خَرَابِهَا﴾ بِالْهَدْمِ اَوِ التَّعْطِيْلِ نَزَلَتْ اِخْبَارًا عَنِ الرُّوْمِ الَّذِيْنَ خَرَّبُوْا بَيْتَ الْمَقْدِسِ اَوْ فِي الْمُشْرِكِيْنَ لَمَّا صَدُّوا النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَامَ الْحُدَيْبِيَةِ عَنِ الْبَيْتِ ﴿اُولٰٓئِكَ مَاكَانَ لَهُمْ اَنْ يَّدْخُلُوْهَا اِلَّا خَآئِفِيْنَ ۝﴾ خَبَرٌ بِمَعْنَى الْاَمْرِ اَيْ اَخِيْفُوْهُمْ بِالْجِهَادِ فَلَا يَدْخُلُهَا اَحَدٌ اٰمِنًا ﴿لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ﴾ هَوَانٌ بِالْقَتْلِ وَ السَّبْيِ وَ الْجِزْيَةِ ﴿وَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝﴾ هُوَ النَّارُ.

ترجمہ: ﴿اور یہودی بولے نصرانی کچھ نہیں﴾ کسی شمار میں نہیں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا انکار کر بیٹھے ﴿اور نصرانی بولے یہودی کچھ نہیں﴾ کسی شمار میں نہیں اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا انکار کر بیٹھے ﴿حالانکہ وہ﴾ یعنی دونوں فریق ﴿کتاب پڑھتے ہیں﴾ جو ان پر نازل ہوئی اور یہود کی کتاب میں عیسیٰ علیہ السلام کی تصدیق اور نصاریٰ کی کتاب میں موسیٰ علیہ السلام کی تصدیق ہے، اور جملہ حال ہے۔ ﴿اسی طرح﴾ جیسے انھوں نے کہا ﴿کہی ان لوگوں نے جو کچھ نہیں جانتے﴾ یعنی مشرکین عرب وغیرہ نے ﴿ان کی سی بات﴾ یہ ذلک کے معنی کا بیان ہے یعنی مشرکین و کفار نے ہر دین کو باطل ٹھہرایا ﴿تو اللہ قیامت کے دن ان میں فیصلہ کردے گا جس بات میں جھگڑ رہے ہیں﴾ دینی معاملات کا تو حق پر رہنے والوں کو جنت میں اور باطل پر رہنے والوں کو جہنم میں داخل کردے گا ﴿اور اس سے بڑھ کر ظالم کون﴾ یعنی اس سے بڑھ کر ظالم کوئی نہیں ﴿جو اللہ کی

مسجدوں کو روکے ان میں نام خدا لئے جانے سے ﴿نماز اور تسبیح کے ذریعہ﴾ اور ان کی ویرانی میں کوشش کرے ﴿انھیں ڈھا کر یا برباد کر کے، یہ آیت بطور خبران رومیوں کے متعلق نازل ہوئی ہے۔ جنھوں نے بیت المقدس کو ویران کیا تھا یا ان مشرکین کے متعلق جنھوں نے حدیبیہ کے سال حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو خانہ کعبہ سے روکا تھا۔ ﴿انھیں مناسب نہیں تھا کہ مسجدوں میں جائیں مگر ڈرتے ہوئے﴾ یہ خبر بمعنی امر ہے یعنی انھیں جہاد سے خوف زدہ کر دو تا کہ ان میں سے کوئی بھی امن و امان کے ساتھ اس میں داخل نہ ہو سکے ﴿ان کے لئے دنیا میں رسوائی ہے﴾ ذلت ہے قتل، قید اور جزیہ کے ذریعہ ﴿اور ان کے لئے بڑا عذاب ہے﴾ یعنی نار جہنم۔

توضیح و تشریح: قولہ: معتد بہ الخ یہ ایک شبہہ کا جواب ہے جس کی تقریر یہ ہے کہ یہود یا نصاریٰ کے دین سے شئی کی نفی درست نہیں ہے کیونکہ وہ شئی تو بہر حال ہے۔ تو فریقین کا ہر ایک کے دین کو لاشی کہنا کیونکر صحیح ہو۔ جواب یہ ہے کہ نفی اس شی کی ہے جو کسی گنتی میں ہو اور یہاں ایسا نہیں، اس کا حاصل یہ ہے کہ یہودی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو نہ پیغمبر مانتے تھے اور نہ ہی انجیل کو آسمانی کتاب، اور عیسائی حضرت موسیٰ علیہ السلام کو پیغمبر اور توریت کو آسمانی کتاب تو مانتے تھے مگر وہ کہتے تھے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نبوت اور توریت دونوں منسوخ ہو چکی ہیں، لہٰذا یہود کے قول کا یہ مطلب تھا کہ عیسائیوں کی بنیاد ہی غلط ہے اور عیسائیوں کے قول کا یہ مطلب تھا کہ یہودیوں کی کتاب کبھی قابل عمل تھی مگر اب اس کو ماننا ہی حماقت ہے، گویا دونوں کا کلام یکساں ہے اور مطلب جداگانہ اسی مفہوم کی طرف حضرت مفسر نے معتد بہ الخ سے اشارہ فرمایا ہے۔

قولہ: ای الفریقان. یہ اس وہم کا ازالہ ہے کہ هُم ضمیر کا مرجع یہود ہے کہ وہی اقرب ہے لہٰذا آیت میں مذمت صرف یہود کی ہے نصاریٰ کی نہیں، آگے المنزل الیھم سے اشارہ فرمایا کہ الکتب پر ال برائے جنس ہے جو توریت اور انجیل دونوں کو شامل ہے، اس سے ان مفسرین کا رد بھی ہو گیا جن کے نزدیک الکتب پر ال برائے عہد ہے اور معہود توریت ہے، کیونکہ اس صورت میں آیت سے نصاریٰ کی مذمت ثابت نہیں ہوگی۔

قولہ: ای المشرکون من العرب الخ یہ لا یعلمون کا معنی مراد ہے جس سے اشارہ اس امر کی طرف ہے کہ آیت میں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے لئے تسلی ہے کہ آپ مشرکین عرب کے کفر و انکار اور شدت مخالفت سے نہ پریشان ہوں اور نہ ہی تعجب میں پڑیں کیونکہ یہود و نصاریٰ حق جانتے ہوئے بھی گمراہ ہو گئے تو مشرکین عرب جو جاہل محض اور اناڑی ہیں ان سے بہتر امیدیں کیسے وابستہ کی جا سکتی ہیں۔ یقیناً ان سے بھی گمراہی اور نازیبا افعال و حرکات ہی کا صدور ہوگا۔

قولہ: بیان لمعنی ذلك یعنی لفظ مثل کذلك کے کاف کا بدل ہے اور قولھم ذلك کے معنی کا بیان ہے لھذا کذلك اور مثل قولھم میں جو بظاہر تکرار کا شبہ پیدا ہوتا ہے وہ نہ رہا۔

قولہ: ای لا احد اظلم. اس تفسیر سے مفسر علام نے اشارہ فرمایا ہے کہ آیت میں استفہام انکاری ہے اور مفہوم یہ ہے کہ ''اس سے بڑھکر ظالم کوئی نہیں جو مسجدوں میں ذکر اللہ سے روکے'' البتہ یہاں ایک اشکال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس آیت سے ظاہر یہ ہے کہ مسجدوں میں اللہ کے ذکر سے روکنے والے کے ظلم سے بڑھکر کسی اور کا ظلم نہ ہو مگر دوسری جگہ فرمایا" و من

اظلم ممن افترى على الله كذبا" (سورۂ ہود) اور اس سے بڑھ کر ظالم کون جو اللہ پر افتراء پردازی کرے۔ اسی طرح ایک اور مقام پر فرمایا گیا "فمن أظلم ممن كذب على الله (سورۂ زمر) تو اس سے بڑھ کر ظالم کون جو اللہ پر جھوٹ باندھے۔ تو مذکورہ آیتوں میں مطابقت کیونکر ممکن ہوگی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ مذکورہ آیتوں میں اظلمیت حقیقی نہیں بلکہ اظلمیت اضافی مراد ہے یعنی ایک لحاظ سے مسجدوں کو ذکر اللہ سے روکنے والا بڑا ظالم ہے اور دوسرے لحاظ سے اللہ تعالیٰ پر افتراء پردازی کرنے والا اسی طرح تیسرے لحاظ سے اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھنے والا بڑا ظالم ہے، مثلاً مسجدوں کو ذکر اللہ سے روکنے والا اس اعتبار سے بڑا ظالم ہے کہ وہ بندگان خدا کو حقوق اللہ ادا کرنے سے روکتا ہے اور ظاہر ہے یہ ممانعت ہر قسم کی ممانعت یعنی منع مالی، منع عرضی اور منع جانی وغیرہ سے بڑا ظلم ہے لہٰذا ایسا ظلم کرنے والا بھی بڑا ظالم ہوگا اور آیت کا معنی ہوگا۔ "لا احد من المانعين اظلم ممن منع مساجد الله"

اسی طرح افتراء اور تکذیب کی بہت ساری قسمیں ہیں سب سے بڑھکر افتراء یہ ہے کہ بندہ اللہ پر افتراء پردازی کرے اور سب سے بڑی تکذیب یہ ہے کہ بندہ اپنے خالق کو جھوٹا کہے، لہٰذا دوسری آیت کا معنی ہوگا "لا احد من المفترين اظلم ممن افترى على الله" اور تیسری آیت کا معنی ہوگا۔ "لا احد من المكذبين اظلم ممن كذب على الله" (صاوی ملخصا)

اور دوسرا جواب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مساجد میں ذکر اللہ سے روکنے والے، اللہ جل شانہ پر افتراء پردازی کرنے والے اور اس پر جھوٹ باندھنے والے سب اظلمیت کے ایک درجہ ہیں، لہٰذا ہر ایک کے لئے یہ کہنا صحیح ہے کہ اس سے بڑھ کر کوئی ظلم نہیں جیسے کسی شہر میں دو آدمیوں کے برابر دولت ہو اور ان سے زیادہ شہر میں کسی کے پاس دولت نہ ہو تو دونوں کے لئے یہ کہنا صحیح ہے کہ اس سے بڑھ کر شہر میں کوئی مالدار نہیں، کیونکہ دوسرا اس کے برابر ہے زیادہ نہیں۔

قوله: بالصلوٰة و التسبيح. اس تقدیری عبارت سے مفسر علام نے اشارہ فرمایا ہے کہ آیت میں ذکر سے مراد عام ہے خواہ نماز ہو یا درود شریف، قرآن پاک کی تلاوت ہو یا مجلس وعظ، نعت خوانی کی محفل ہو یا دینی تعلیم بلا اجرت جو شخص ان میں سے کسی چیز کو بھی بند کرتا ہے وہ بڑا ظالم ہے۔

قوله: نزلت اخبارا الخ یہ سبب نزول کے بیان کی طرف اشارہ ہے، مذکورہ آیت کے شان نزول سے متعلق مفسرین کے مختلف اقوال ہیں، دو کی طرف حضرت مفسر نے اشارہ فرمایا ہے جن کا حاصل یہ ہے کہ "جب یہود نے حضرت یحییٰ بن زکریا علیہما السلام کو شہید کیا تو روم کے نصاریٰ بابل کے مجوسی بادشاہ بخت نصر کے پاس گئے اور اسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا معتقد بنا کر اسی کے ذریعہ یہودیوں سے جنگ کی، ان کے جوانوں کو قتل کیا، بچوں کو قید کیا، توریت کو جلایا اور بیت المقدس کو ویران کیا، خلافت فاروقی تک بیت المقدس اسی حال میں رہا پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فتح کسریٰ کے بعد اسے آباد کیا اور وہاں اذان و نمازیں شروع کرائیں، اسی واقعہ کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی،

یا ٦ھ میں جب حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے چودہ سو اصحاب کے ساتھ بنیت عمرہ مکہ کی طرف کوچ فرمایا تو حدیبیہ کے مقام پر مشرکین مکہ نے آپ کو اور آپ کے ہمراہیوں کو خانۂ کعبہ کی زیارت اور عمرہ سے روک دیا تھا، تب یہ آیت نازل

ہوئی، مگر پہلی روایت ضعیف ہے کیونکہ بخت نصر حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے بہت پہلے گزر چکا تھا اس وقت عیسائی تھے ہی نہیں جیسا کہ ابو بکر رازی علیہ الرحمہ نے اپنی کتاب احکام القرآن میں ذکر فرمایا، لہٰذا دوسری روایت ہی صحیح معلوم ہوتی ہے۔

قوله: خبر بمعنی الامر. یہ آیت کے صحیح مفہوم کی طرف اشارہ ہے چونکہ بظاہر یہ آیت جملہ خبریہ ہے اور معنی یہ ہوگا کہ مشرکین یا یہود کو بھی وہاں آنا جائز نہ تھا مگر اللہ سے خوف اور عاجزی کرتے ہوئے۔ مگر آیت کا یہ مفہوم مراد نہیں بلکہ یہ بظاہر جملہ خبریہ اور حقیقۃً جملہ انشائیہ ہے اور معنی وہ ہے جسے مفسر علام نے اخیفوهم بالجهاد الخ سے بیان فرمایا گویا آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم مسلمانوں کو مکلف فرمایا ہے کہ ہم یہود اور مشرکین سے جہاد کریں اور ان سے بیت المقدس و خانہ کعبہ کو خالی کرائیں چنانچہ اس حکم پر عمل درآمد ۹ھ میں ہوا کہ فتح مکہ کے بعد حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حضرت علی کے ذریعہ اعلان فرمایا کہ کوئی شخص برہنہ ہو کر خانہ کعبہ کا طواف نہ کرے اور نہ ہی آئندہ کوئی مشرک حج کرے، اسی طرح حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں جب شام فتح ہوا تو بیت المقدس میں بھی مشرکین اور یہود کا داخلہ ممنوع ہوگیا۔

آیت کا ایک مفہوم یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ لفظاً و معنیً جملہ خبریہ ہو اور اس کے ذریعہ آئندہ کی خبر دی جارہی ہو کہ اے مسلمانو! غم نہ کرو، عنقریب وہ وقت آرہا ہے کہ مشرکین اور یہود کو مسجد حرام اور بیت المقدس میں آنے کی اجازت بھی نہ ہوگی گویا حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی جانب سے مسجد حرام میں اور حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی جانب سے بیت المقدس مس یہود اور مشرکین کے داخلہ کی ممانعت کی خبر وقت سے پہلے ہی دے دی گئی۔ (صاوی)

قوله: هوان بالقتل الخ یہ لفظ خزی کے معنی مراد کا بیان ہے. جس کا حاصل یہ ہے کہ خزی کا لغوی معنی ہے "شکست کا پہنچنا خواہ کسی بھی صورت میں ہو، لہٰذا یہود و نصاریٰ کا اہل اسلام کے ہاتھوں میدان جنگ میں قتل و شکست، ان پر جزیہ کا مقرر کرنا اور انھیں جلاوطن کرنا، یہ سب خزی کے تحت داخل ہیں۔

انہدام مساجد کا وبال:

آیت کریمہ "لهم فی الدنیا خزی و لهم فی الآخرة عذاب عظیم" سے ثابت ہوا کہ خانہ کعبہ کی بے حرمتی کرنے والے اور دیگر مساجد کو ویران کرنے والے دنیا میں رسوا کئے گئے کوئی قتل کیا گیا، کوئی قید کیا گیا، کوئی مسلمانوں کا باجگزار بنا اور آخرت کی سزا اس پر مستزاد ہے، یہاں یہ بھی خیال رہے کہ دنیا و آخرت کی ذلت محض ان ظالموں کے ساتھ خاص نہیں جنھوں نے صرف بیت المقدس یا خانہ کعبہ کو نقصان پہنچایا بلکہ یہ سزا عام ہے دنیا کی کسی بھی مسجد کو نقصان پہنچانے والے کے لئے جیسا کہ ہندوستان کے شہر اجودھیا میں واقع بابری مسجد کے انہدام کے چند ہی مہینوں کے بعد اخباروں اور رسالوں میں اس قسم کی خبریں چھپیں کہ منہدم کرنے والوں میں کوئی وبائی مرض میں مبتلا ہوا، کوئی زلزلہ اور کوئی سیلاب کے نذر ہوگیا اور کسی کی بینائی سلب کرلی گئی۔

یہاں یہ اشکال نہ پیدا کیا جائے کہ دنیا دار العمل ہے اور آخرت دار الجزاء پھر مساجد کو نقصان پہنچانے والوں کو دنیا

میں سزا کیوں ملتی ہے۔ کیونکہ دنیا کی سزا انہدام مساجد کی حقیقی سزا نہیں یہ تو صرف لوگوں کی عبرت کے لئے سزا کا ایک ادنیٰ نمونہ ہے، اس کی حقیقی سزا آخرت ہی میں ملے گی اور وہ ہے جہنم کی آگ۔

مساجد میں مشرکین کے داخلہ کا حکم:

آیت کریمہ "ماکان لهم ان یدخلوها کی وجہ سے ائمہ مذاہب نے مساجد میں مشرکین کے داخلہ کے متعلق اختلاف کیا ہے؟ امام مالک رضی اللہ عنہ کے نزدیک بغیر ضرورت مساجد میں کفار و مشرکین کا داخل ہونا جائز نہیں ہے جب کہ امام شافعی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نزدیک یہ تفصیل ہے کہ بیت المقدس، مسجد حرام اور مسجد نبوی میں کفار و مشرکین کا داخلہ مطلقاً ممنوع ہے باقی دوسری مساجد میں مسلمانوں کی اجازت سے داخل ہو سکتے ہیں اور احناف کے نزدیک طہارت و پاکیزگی اور دیگر آداب مسجد کا خیال رکھتے ہوئے کفار و مشرکین ہر مسجد میں داخل ہو سکتے ہیں۔ (صاوی)

وَ نَزَلَ لَمَّا طَعَنَ الْيَهُوْدُ فِىْ نَسْخِ الْقِبْلَةِ اَوْ فِىْ صَلٰوةِ النَّافِلَةِ عَلَى الرَّاحِلَةِ فِىْ سَفَرٍ حَيْثُمَا تَوَجَّهَتْ ﴿وَ لِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَ الْمَغْرِبُ﴾ اَىِ الْاَرْضُ كُلُّهَا لِاَنَّهُمَا نَاحِيَتَاهَا ﴿فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا﴾ وُجُوْهَكُمْ فِى الصَّلٰوةِ بِاَمْرِهٖ ﴿فَثَمَّ﴾ هُنَاكَ ﴿وَجْهُ اللّٰهِ﴾ قِبْلَتُهُ الَّتِىْ رَضِيَهَا ﴿اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ﴾ يَسَعُ فَضْلُهٗ كُلَّ شَىْءٍ ﴿عَلِيْمٌ ۝﴾ بِتَدْبِيْرِ خَلْقِهٖ ﴿وَقَالُوا﴾ بِوَاوٍ وَ دُوْنِهَا اَىِ الْيَهُوْدُ وَ النَّصٰرٰى وَ مَنْ زَعَمَ اَنَّ الْمَلٰٓئِكَةَ بَنَاتُ اللّٰهِ ﴿اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا﴾ قَالَ تَعَالٰى ﴿سُبْحٰنَهٗ﴾ تَنْزِيْهًا لَهٗ عَنْهُ ﴿بَلْ لَهٗ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ﴾ مِلْكًا وَ خَلْقًا وَ عَبِيْدًا وَ الْمِلْكِيَّةُ تُنَافِى الْوِلَادَةَ وَ عَبَّرَ بِمَا تَغْلِيْبًا لِمَا لَا يَعْقِلُ ﴿كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ۝﴾ مُطِيْعُوْنَ كُلٌّ بِمَا يُرَادُ مِنْهُ وَ فِيْهِ تَغْلِيْبُ الْعَاقِلِ ﴿بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ﴾ مُوْجِدُهُمَا لَا عَلٰى مِثَالٍ سَبَقَ ﴿وَ اِذَا قَضٰى﴾ اَرَادَ ﴿اَمْرًا﴾ اَىْ اِيْجَادَهٗ ﴿فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۝﴾ اَىْ فَهُوَ يَكُوْنُ وَ فِىْ قِرَاءَةٍ بِالنَّصَبِ جَوَابًا لِلْاَمْرِ.

ترجمہ: جب قبلہ کے بدلنے یا بلا تعیین جہت حالت سفر میں سواری پر نماز پڑھنے پر یہود نے اعتراض کیا تب یہ آیت نازل ہوئی۔ ﴿اور پورب و پچھم سب اللہ ہی کا ہے﴾ یعنی ساری روئے زمین کیوں کہ شرق و غرب اس کے دو کنارے ہیں ﴿تو تم جدھر رخ کرو﴾ یعنی تم جدھر بھی اپنا منہ کرو حالت نماز میں اس کے حکم سے ﴿ادھر وجہ اللہ [خدا کی رحمت تمہاری طرف متوجہ ہے] ہے﴾ اس کا وہ قبلہ ہے جس سے وہ راضی ہے۔ ﴿بے شک اللہ وسعت والا﴾ وسیع فضل والا، ہر چیز کا ﴿خوب جاننے والا ہے﴾ اپنی مخلوق کی تدبیر سے واقف ہے ﴿اور بولے﴾ قالوا کی دوسری قراءۃ بغیر واؤ کے (قال) ہے یعنی یہود و نصاریٰ اور وہ لوگ جن کے گمان میں فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں ﴿خدا نے اپنے لئے اولاد رکھی﴾ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ﴿پاکی ہے اسے﴾ اس کے لئے اس عیب سے پاکی ہے ﴿بلکہ اسی کی ملک ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے﴾ یعنی سب اسی کی ملکیت، اسی کی مخلوق اور اسی کے بندے ہیں اور ملکیت ولادت کے منافی ہے۔ لفظ ما سے تعبیر میں ذوی العقول پر غیر ذو

العقول کی تغلیب ہے۔﴿سب اس کے حضور گردن ڈالے ہیں﴾ جس چیز سے جو ارادہ فرماتا ہے وہ اس کی اطاعت کرتی ہے، اس میں ذوی العقول کی تغلیب ہے ﴿نیا پیدا کرنے والا آسمانوں اور زمین کا﴾ بغیر کسی نمونہ کے ان دونوں کا ایجاد فرمانے والا ہے ﴿اور جب ارادہ فرماتا ہے﴾ قضی بمعنی اراد ہے ﴿کسی کام کا﴾ یعنی اس کے ایجاد کرنے کا ﴿تو اس سے یہی فرماتا ہے کہ ہو جا وہ فوراً ہو جاتی ہے﴾ فیکون دراصل فھو یکون ہے اور ایک قرأۃ میں یکون نصب کے ساتھ ہے امر کا جواب ہونے کی وجہ سے۔

توضیح و تشریح: قولہ و نزل لما طعن الخ یہ آیت کے شان نزول کا بیان ہے، مفسرین کے اس آیت کے شان نزول سے متعلق مختلف اقوال ہیں یہاں حضرت مفسر نے دو کو بیان فرمایا ہے جن کا خلاصہ یہ ہے کہ جب تحویل قبلہ پر یہود نے مسلمانوں پر طعن کیا کہ تمہارا عجیب دین ہے جس کا کوئی قبلہ ہی مقرر نہیں، نماز میں کبھی بیت المقدس اور کبھی کعبہ معظمہ کی طرف رخ کرتے ہو، اس پر یہ آیت اتری جس میں فرمایا گیا کہ اہل کتاب تو سمت کے تابع ہیں اور اے مسلمانوں تم اللہ کے حکم کے تابع ہو، یا یہ آیت مسافر کے متعلق اتری کہ وہ بحالت سفر سواری پر نفل ادا کر سکتا ہے خواہ اس کی سواری کا رخ قبلہ کی طرف ہو یا نہ ہو۔

قولہ: ای الارض کلھا الخ یہ آیت کے معنی مراد کا بیان ہے یعنی مشرق و مغرب کے ذکر کا مطلب یہ نہیں کہ صرف پورب پچھم اللہ کا ہے اور جنوب و شمال کسی اور کے، بلکہ یہاں مشرق و مغرب سے پورا عالم اور پوری روئے زمین مراد ہے، کیونکہ کسی بھی چیز کے دو کناروں کو بول کر پوری چیز مراد لی جاتی ہے، جیسے کہا جائے کہ فلاں کو سر سے پاؤں تک پسینہ آ گیا، تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ صرف سر اور پیر پہ پسینہ آیا بلکہ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ پورے جسم پر پسینہ آ گیا، اسی طرح یہاں مشرق و مغرب سے پوری روئے زمین مراد ہے۔

قولہ: وجوھکم الخ یہ تولوا کے مفعول محذوف کی طرف اشارہ ہے، ترکیب کا حاصل یہ ہے کہ اینما جواین ظرفیہ اور ما تنکیر یہ سے بنا ہوا ہے، اسم شرط مفعول فیہ مقدم ہے۔ تولوا فعل با فاعل اور وجوھکم مضاف مضاف الیہ سے مل کر مفعول بہ محذوف ہے۔ فعل اپنے فاعل، مفعول بہ محذوف اور مفعول فیہ مقدم سے مل کر شرط، فثم وجہ اللہ جملہ خبریہ ہو کر جواب شرط ہے۔

قولہ: ھناک. اس لفظ سے حضرت مفسر یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ثم جو ظرف مکان ہے اور موضوع ہے بعید کے لئے یہاں آیت میں ھنا کے معنی میں استعمال ہوا ہے جو ظرف مکان قریب کے لئے موضوع ہے۔ آگے مفسر علام نے قبلتہ التی رضیھا کہہ کر آیت میں وارد لفظ وجہ کے معنی مراد کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ اس تقدیر پر آیت کا معنی ہوگا کہ "تم جدھر بھی منہ کرلو گے وہی اللہ کی پسندیدہ جہت ہے، یعنی یہاں وجہ بمعنی جہت ہے۔

قولہ: یسع فضلہ الخ یہ ان اللہ واسع کا مفہوم ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ "واسع" بنا ہے "سعۃ" سے جس کا لغوی معنی ہے "لامحدود فراخی" اور ظاہر ہے کہ لامحدود ہونا اور فراخ ہونا اجسام کی صفت ہے۔ جس سے اللہ تعالیٰ پاک ہے، لہٰذا یہاں لفظ واسع اپنے حقیقی معنی میں نہیں بلکہ مجازاً اس سے فضل الٰہی کی وسعت مراد ہے، اسی معنی کی طرف مفسر علام نے یسع

فضلہ سے اشارہ کیا ہے۔

قولہ: بواو و دونہا الخ یہ قالوا میں دو سبعی قراءتوں کا بیان ہے ایک قراءۃ تو یہی ہے جو یہاں آیت میں موجود ہے یعنی واؤ کے ساتھ، اس صورت میں اس کا عطف ہوگا منع مساجد اللہ پر اور تقدیری عبارت یوں ہوگی۔ "و من أظلم ممن قال اتخذ اللہ ولدا" اور دوسری قراۃ بغیر واو کے "قال" ہے اس صورت میں یہ اپنے مابعد سے مل کر جملہ مستانفہ بنے گا آگے مفسر علام نے ای الیہود سے قالوا کے فاعل کی طرف اشارہ فرمایا ہے یعنی یہود و نصاریٰ اور مشرکین سب ہی قالوا کے فاعل ہیں کہ یہود نے حضرت عزیر علیہ السلام کو اور نصاریٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا مانا اور مشرکین عرب نے فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں بتایا، لہٰذا ان سب کی تردید میں یہ آیت اتری، اور چونکہ "فمن أظلم ممن منع" میں یہود و نصاریٰ اور مشرکین کا ذکر ہو چکا ہے اس لئے ان سب کی طرف ضمیر کا لوٹانا صحیح ہو گیا۔

قولہ: و عبر بہا الخ اس سے اشارہ فرمایا کہ آیت میں لفظ "ما" کا ذکر بطور تغلیب ہے یعنی ذوی العقول پر غیر ذوی العقول کی تغلیب کر لی گئی۔ اولاً اس لئے کہ غیر ذوی العقول تعداد میں زیادہ ہیں، ثانیاً اس لئے کہ یہاں اظہار قہر مقصود ہے جو غیر عاقل کے لئے ہی مناسب ہے۔

قولہ: و فیہ تغلیب العاقل. یعنی لفظ قانتون میں واؤ اور نون کے ساتھ جمع لانے میں غیر ذوی العقول پر ذوی العقول کی تغلیب کی گئی ہے۔ اولاً شرافت و بزرگی کی وجہ سے اور ثانیاً اس لئے کہ یہاں شان اطاعت و فرمانبرداری کا بیان ہے جو ذوی العقول ہی کے لئے موزوں ہے۔

قولہ: لاعلی مثال سابق. یہ لفظ بدیع کا معنی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ لفظ بدیع بنا ہے بدع سے جس کا لغوی معنی ہے بغیر نمونہ کے بنانا لہٰذا آیت کا معنی ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان و زمین کو بغیر کسی نمونہ سابق اور بغیر کسی مثال و آلہ کے پیدا فرمایا۔

قولہ: اراد. یہ لفظ قضی کا معنی مراد ہے چونکہ قضی بنا ہے قضاء سے جو حسب ذیل چند معانی میں استعمال ہوتا ہے: پیدا کرنا، حکم دینا، فیصلہ کرنا، خبر دینا، فارغ ہونا، پورا کرنا، ارادہ کرنا، یہاں آیت میں لفظ قضی کا آخری معنی مراد ہے، وجہ ترجیح ظاہر ہے کہ اللہ عز و جل جس چیز کے پیدا فرمانے کے ارادہ فرماتا ہے وہ چیز بلا تاخیر پیدا ہو جاتی ہے یعنی ہر چیز کی پیدائش کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا ارادہ متعلق ہوتا ہے۔

قولہ: ای فہو یکون اس تفسیر سے مفسر علام نے اشارہ فرمایا ہے فیکون کے مرفوع ہونے کی طرف یعنی یکون خبر ہے مبتدا محذوف "ھو" کی آگے حضرت مفسر نے و فی قرأۃ بالنصب کہہ کر ابن عامر کی قراءۃ بیان کی ہے، اس صورت میں فاسبیہ کے بعد "ان" متقدر ہوگا۔ اور یکون امر کا جواب ہوگا، لہٰذا منصوب پڑھا جائے گا۔

خیال رہے یہاں لفظ کن کا مطلب یہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ جب کسی چیز کو پیدا فرمانا چاہتا ہے تو اس سے "کُن" کہتا ہے تو وہ چیز پیدا ہو جاتی ہے بلکہ یہ کنایہ ہے سرعت ایجاد سے یعنی اللہ تعالیٰ جب کسی چیز کو پیدا فرمانے کا ارادہ فرماتا ہے تو وہ چیز بلا تاخیر پیدا ہو جاتی ہے۔ (صاوی)

اللہ تعالیٰ کا اولاد سے پاک ہونے کے دلائل:

اللہ تعالیٰ کے اولاد سے پاک ہونے پر بہت سے دلائل ہیں مگر یہاں آیت میں پانچ دلیلیں بیان کی گئی ہیں جو حسب ترتیب اس طرح ہیں، دلیل اول، ارشاد ہے "سبحانہ" اس کے لئے پاکی ہے۔ سبحان بنا ہے سبح سے جس کا لغوی معنی ہے ''تیرنا'' مگر اصطلاح میں ہر عیب سے پاک ہونے کو بولتے ہیں لہٰذا الوہیت باپ ہونے کے خلاف ہے کیونکہ بیٹا باپ کی جنس سے ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ جنسیت سے پاک ہے اسی طرح بیٹا مجبوراً اختیار کیا جاتا ہے کہ کبھی غلبۂ شہوت سے مجبور ہو کر جماع ہوتا ہے جس سے اولاد ہو جاتی ہے یا دشمنوں کی قوت سے مجبور ہو کر اولاد کی خواہش کرتا ہے تاکہ وہ اپنا قوت بازو ہو اور اللہ تعالیٰ ہر قسم کے غلبہ اور مجبوری سے پاک ہے، اسی طرح بیٹا باپ کا جز ہوتا ہے اللہ تعالیٰ اس سے بھی پاک ہے نیز بیٹا ماننے کی صورت میں اللہ تعالیٰ کے لئے بیوی ماننا پڑے گی اور اللہ تعالیٰ بیوی بنانے سے پاک ہے، اس سے ثابت ہوا کہ الوہیت اور باپ ہونا کبھی جمع ہو ہی نہیں سکتے کہ باپ ہونا احتیاج کو مستلزم ہے اور اللہ تعالیٰ ہر احتیاج سے پاک ہے لہٰذا باپ ہونے سے بھی پاک ہے۔

دوسری دلیل "بل له ما فی السمٰوٰت و الارض" اسی کے لئے ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے۔ اس سے واضح ہے کہ ہر چیز کا خالق و مالک اللہ تعالیٰ ہے اور ظاہر ہے باپ نہ بیٹے کا خالق ہوتا ہے نہ مالک اور اگر اللہ تعالیٰ کے اولاد ہوتی تو لازم آتا کہ بعض مخلوق کا خالق و مالک ہو اور بعض کا نہ ہو حالانکہ وہ عالم کے ہر ذرے کا خالق و مالک ہے لہٰذا باپ ہونے سے پاک ہے۔

تیسری دلیل: کل له قانتون ہر چیز اس کی مطیع ہے "قانتون بنا ہے قنوت سے جس کے چار معانی ہیں: ''فرمانبرداری کرنا، کھڑا ہونا، چپ رہنا، ہمیشہ رہنا، یہاں چاروں معانی بن سکتے ہیں یعنی ہر چیز رب کی فرمانبردار ہے۔ اس کے سامنے کھڑی ہو کر عبادت گزار ہے، اس کے احکام پر خاموش ہے، ہمیشہ اس کی محتاج ہے اب ظاہر ہے اولاد اولاً ماں باپ کی محتاج ہوتی ہے پھر ان سے بے پرواہ بلکہ اخیر میں خود ماں باپ اولاد کے محتاج تو اگر اللہ تعالیٰ کے بھی اولاد ہوتی تو معاذ اللہ یا تو وہ اس کا محتاج ہوتا یا کم از کم وہ اولاد اس سے غنی ہوتی حالانکہ نہ اللہ تعالیٰ کسی کا محتاج اور نہ ہی کوئی اس سے مستغنی، لہٰذا اللہ تعالیٰ کے لئے اولاد نہیں۔

چوتھی دلیل: بدیع السموت و الارض وہ آسمانوں اور زمین کا ایجاد فرمانے والا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو بغیر کسی نمونہ مادہ اور آلہ کے پیدا فرمایا اور ظاہر ہے بیٹا باپ کا ہم جنس اور اس کے مادہ اور اس کے آلہ سے بنتا ہے، لہٰذا اللہ تعالیٰ کسی کا باپ نہیں ہو سکتا۔

پانچویں دلیل: فانما یقول له کن فیکون یعنی اللہ تعالیٰ کسی چیز کے پیدا فرمانے میں مادہ وغیرہ کا حاجت مند نہیں بلکہ صرف ارادہ کا تعلق کافی ہے اور بیٹے میں یہ بات نہیں ہوتی، لہٰذا وہ اولاد سے پاک ہے۔ (تفسیر نعیمی و تفسیر عزیزی ملخصاً)

﴿وَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ﴾ اَیْ كُفَّارُ مَكَّةَ لِلنَّبِیِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ ﴿لَوْ لَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ﴾ اَنَّكَ رَسُوْلُهُ ﴿اَوْ تَأْتِيْنَا آيَةٌ﴾ مِمَّا اقْتَرَحْنَاهُ عَلٰى صِدْقِكَ ﴿كَذٰلِكَ﴾ كَمَا قَالَ هٰؤُلَاءِ ﴿قَالَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ﴾ مِنْ كُفَّارِ الْاُمَمِ الْمَاضِيَةِ لِاَنْبِيَائِهِمْ ﴿مِثْلَ قَوْلِهِمْ﴾ مِنَ التَّعَنُّتِ وَ طَلَبِ الْآيَاتِ ﴿تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ﴾ فِی الْكُفْرِ وَ الْعِنَادِ فِيْهِ تَسْلِيَةٌ لِلنَّبِیِّ ﴿قَدْ بَيَّنَّا الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ٥﴾ يَعْلَمُوْنَ اَنَّهَا آيَاتٌ فَيُؤْمِنُوْنَ بِهَا فَاقْتِرَاحُ آيَةٍ مَعَهَا تَعَنُّتٌ ﴿اِنَّا اَرْسَلْنٰكَ﴾ يَا مُحَمَّدُ ﴿بِالْحَقِّ﴾ بِالْهُدٰى ﴿بَشِيْرًا﴾ مَنْ اَجَابَ اِلَيْهِ بِالْجَنَّةِ ﴿وَ نَذِيْرًا﴾ مَنْ لَمْ يُجِبْ اِلَيْهِ بِالنَّارِ ﴿وَ لَا تُسْئَلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِيْمِ ٥﴾ النَّارِ اَیِ الْكُفَّارِ مَالَهُمْ لَمْ يُؤْمِنُوْا اِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَ فِیْ قِرَاءَةٍ بِجَزْمِ تُسْئَلْ نَهْيًا ﴿وَ لَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَ النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ﴾ دِيْنَهُمْ ﴿قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ﴾ اَلْاِسْلَامُ ﴿هُوَ الْهُدٰى﴾ وَ مَاعَدَاهُ ضَلَالٌ ﴿وَ لَئِنْ﴾ لَامُ قَسَمٍ ﴿اتَّبَعْتَ اَهْوَآئَهُمْ﴾ الَّتِیْ يَدْعُوْنَكَ اِلَيْهَا فَرْضًا ﴿بَعْدَ الَّذِیْ جَآئَكَ مِنَ الْعِلْمِ﴾ الْوَحْیِ مِنَ اللّٰهِ ﴿مَالَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِیٍّ﴾ يَحْفَظُكَ ﴿وَ لَا نَصِيْرٍ ٥﴾ يَمْنَعُكَ مِنْهُ ﴿اَلَّذِيْنَ آتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ﴾ مُبْتَدَأٌ ﴿يَتْلُوْنَهُ حَقَّ تِلَاوَتِهِ﴾ اَیْ يَقْرَأُوْنَهُ كَمَا اُنْزِلَ وَ الْجُمْلَةُ حَالٌ وَ حَقَّ نُصِبَ عَلَى الْمَصْدَرِ وَ الْخَبَرُ ﴿اُولٰئِكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهِ﴾ نَزَلَتْ فِیْ جَمَاعَةٍ قَدِمُوْا مِنَ الْحَبَشَةِ وَ اَسْلَمُوْا ﴿وَ مَنْ يَّكْفُرْ بِهِ﴾ اَیْ بِالْكِتَابِ الْمُؤْتٰى بِاَنْ يُّحَرِّفَهُ ﴿فَاُولٰئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ٥﴾ لِمَصِيْرِهِمْ اِلَى النَّارِ الْمُؤَبَّدَةِ عَلَيْهِمْ.

ترجمہ: ﴿اور جاہل بولے﴾ یعنی کفار مکہ نے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے کہا ﴿اللہ ہم سے کیوں نہیں کلام کرتا﴾ کہ آپ اس کے رسول ہیں ﴿یا ہمیں کوئی نشانی ملے﴾ جس کی خواہش ہم کرتے ہیں آپ کی صداقت پر ﴿اسی طرح﴾ جیسے انھوں نے کہا ﴿ان سے اگلوں نے بھی کہی﴾ گزری ہوئی امتوں کے کفار نے اپنے انبیاء سے ﴿ان کی سی بات﴾ خودسری کی اور نشانیوں کی خواہش کی ﴿ان کے اُن کے دل ایک سے ہیں﴾ کفر اور بغض میں اس میں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے لئے تسلی ہے ﴿بے شک ہم نے نشانیاں کھول دیں یقین والوں کے لئے﴾ وہ جانتے ہیں کہ یہ اللہ کی نشانیاں ہیں تو ان کی وجہ سے ایمان لے آتے ہیں اس کے باوجود نشانی طلب کرنا سرکشی ہے ﴿بے شک ہم نے بھیجا ہے آپ کو﴾ اے حبیب ﴿حق کے ساتھ﴾ ہدایت کے ساتھ ﴿خوش خبری دیتا﴾ قبول کرنے والوں کو جنت کی ﴿اور ڈر سناتا﴾ قبول نہ کرنے والوں کو جہنم سے ﴿اور آپ سے دوزخ والوں کا سوال نہ ہوگا﴾ یعنی یہ کہ کفار ایمان کیوں نہیں لائے؟ آپ پر تو محض تبلیغ کرنا ہے اور ایک قراءۃ میں جزم کے ساتھ "لَاتُسْئَلْ" نہی کا صیغہ ہے ﴿اور ہرگز تم سے یہود اور نصاریٰ راضی نہ ہوں گے جب تک تم ان کے دین کی پیروی نہ کرو﴾ ملت بمعنی دین ہے ﴿آپ فرمادیجئے کہ اللہ کا بتایا ہوا راستہ ہی﴾ یعنی اسلام ﴿سیدھا راستہ ہے﴾ اس کے سوا گمراہی ہے ﴿اور اگر﴾ لام قسمیہ ہے ﴿تو ان کی خواہشوں کا پیرو ہوا﴾ بالفرض جس کی طرف وہ تجھے بلا رہے ہیں ﴿بعد اس کے کہ تجھے علم آچکا﴾ اللہ کی جانب سے وحی ﴿تو اللہ سے تیرا کوئی بچانے والا نہ ہوگا اور نہ مددگار﴾ جو اسے روک دے تجھ سے ﴿جنھیں ہم نے کتاب دی ہے﴾ یہ مبتداء ہے ﴿وہ جیسی چاہئے اس کی تلاوت کرتے ہیں﴾ یعنی وہ جیسی نازل ہوئی

ویسے ہی اسے پڑھتے ہیں، یہ جملہ حال ہے اور لفظ حق مفعول مطلق ہونے کے وجہ سے منصوب ہے اور خبر (یؤمنون به ہے) ﴿وہی اس پر ایمان رکھتے ہیں﴾ یہ آیت اس جماعت کے لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی جو حبشہ سے آکر مسلمان ہوئے تھے ﴿اور جو اس کے منکر ہوں﴾ دی ہوئی کتاب کے اس طرح کہ اس میں تحریف کردیں ﴿تو وہی زیاں کار ہیں﴾ جہنم میں جانے کی وجہ سے جو ان کے لئے تیار ہے۔

توضیح و تشریح: قوله ای کفار مکة الخ یہاں آیت کے شان نزول اور آنے والے مقولہ کے قائلین سے متعلق مفسرین میں اختلاف ہے، علامہ سیوطی علیہ الرحمہ نے اکثر مفسرین کا قول نقل فرمایا ہے مگر اس قول پر اعتراض یہ ہوتا ہے کہ سورۂ بقرہ مدنی ہے پھر یہ مقولہ کفار مکہ کا ہو یہ بعید از قیاس ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ممکن ہے کفار مکہ نے یہ سوال مدینہ شریف میں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے پاس بھیج دیا ہو اور یہ بعید از قیاس نہیں۔ (صاوی)

قوله: هلا اس لفظ کے اضافہ سے حضرت مفسر نے اشارہ فرمایا ہے کہ یہاں لفظ لو لا بمعنی هلا حرف تحضیض ہے، اور بقول بعض لفظ لو لا قرآن پاک میں اکثر بمعنی هلا آیا ہے۔

خیال رہے لفظ لو لا جب ماضی پر داخل ہوتا ہے تو نہ کرنے پر ملامت کا معنی دیتا ہے جیسے زید کیوں نہیں آیا اور مضارع پر داخل ہو کر فاعل کو راغب کرتا ہے جیسے تو میرے پاس کیوں نہ آئے گا؟ یعنی ضرور آنا، یہاں کفار بظاہر رغبت کا کلمہ بول رہے تھے مگر حقیقۃً مذاق اڑا رہے تھے۔

قوله: مما اقترحناه الخ اس تفسیر سے اشارہ فرمایا کہ یہاں آیت سے قرآنی آیت مراد نہیں ہے بلکہ آیت سے نشان قدرت اور معجزات مراد ہیں مثلاً مکہ کی بے آب و گیاہ ریگستانی زمین میں چشمے جاری ہو جائیں، یا فرشتے صف بستہ ہو کر ہمارے سامنے نمودار ہو جائیں یا حضور آسمان پر جا کر لکھی ہوئی کتاب لے آئیں وغیرہ وغیرہ۔

قوله: من التعنت الخ یہ وجہ مماثلت کی طرف اشارہ ہے، یعنی ایسا نہیں کہ امم ماضیہ کے کفار نے اپنے انبیاء سے جو مطالبے کئے تھے بعینہ کفار مکہ نے بھی حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے وہی مطالبے کئے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ اُن کے مطالبے بھی سرکشی و ہٹ دھرمی کی بنیاد پر تھے اور اِن کے مطالبے کی بنیاد بھی سرکشی پر ہے اگرچہ اقوال مختلف ہوں۔

قوله: ای الکفار مالهم الخ یہ تفسیر اس صورت کی ہے جب کہ لا تُسئل یعنی نفی مجہول کا صیغہ پڑھا جائے۔ اور اگر نہی معروف لا تسئل پڑھا جائے تو معنی یہ ہوگا کہ اے محبوب آپ سے ان کے کافر و گمراہ ہونے کے بارے میں سوال کرنا میرے شایان شان نہیں ہے کیونکہ آپ کا کام تبلیغ ہے۔ اور تبلیغ کر دینے سے آپ بری الذمہ ہو گئے۔

قوله: لام قسم — یہ ایک سوال مقدر کا جواب ہے، سوال یہ ہے کہ و لئن میں ان شرطیہ ہے جس کا جواب آگے۔ مالك من الله من ولی و لا نصير ہے اور قاعدہ یہ ہے کہ جب جواب شرط جملہ اسمیہ واقع ہو تو اس پر فا داخل ہوتا ہے مگر یہاں جواب پر فا داخل نہیں، جواب یہ ہے کہ و لئن میں ان شرطیہ ہے مگر لام قسمیہ ہے اور قاعدہ یہ ہے کہ جب قسم شرط پر مقدم ہو تو جواب لفظ کے اعتبار سے قسم کا ہوتا ہے اور معنی کے اعتبار سے شرط کا لہٰذا یہاں جواب پر فا کا داخل ہونا واجب نہیں کہ وہ لفظاً

قسم کا جواب ہے۔

قولہ: فرضاً. تفسیر میں اس لفظ کے اضافہ کی ضرورت اس صورت میں ہے جبکہ ولئن اتبعت الخ کا مخاطب حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو مانا جائے، اس تقدیر پر لفظ فرضاً سے مفسر علام یہ بتانا چاہتے ہیں کہ آیت میں قضیہ شرطیہ کا حقیقی معنی امکان اتباع، مراد نہیں محض تعلیق مقصود ہے جیسے "لو کان للرحمن ولد" میں رحمن کے لئے ولد کا امکان بتانا مقصود نہیں محض تعلیق مراد ہے، لہٰذا جس طرح خدا کے لئے بیٹا ہونا ناممکن ہے اسی طرح حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے لئے یہود و نصاریٰ کی پیروی ناممکن ہے، اب پوری آیت کا مفہوم یہ نکلا کہ اے محبوب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم آپ یہود و نصاریٰ کی رضا و خوشنودی یا ان کے ایمان پر حریص نہ ہوں کیونکہ وہ اس وقت تک آپ سے راضی نہ ہوں گے جب تک کہ آپ ان کی پیروی نہ کریں اور آپ کے لئے ان کی پیروی ناممکن ہے لہٰذا ان کا آپ سے راضی ہونا بھی ناممکن ہے۔

البتہ مذکورہ تشریح پر ایک اشکال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر و لئن اتبعت الخ میں حضور سے خطاب ہے تو یہاں اِن کی بجائے لو آنا چاہئے تھا کیونکہ ناممکنات کے واقع نہ ہونے کا یقین ہوتا ہے جیسے لو کان للرحمن ولد اور اِن شک کے لئے آتا ہے جس میں امکان کی گنجائش باقی رہتی ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ جہاں ناممکن کو واقع فرض کیا جائے تو وہاں ان کا استعمال ہوتا ہے جیسے ان کان زید حمارا فھو ناھق یعنی اگر زید کو گدھا فرض کر لیا جائے تو وہ رینکنے والا ہے، اور چونکہ اس آیت میں فرض محال ہے اور لو کان الخ جیسی آیتوں میں یہ فرض نہیں اس لئے یہاں ان آیا۔ اور اگر و لئن اتبعت الخ میں امت سے خطاب ہو جیسا کہ خازن وغیرہ کی رائے ہے تو اس صورت میں نہ لفظ فرضاً کے اضافہ کی ضرورت ہے اور نہ ہی کوئی اعتراض پڑتا ہے۔

قولہ: و الجملة حال الخ یہ ترکیب نحوی کا بیان ہے، جس کا حاصل یہ ہے، الذی اسم موصول، آتینا فعل با فاعل ھم ضمیر مفعول اول، الکتاب مفعول ثانی یتلونہ الخ اگر بتاویل فاعل ہو تو ھم ضمیر سے اور اگر مفعول کی تاویل میں ہو تو الکتاب سے حال ہوگا، اور لفظ حق جو حقیقت میں مصدر محذوف کی صفت ہے مفعول مطلق ہونے کی وجہ سے منصوب ہے تقدیری عبارت یوں ہوگی یتلونہ تلاوۃ حق التلاوۃ مصدر کو حذف کر کے صفت کو اس کے قائم مقام کر دیا اور پھر مضاف بنا دیا اب آتینا اپنے مابعد سے ملکر صلہ ہوا، موصول اپنے صلہ سے مل کر مبتدا ہو گیا، آگے اولئک الخ مبتداء خبر سے مل کر جملہ اسمیہ خبریہ ہو کر خبر واقع ہے۔

قولہ: نزلت فی جماعة الخ یہ شان نزول ہے جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے آپ فرماتے ہیں کہ یہ آیت اہل سفینہ کے بارے میں نازل ہوئی جو جعفر بن ابی طالب کے ہمراہ حاضر بارگاہ رسالت ہو کر مشرف باسلام ہوئے تھے ان کی تعداد چالیس تھی بتیس اہل حبشہ اور آٹھ شامی راہب تھے انھیں میں بحیرا راہب بھی تھے۔ (خزائن العرفان)

قولہ: بان یحرفہ. اس سے مراد لفظی اور معنوی تحریف ہے یعنی جو بھی جان بوجھ کر قرآن پاک میں لفظی یا معنوی تحریف کرے اس طرح کہ معنی کچھ کا کچھ بیان کرے تو وہ کافر ہو جائے گا اور اس کا ٹھکانہ جہنم ہوگا جیسے خوارج کہ انھوں نے قرآن وحدیث کے صرف ظاہری مفہوم کو لیا تو وہ گمراہ اور گمراہ گر ہو گئے۔

حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے والدین کے ایمان سے متعلق قول راجح:

آیت کریمہ انا ارسلناك الخ کے شان نزول کے سلسلہ میں تفسیر عزیزی وغیرہ نے یہ روایت نقل فرمائی کہ ایک دن حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فرمانے لگے "لیت شعری ما فعل أبوای" کاش میں جان لوں کہ میرے والدین کا انجام کیا ہوا؟ تب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی، اس کے بعد حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے کبھی اپنے والدین کا ذکر نہیں فرمایا، اسی روایت کی وجہ سے بعض علما نے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے والدین کا جہنمی ہونا سمجھا (العیاذ باللہ)

اس لئے آیت کی مناسبت سے بہتر ہے کہ اس سلسلہ میں قول راجح بیان کر دیا جائے چنانچہ کتب تفاسیر میں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے والدین کے ایمان سے متعلق علما کے چار اقوال درج ہیں جن میں تین اقوال ایسے ہیں کہ مقام عقیدت انھیں حیطۂ تحریر میں لانے سے مانع ہے لہٰذا تفصیل تفسیر نعیمی، روح البیان، تفسیر ابن کثیر وغیرہ میں دیکھ لی جائے البتہ چوتھا، صحیح اور راجح قول اس سلسلہ میں یہ ہے کہ "حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے والدین کریمین رضی اللہ عنہما حیات ظاہری میں مومن موحد تھے بروقت وفات بھی توحید پر قائم رہے اور اب وہ دین اسلام پر ہیں، یہی جمہور علمائے اہلسنّت کا عقیدہ ہے۔

حضرت مفسر یعنی امام جلال الدین سیوطی نور اللہ مرقدہ نے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے والدین کریمین کے ایمان کو انتہائی ٹھوس اور ناقابل تردید دلائل کے ذریعہ ثابت فرمایا ہے اور جن آیات واحادیث سے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے والدین کریمین کے ایمان کی نفی ہوتی ہے ان کا صحیح مفہوم اور معقول ومناسب تاویل بھی ذکر فرمائی ہے، تفصیل کے لئے امام موصوف کی تصنیف الحاوی للفتاویٰ جلد دوم کا مطالعہ کیجئے ہم یہاں تفصیلی بحث میں نہ جا کر حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے والدین کریمین کے ایمان کے ثبوت میں اعلیٰ حضرت امام احمد رضا محدث بریلوی قدس سرہ کی ذکر کردہ ایک دلیل پر اکتفاء کرتے ہیں، مسلم شریف کتاب الایمان میں یہ حدیث ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جہنمیوں میں سب سے کم عذاب ابوطالب کو ہوگا، اس کو آگ کی جوتیاں پہنائی جائیں گی جن سے اس کا دماغ کھول رہا ہوگا اس حدیث کے تحت محدث بریلوی قدس سرہ تحریر فرماتے ہیں۔

یہ حدیث حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے والدین کے ایمان کی دلیل ہے، کیونکہ کفر کے باوجود ابوطالب کے عذاب میں کمی یا تو اس کے قرب نبوی کی بناء پر ہے، یا اس کی پرورش اور خدمت کی بناء پر اگر حضور کے والدین۔ العیاذ باللہ، کافر ہوتے تو ابوطالب کی بہ نسبت عذاب میں کمی کے وہ زیادہ مستحق تھے کیونکہ چچا کی نسبت والدین کا قرب زیادہ ہے اور اگر ابوطالب کے عذاب میں کمی پرورش اور خدمت کی وجہ سے ہے تو پھر کون سی پرورش جزئیت کے برابر ہو سکتی ہے کیونکہ اولاد والدین کا جز اور حصہ ہوتی ہے، اور کون سی خدمت حمل اور وضع حمل کا مقابلہ کر سکتی ہے، کیا کسی پرورش کنندہ یا خدمت گزار کا حق والدین کے حق کے برابر ہو سکتا ہے جن کے حق کو رب العزت نے اپنے حق کے ساتھ شمار کر کے فرمایا "ان اشکرلی و لوالدیك" میرا شکر ادا کرو اور اپنے والدین کا۔

پھر ابو طالب نے جہاں برسوں خدمت کی چلتے وقت رنج بھی وہ دیا جس کا جواب نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بار بار کلمہ پڑھنے کے لئے فرماتے رہے لیکن اس نے کلمہ نہ پڑھنا تھا نہ پڑھا، جرم وہ کیا ہے جس کی مغفرت نہیں، عمر بھر معجزات دیکھے، حضور کی سیرت اور تمام احوال کو تازہ بہ تازہ دیکھتا رہا پھر بھی حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے اصرار کے باوجود ایمان نہیں لایا، اس کے برخلاف والدین کریمین نے نہ زمانۂ نبوت پایا نہ ان کو دعوت اسلام دی گئی، نہ انھوں نے انکار کیا، ثابت ہوا کہ ہر لحاظ سے انھیں کا پلہ بھاری ہے، لہٰذا اگر العیاذ باللہ تعالیٰ والدین کریمین کافر ہوتے اور قرب اور پرورش کی وجہ سے عذاب کم ہوتا تو سب سے کم عذاب والدین کریمین کو ہوتا، حالانکہ یہ بات احادیث صحیحہ کے خلاف ہے کیونکہ احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ سب جہنمیوں میں سب سے کم عذاب ابو طالب کو ہوگا تو ثابت ہوا کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ کے والدین کریمین مومن اور مسلمان تھے۔ (فتاویٰ رضویہ یازدہم، ص ۱۵۷ مطبوعہ رضا اکیڈمی، بمبئی)

﴿یٰبَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ اذْکُرُوْا نِعْمَتِیَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتُ عَلَیْکُمْ وَ اَنِّیْ فَضَّلْتُکُمْ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ ٥﴾ تقدم مثلہ ﴿وَ اتَّقُوْا﴾ خافوا ﴿یَوْمًا لَّا تَجْزِیْ﴾ تغنی ﴿نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ﴾ فیہ ﴿شَیْئًا وَّ لَا یُقْبَلُ مِنْھَا عَدْلٌ﴾ فداء ﴿وَّ لَا تَنْفَعُھَا شَفَاعَۃٌ وَّ لَا ھُمْ یُنْصَرُوْنَ ٥﴾ یمنعون من عذاب اللہ ﴿وَ﴾ اذکر ﴿اِذِ ابْتَلٰٓی﴾ اختبر ﴿اِبْرٰھٖمَ﴾ و فی قراءۃ ابراھام ﴿رَبُّہٗ بِکَلِمٰتٍ﴾ باوامر و نواہ کلفہ بھا قیل ھی مناسک الحج و قیل المضمضۃ و الاستنشاق و السواک و قص الشارب و فرق الرأس و قلم الاظفار و نتف الابط و حلق العانۃ و الختان و الاستنجاء ﴿فَاَتَمَّھُنَّ﴾ اداھن تامات ﴿قَالَ﴾ تعالی لہ ﴿اِنِّیْ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا﴾ قدوۃ فی الدین ﴿قَالَ وَ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ﴾ اولادی اجعل ائمۃ ﴿قَالَ لَا یَنَالُ عَھْدِی﴾ بالامامۃ ﴿الظّٰلِمِیْنَ ٥﴾ الکافرین منھم دل علی انہ ینالہ غیر الظالم ﴿وَ اِذْ جَعَلْنَا الْبَیْتَ﴾ الکعبۃ ﴿مَثَابَۃً لِّلنَّاسِ﴾ مرجعا یثوبون الیہ من کل جانب ﴿وَ اَمْنًا﴾ مامنا لھم من الظلم و الاغارات الواقعۃ فی غیرہ کان الرجل یلقی قاتل ابیہ فیہ فلا یھیجہ ﴿وَ اتَّخِذُوْا﴾ ایھا الناس ﴿مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰھٖمَ﴾ ھو الحجر الذی قام علیہ عند بناء البیت ﴿مُصَلًّی﴾ مکان صلوۃ بان تصلوا خلفہ رکعتی الطواف و فی قراءۃ بفتح الخاء خبر ﴿وَ عَھِدْنَآ اِلٰٓی اِبْرٰھٖمَ وَ اِسْمٰعِیْلَ﴾ امرناھما ﴿اَنْ﴾ ای بان ﴿طَھِّرَا بَیْتِیَ﴾ من الاوثان ﴿لِلطَّآئِفِیْنَ وَ الْعٰکِفِیْنَ﴾ المقیمین فیہ ﴿وَ الرُّکَّعِ السُّجُوْدِ ٥﴾ جمع راکع و ساجد المصلین

حل اللغات: ﴿فداء﴾ مال وغیرہ دے کر چھڑانا ﴿اختبر الشئ﴾ آزمانا، حقیقت حال سے واقف ہونا ﴿کلفہ بھا﴾ ان کو اس کا مکلف بنایا ﴿مناسک الحج﴾ حج کے احکام ﴿قص الشارب﴾ مونچھ کاٹنا ﴿فرق الرأس﴾ مانگ نکالنا ﴿نتف الابط﴾ بغل کے بال اکھیڑنا ﴿حلق العانۃ﴾ موئے زیر ناف مونڈنا ﴿الختان﴾ ختنہ کرنا ﴿قدوۃ فی الدین﴾ دینی پیشوا ﴿یثوبون الیہ﴾ اس کی جانب پلٹ آئیں گے ﴿مامنا لھم﴾ ان کے لئے جائے امن

﴿فلا یهیجه﴾ تو اسے نہ چھیڑے ﴿اقفر﴾ چٹیل میدان۔

ترجمہ: ﴿اے اولاد یعقوب یاد کرو میرا احسان جو میں نے تم پر کیا اور وہ جو میں نے اس زمانہ کے سب لوگوں پر تمہیں بڑائی دی﴾ اس مضمون کی آیت پہلے گزر چکی ﴿اور ڈرو﴾ خوف کرو ﴿اس دن سے کہ نہ پکڑا جائے گا﴾ تجزی، تغنی کے معنی میں ہے [یعنی کام نہ آئے گا] ﴿کوئی آدمی کسی کے عوض اور نہ قبول کیا جائے گا اس سے مالی تاوان﴾ کوئی فدیہ ﴿اور نہ نفع دے گی اسے کوئی سفارش اور نہ ہی ان کی مدد کی جائے گی﴾ کہ اللہ کے عذاب سے انھیں بچالیا جائے ﴿اور یاد کرو﴾ جب آزمایا ابراہیم کو﴾ ایک قراءۃ میں ابراہام ہے ﴿اس کے رب نے چند باتوں سے﴾ کچھ اوامر ونواہی کا انھیں مکلف بنایا بعض نے فرمایا وہ مناسک حج تھے اور بعض کے نزدیک وہ کلی کرنا، ناک میں پانی چڑھانا، مسواک کرنا، مونچھ کاٹنا، مانگ نکالنا، ناخن تراشنا، بغل کے بال اکھیڑنا، موئے زیر ناف مونڈنا، ختنہ کرنا اور استنجا کرنا ہے ﴿تو اس نے وہ پوری کر دکھائیں﴾ انھیں پورے طور پہ بجالائے ﴿فرمایا﴾ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام سے ﴿میں تمہیں لوگوں کا پیشوا بنانے والا ہوں﴾ یعنی دینی پیشوا ﴿عرض کی اور میری اولاد سے﴾ یعنی میری اولاد کو بھی پیشوا بنادے ﴿فرمایا نہیں پہنچتا میرا وعدہ﴾ امامت عطا کرنے کا ﴿ظالموں تک﴾ ان میں سے کافروں تک یہ دلالت کرتا ہے اس امر پر کہ یہ عہد غیر ظالم ہی پائیں گے ﴿اور یاد کرو جب ہم نے بنایا اس گھر کو﴾ یعنی خانۂ کعبہ کو ﴿لوگوں کے لئے مرکز﴾ یعنی مرجع کہ لوگ ہر جانب سے پلٹ کر اسی کی طرف آئیں گے ﴿اور امن کی جگہ﴾ لوگوں کے لئے جائے پناہ اس ظلم اور غارت گری سے جو دوسری جگہ واقع ہوتا ہے حتی کہ اگر کوئی شخص اپنے باپ کے قاتل کو بھی اس میں پالیتا تو اسے نہیں چھیڑتا ﴿اور بنالو﴾ اے لوگو! ﴿مقام ابراہیم کو﴾ یہ وہ پتھر ہے جس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام خانۂ کعبہ بناتے وقت کھڑے ہوئے تھے ﴿جائے نماز﴾ نماز پڑھنے کی جگہ اس طرح کہ اس کے پیچھے دو رکعت نماز طواف ادا کرلیا کرو اور ایک قراءۃ میں خا کے فتحہ کے ساتھ و اتخذوا ہے اور تب یہ خبر ہے ﴿اور ہم نے تاکید فرمائی ابراہیم اور اسمٰعیل کو﴾ ہم نے انھیں حکم دیا ﴿کہ میرا گھر خوب ستھرا کرو﴾ بتوں سے ﴿طواف والوں اور اعتکاف والوں﴾ جو اس میں معتکف ہوں ﴿اور رکوع وسجود والوں کے لئے﴾ رکع اور سجود، راکع اور ساجد کی جمع ہے مراد نمازی ہیں۔

توضیح و تشریح: قوله: تقدم مثله — یعنی اس قسم کی آیت اور مضمون کا ذکر ماسبق میں بھی ہوا ہے اب دوبارہ اس کا ذکر یاد دہانی کے طور پہ ہے جیسے ایک منطقی اولاً دعویٰ پیش کرتا ہے، پھر اس پر دلائل قائم کرتا ہے اور پھر نتیجہ میں وہی دعویٰ ذکر کرتا ہے تاکہ دعویٰ یاد رہے۔ لہٰذا حقیقتاً تکرار نہیں۔

قوله: اختبر. یہ لفظ ابتلی کا ترجمہ ہے جس کا اردو میں معنی ہے آزمائش میں ڈالا، جانچا، امتحان لیا، یوں تو امتحان واختبار کی غرض یا تو مختبر کی استعداد سے واقفیت حاصل کرنی ہوتی ہے یا اس کی اچھائی برائی ظاہر کرنے کے لئے ہوتی ہے آیا کہ وہ صادق ہے یا کاذب، مگر اللہ تعالیٰ جب کسی کو آزمائش میں ڈالتا ہے تو اس کی غرض یہ نہیں ہوتی جو بیان کی گئی کیونکہ وہ علیم وخبیر اور ساری مخلوق کے احوال سے واقف ہے بلکہ اللہ وحدہ لاشریک کی جانب سے آزمائش کا منشاء یہ ہوتا ہے کہ سارے لوگوں پر اس بندے کی خوبی واضح ہوجائے تاکہ جب اسے بزرگی عطا کی جائے اور اس پر انعام کیا جائے تو کسی کو اعتراض کی گنجائش نہ

ملے چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی آزمائش اسی مقصد کے لئے تھی۔

قولہ: و فی قراءۃ ابراھام. یہ ابن عامر کی قراءت ہے اور متواتر ہے، ابراہیم سریانی لفظ ہے جس کا عربی میں ترجمہ ہے اب رحیم اور اردو میں مہربان باپ آپ بچوں پر بہت مہربان تھے اس لئے آپ کا یہ نام پڑا چونکہ مکۃ المکرمہ بلکہ تمام اہل عرب اور یہود و نصاریٰ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نام سے واقف تھے اور انھیں جانتے تھے بلکہ ہر فریق کو اس بات پر فخر تھا کہ ہم ابراہیم علیہ السلام کی نسل سے ہیں اور ان کے طریقے پر گامزن ہیں اللہ تعالیٰ نے ان کی اولاد کے لئے برکت کا وعدہ کیا ہے، لہٰذا ہم ہر حال میں بخشے جائیں گے، اس لئے یہاں پہلی دفعہ ہی بغیر کسی تمہید و تعارف کے ان کا ذکر فرمایا اور یہود و نصاریٰ سمیت مشرکین عرب کو جواب دیا کہ ''تم ابراہیم کے طریقے پر نہیں وہ ہمارا نہایت فرمانبردار بندہ تھا ہم نے اسے کئی باتوں میں آزمایا وہ سچا نکلا جس کے بعد ہم نے اس کو تمام عالم کا پیشوا بنایا اور اس کی اولاد میں بھی پیشوا یعنی نبی بنانے کا وعدہ کیا مگر اس شرط کے ساتھ کہ یہ عہدہ بدکاروں اور نااہلوں کو نہیں ملے گا، لہٰذا اے یہود و نصاریٰ اور عرب کے مشرکو! تم پر لازم ہے کہ اپنے مسلم الثبوت بزرگ کی پیروی کرو اور نبی آخر الزماں کی اطاعت بجالاؤ جن کے لئے خود ابراہیم نے دعا کی تھی'' و من ذریتی " (تفسیر حقانی)

قولہ: باوامر و نواہ الخ یہاں بکلمات کے معنی مراد میں مفسرین کا اختلاف ہے، حضرت مفسر نے تین اقوال ذکر کئے ہیں، پہلا قول یعنی اس سے مراد اوامر و نواہی ہیں، یہ قول حضرت مفسر اور بیضاوی وغیرہ کا ہے اور ظاہر ہے کہ یہی ان کے نزدیک قوی ہے، دوسرا قول قتادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا اور تیسرا حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ہے جنھیں مفسر علام نے بصیغہ تمریض سے ذکر کر کے ان کے ضعف کی طرف اشارہ فرمایا، صاحب تفسیر حقانی کے نزدیک قوی تر قول یہ ہے کہ اس سے مراد یہ سات امور ہیں: (۱) آفتاب اور چاند سے آزمائش (۲) نمرود سے مقابلہ (۳) بڑی عمر میں ختنہ (۴) آگ میں ڈالا جانا (۵) فرزند کا ذبح کرنا (۶) اللہ کی راہ میں ترک وطن کرنا (۷) اپنی بیوی اور فرزند کو بحکم الٰہی جنگل میں چھوڑنا۔ فقیر راقم سطور کے نزدیک صحیح تر قول حضرت مفسر کا ہے کہ وہ سب اقوال کو جامع ہے۔ و اللہ اعلم و علمہ اتم.

قولہ: قدوۃ فی الدین. یہ لفظ امام کا معنی مراد ہے، لغت میں امام اسے کہتے ہیں جس کی پیروی کی جائے لہٰذا اس آیت کا معنی یہ ہوا کہ آپ کو دینی پیشوا بنائیں گے کہ تمام انبیاء اور ان کی امتیں آپ کی پیروی اور اتباع کریں گی، امام کے اوصاف کے متعلق علامہ قرطبی فرماتے ہیں ''امام وہ ہوتا ہے جس کا دامن کبیرہ گناہوں سے داغدار نہ ہو۔ احسان و فضل کی صفات سے متصف ہو اور اس میں حکومت کی ذمہ داریوں کو بجالانے کی قوت بھی ہو'' (بحوالہ تفسیر ضیاء القرآن)

قولہ: بان تصلوا خلفہ مقام ابراہیم کے پیچھے نماز پڑھنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ پتھر نمازی کے سامنے سمت قبلہ میں ہو اس نماز کا حکم احناف اور شوافع دونوں کے نزدیک استحبابی ہے وجوبی نہیں۔ (خزائن العرفان و بیضاوی)

آگے مفسر علام نے و فی قراءۃ سے لفظ اتخذوا میں ایک اور سبعی قراءۃ کو بیان کیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ دوسری قراءۃ جو نافع اور ابن عامر کی ہے وہ ''خ'' کے فتحہ کے ساتھ اتخذوا صیغہ ماضی ہے، اس تقدیر پر اس کا عطف جَعَلْنا

پر ہوگا اور معنی یہ ہوگا ''لوگوں نے مقام ابراہیم کو مصلّٰی بنایا'' اور جمہور کی قراءت ''خ'' کے کسرہ کے ساتھ و اتخذوا صیغہ امر ہے اس تقدیر پر اس سے پہلے لفظ قلنا پوشیدہ ہوگا اور جعلنا پر عطف صحیح نہیں ہوگا کہ انشاء کا عطف خبر پر صحیح نہیں، معنی یہ ہوگا ''ہم نے کہا کہ تم مقام ابراہیم کو مصلّٰی بنالو''

قولہ: من الاوثان. اس تفسیر پر بظاہر ایک اعتراض پیدا ہوتا ہے وہ یہ کہ خانہ کعبہ کی تعمیر کے وقت اس میں بت نہیں رکھے ہوئے تھے پھر خانہ کعبہ کو بتوں سے پاک کرنے کا حکم کیوں دیا گیا، جواب یہ ہے کہ یہ حکم مستقبل کے لحاظ سے ہے، یعنی علم الٰہی میں تھا کہ مشرکین خانہ کعبہ میں بت رکھیں گے لہٰذا پیشگی خانہ کعبہ کو بتوں سے پاک رکھنے کا حکم دے دیا۔ یہ مطلب نہیں کہ بناء کعبہ کے وقت اس میں بت رکھے ہوئے تھے جس سے پاک کرنے کا حکم دیا جارہا ہے۔ (صاوی)

فائدہ: مقام ابراہیم وہ جنتی پتھر ہے جو حضرت آدم علیہ السلام کے ساتھ دنیا میں آیا اور اس پر کھڑے ہو کر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خانہ کعبہ کی عمارت بنائی تھی، اس پتھر کی خوبیوں میں سے ایک یہ ہے کہ تعمیر کعبہ کے وقت جس قدر عمارت بلند ہوتی جاتی تھی یہ پتھر بھی اونچا ہوتا جاتا تھا یہاں تک کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام تعمیر کعبہ سے فارغ ہو گئے اور کسی دوسرے پتھر کی ضرورت نہیں پڑی، اس پتھر کی دوسری خوبی یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تعمیر کعبہ سے فارغ ہو کر بحکم الٰہی اسی پتھر پر کھڑے ہو کر چوطرفہ آواز دی تھی کہ ''اے اللہ کے بندو! حج کے لئے آؤ'' یہ آواز قیامت تک پیدا ہونے والی روحوں نے سنی جو خاموش رہیں انھیں حج نصیب نہ ہوگا اور جس نے جتنی بار لبیک کہا اتنے ہی حج کرے گا، تیسری خوبی یہ ہے کہ اس پتھر پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نشان قدم نمودار ہو گئے تھے جو ایک عرصہ تک باقی رہے پھر کثرت سے چومنے کی وجہ سے کچھ محو ہو گئے اور اب خفیف سا نشان باقی ہے۔ پہلے یہ پتھر خانہ کعبہ سے متصل رکھا ہوا تھا اور اب مطاف کے کنارے چاہ زمزم کے پاس رکھا ہوا ہے جس پر پیتل کی جالی لگی ہوئی ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مختصر حالات:

نام ابراہیم اور لقب ابوالضیفان ہے آپ کا نسب یوں ہے: ابراہیم بن تارخ بن ناخور بن ساروغ بن راعو بن تالع بن عابر بن شالح بن ارفخشد بن سام بن نوح بن مالک بن متوشالح بن ادریس علیہ السلام بن یارو بن ململ ایل بن قینان بن انوش بن شیث بن آدم علیہ السلام (تفسیر حقانی)

آپ کی پیدائش طوفان نوح سے سترہ سو نو سال بعد اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے تقریباً دو ہزار تین سو سال پیشتر شہر بابل سے قریب اہواز کے علاقہ مقام سوس میں ہوئی آپ بچپن ہی سے نہایت ذکی اور ہونہار تھے، آپ کی قوم کے لوگ عموماً مذہب صابی رکھتے تھے بت کے ساتھ آفتاب و ماہتاب اور ستاروں کو بھی پوجتے تھے، اس لئے آپ اپنی قوم کو دعوت حق دیتے اور توحید الٰہی پر ان سے مناظرہ کرتے، جس کی وجہ سے ایک مرتبہ نمرود نے جو بابل کا بادشاہ تھا آپ کو جلتی ہوئی آگ میں ڈال دیا مگر آپ صحیح وسلامت آگ سے نکل آئے پھر بحکم الٰہی اپنے آبائی وطن سے ہجرت فرمائی اور ارض فلسطین کو آخری قیام گاہ

بنایا۔ سخت ترین آزمائش میں ڈالے گئے اور سب میں کامیاب ہوئے بالآخر ۱۷۵ برس کی عمر شریف میں داعی اجل کو لبیک کہا اور اپنی بیوی حضرت سارہ کے قریب ارض فلسطین میں مدفون ہوئے۔ (عزیزی، حقانی)

﴿وَ اِذْ قَالَ اِبْرَاهِیْمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا﴾ اَلْمَكَانَ ﴿بَلَدًا اٰمِنًا﴾ ذَا اَمْنٍ وَ قَدْ اَجَابَ اللّٰهُ دُعَائَهٗ فَجَعَلَهٗ حَرَمًا لَا یُسْفَكُ فِیْهِ دَمُ اِنْسَانٍ وَ لَا یُظْلَمُ فِیْهِ اَحَدٌ وَ لَا یُصَادُ صَیْدُهٗ وَ لَا یُخْتَلٰی خَلَاهُ ﴿وَ ارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرَاتِ﴾ وَ قَدْ فُعِلَ بِنَقْلِ الطَّائِفِ مِنَ الشَّامِ وَ كَانَ اَقْفَرَ لَا زَرْعَ بِهٖ وَ لَا مَاءَ ﴿مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ﴾ بَدَلٌ مِّنْ اَهْلِهٖ وَ خَصَّهُمْ بِالدُّعَاءِ لَهُمْ مُوَافَقَةً لِقَوْلِهٖ لَا یَنَالُ عَهْدِی الظّٰلِمِیْنَ قَالَ تَعَالٰی ﴿وَ﴾ اَرْزُقُ ﴿مَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ﴾ بِالتَّشْدِیْدِ وَ التَّخْفِیْفِ فِی الدُّنْیَا بِالرِّزْقِ ﴿قَلِیْلًا﴾ مُدَّةَ حَیَاتِهٖ ﴿ثُمَّ اَضْطَرُّهٗ﴾ اُلْجِئُهٗ فِی الْاٰخِرَةِ ﴿اِلٰی عَذَابِ النَّارِ﴾ فَلَا یَجِدُ عَنْهَا مَحِیْصًا ﴿وَ بِئْسَ الْمَصِیْرُ ۝﴾ اَلْمَرْجِعُ هِیَ ﴿وَ﴾ اذْكُرْ ﴿اِذْ یَرْفَعُ اِبْرَاهِیْمُ الْقَوَاعِدَ﴾ اَلْاُسُسَ اَوِ الْجُدُرَ ﴿مِنَ الْبَیْتِ﴾ یَبْنِیْهِ مُتَعَلِّقٌ بِیَرْفَعُ ﴿وَ اِسْمٰعِیْلُ﴾ عَطْفٌ عَلٰی اِبْرَاهِیْمَ یَقُوْلَانِ ﴿رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا﴾ بِنَائَنَا ﴿اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِیْعُ﴾ لِلْقَوْلِ ﴿الْعَلِیْمُ ۝﴾ بِالْفِعْلِ ﴿رَبَّنَا وَ اجْعَلْنَا مُسْلِمَیْنِ﴾ مُنْقَادَیْنِ ﴿لَكَ﴾ وَ اجْعَلْ ﴿مِنْ ذُرِّیَّتِنَا﴾ اَوْلَادِنَا ﴿اُمَّةً﴾ جَمَاعَةً ﴿مُسْلِمَةً لَّكَ﴾ وَ مِنْ لِلتَّبْعِیْضِ وَ اَتٰی بِهٖ لِتَقَدُّمِ قَوْلِهٖ لَا یَنَالُ عَهْدِی الظّٰلِمِیْنَ ﴿وَ اَرِنَا﴾ عَلِّمْنَا ﴿مَنَاسِكَنَا﴾ شَرَائِعَ عِبَادَتِنَا اَوْ حَجِّنَا ﴿وَ تُبْ عَلَیْنَا اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ ۝﴾ سَاَلَاهُ التَّوْبَةَ مَعَ عِصْمَتِهِمَا تَوَاضُعًا وَ تَعْلِیْمًا لِذُرِّیَّتِهِمَا ﴿رَبَّنَا وَ ابْعَثْ فِیْهِمْ﴾ اَیْ اَهْلِ الْبَیْتِ ﴿رَسُوْلًا مِّنْهُمْ﴾ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَ قَدْ اَجَابَ اللّٰهُ دُعَاهُ بِمُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ ﴿یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِكَ﴾ اَلْقُرْاٰنَ ﴿وَ یُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ﴾ اَلْقُرْاٰنَ ﴿وَ الْحِكْمَةَ﴾ مَا فِیْهِ مِنَ الْاَحْكَامِ ﴿وَ یُزَكِّیْهِمْ﴾ یُطَهِّرُهُمْ مِنَ الشِّرْكِ ﴿اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ﴾ اَلْغَالِبُ ﴿الْحَكِیْمُ ۝﴾ فِیْ صُنْعِهٖ.

ترجمہ: ﴿اور جب عرض کی ابراہیم نے کہ اے میرے رب بنادے اس کو﴾ یعنی اس جگہ کو ﴿امان والا شہر﴾ اطمینان بخش تو اللہ تعالےٰ نے ان کی دعا قبول فرمائی اور اسے حرم بنادیا، اس میں کسی انسان کو نہ قتل کیا جاسکتا ہے، نہ اس میں کسی پر ظلم کیا جاسکتا ہے اور نہ کسی جانور کا شکار کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی اس کی گھاس اکھاڑی جاسکتی ہے ﴿اور اس کے رہنے والوں کو طرح طرح کے پھلوں سے روزی دے﴾ اللہ تعالیٰ نے یہ دعا بھی طائف کو ملک شام سے منتقل کرکے قبول فرمالیا حالانکہ وہ علاقہ بے آب وگیاہ تھا ﴿جو ان میں سے اللہ اور روز قیامت پر ایمان لائیں﴾ لفظ من بدل واقع ہے اھلہ سے اور دعا میں مومنین کی تخصیص اللہ تعالیٰ کے قول "لاینال عھدی الظّٰلمین کی موافقت میں ہے ﴿فرمایا﴾ اللہ تعالیٰ نے ﴿اور﴾ میں روزی دوں گا ﴿کافر کو بھی برتنے کو﴾ (اُمتعہ) تشدید اور تخفیف کے ساتھ ہے دنیا میں تھوڑی روزی سے برتنا مراد ہے ﴿چند روز﴾ اس کی زندگی بھر ﴿پھر اسے مجبور کردوں گا﴾ اسے آخرت میں کھینچوں گا ﴿عذاب دوزخ کی طرف﴾ تو اس سے چھٹکارے کی راہ نہ پائے گا ﴿اور یہ بہت ہی برا ٹھکانا ہے﴾ پلٹنے کی جگہ ہے ﴿اور﴾ یاد کرو ﴿جب اٹھا رہے تھے ابراہیم

بنیادیں ﴾ (قواعد) سے مراد بنیاد یا دیوار (ہے) ﴿خانۂ کعبہ کی ﴾ اسے بنا رہے تھے، من البیت متعلق ہے یرفع کے ﴿اور اسمٰعیل بھی ﴾ اس کا عطف ابراہیم پر ہے۔ یہ کہتے ہوئے ﴿اے ہمارے رب ہم سے قبول فرما ﴾ ہماری تعمیر ﴿بے شک تو ہی سننے والا ہے ﴾ قول کا ﴿جاننے والا ہے ﴾ فعل کا ﴿اے ہمارے رب بنادے ہم کو فرمانبردار ﴾ اطاعت گزار ﴿اپنا ﴾ اور بنادے ﴿ہماری ذرّیت میں سے ﴾ ہماری اولاد سے ﴿ایک امّت ﴾ ایک جماعت ﴿جو تیری فرمانبردار ہو ﴾ مِن تبعیضیہ ہے جسے لانے کی وجہ ماقبل میں لاینال عھدی الظّٰلمین کا آنا ہے ﴿اور ہمیں بتادے ﴾ ہمیں سکھادے ﴿ہماری عبادت کے قاعدے ﴾ ہماری عبادت کے طریقے یا ہمارے حج کے احکام ﴿اور ہم پر اپنی رحمت کے ساتھ رجوع فرما بے شک تو ہی بہت توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے ﴾ دونوں حضرات نے معصوم ہونے کے باوجود توبہ کی، محض تواضع اور اپنی اولاد کو تعلیم دینے کے لئے ﴿اے ہمارے رب اور بھیج ان میں ﴾ یعنی اہل خاندان [ذرّیت] میں ﴿ایک رسول انھیں میں سے ﴾ تو اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ دعا حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی شکل میں قبول فرمائی ﴿کہ ان پر تیری آیتیں تلاوت فرمائے ﴾ یعنی قرآن ﴿اور سکھائے انھیں یہ کتاب ﴾ قرآن ﴿اور دانائی کی باتیں ﴾ جو اس میں احکام ہیں ﴿اور انھیں خوب ستھرا فرمادے ﴾ انھیں شرک سے پاک کردے ﴿بے شک تو ہی بہت زبردست ﴾ غالب ﴿حکمت والا ہے ﴾ اپنی صنعت میں۔

توضیح و تشریح: قوله: المکان. اس تقدیری لفظ سے حضرت مفسر نے ہذا کے مشار الیہ کو بیان کیا ہے، یعنی ہذا سے اشارہ اس بے آب وگیاہ مقام کی طرف ہے جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی بیوی ہاجرہ اور فرزند اسمٰعیل علیہ السلام کو چھوڑ چلے تھے۔ اس سے مراد شہر نہیں کہ اس وقت شہر کا وجود ہی نہیں تھا، اور جن مترجمین قرآن نے مشار الیہ شہر کو قرار دیا ہے انھوں نے مآوّل کے اعتبار سے ترجمہ کیا ہے۔ و لا حرج فیه.

قوله: بنقل الطائف — طائف ارض شام کا ایک ٹکڑا ہے جسے حضرت جبریل امین بحکم الٰہی اپنے پروں پر اٹھا کر لائے، اولاً سات مرتبہ خانۂ کعبہ کے گرد طواف کرایا [اسی لئے اس کا نام طائف ہوا] اور پھر مکہ سے تین دن کی مسافت پر دو پہاڑوں کے اوپر رکھ دیا یہاں کی آب و ہوا بہت عمدہ ہوتی ہے اور مختلف انواع کے نفیس میوے بکثرت پیدا ہوتے ہیں جب کہ مکہ کی آب و ہوا گرم خشک اور زمین بنجر ہے۔ (تفسیر عزیزی وغیرہ)

قوله: و خصھم بالدعا الخ یہ دوسری دعا میں مؤمنین کو خاص کرنے کی وجہ کا بیان ہے چونکہ پہلی دعا میں لاینال عھدی الظّٰلمین کہہ کر یہ ہدایت کی گئی تھی کہ امامت صرف فرماں برداروں کا حصہ ہے، اس لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دوسری دعا میں رزق کا سوال صرف اہل ایمان کے لئے کیا۔

قوله: مدة حیاته. یہ قلیلاً کا مصداق ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا مزید وسعت کے ساتھ قبول فرمائی مگر واضح فرمادیا کہ کافرین کو صرف دنیاوی زندگی تک ہی روزی ملے گی، اس کے بعد انھیں عذاب میں ڈال دیا جائے گا۔

قوله: الجئه فی الآخرة یہ ایک سوال مقدر کا جواب ہے، سوال یہ ہے کہ کسی کو کھینچا جاتا ہے ایسی چیز کی جانب جس سے ضرر کو دفع کیا جائے اور عذاب خود ضرر ہے پھر اس کی طرف کھینچنے کا کیا معنی؟ جواب یہ ہے کہ یہاں آیت میں استعار

تبعیہ ہے اس طرح کہ کفار کے حال کو تشبیہ دی گئی ہے اس مضطر کے حال سے جو کسی ایک ہی کام کے کرنے پر مجبور ہو اور منع کی قدرت نہ رکھتا ہو۔ یہی حال کفار کا ہے کہ وہ جہنم میں جانے پر مجبور ہوں گے اور اس سے بچنے کی کوئی سبیل نہ ہوگی، علت جامعہ چھٹکارے کی راہ نہ پانا ہے۔ فی الاخرۃ کی قید اس لئے ہے کہ کلام الٰہی میں کذب کا احتمال نہ پیدا ہو کیونکہ دنیا میں کفار عذاب جہنم میں نہیں ڈالے جاتے۔

قوله: الاسس او الجدار یہ آیت میں وارد لفظ قواعد کا معنی مراد ہے۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ قواعد جمع ہے قاعدہ کی جس کا لفظی معنی ہے ''ثابت رہنے والی چیز'' اس لئے بیٹھنے والے کو قاعد کہتے ہیں کہ وہ اپنے حال پر ثابت رہتا ہے، لہٰذا یہاں قواعد سے مراد خانہ کعبہ کی بنیادیں یا دیواریں ہیں، کہ یہ دونوں زمین میں قائم اور ثابت رہتی ہیں۔

قوله: عطف علی ابراھیم. یہ دفع دخل مقدر ہے۔ سوال یہ پیدا ہوا کہ آیت میں لفظ اسمٰعیل جملہ مستانفہ ہے کیونکہ اگر اس کا عطف لفظ ابراہیم پر ہوتا تو اسے مفعول یعنی القواعد سے مقدم ہونا چاہیے تھا۔ جواب کا حاصل یہ ہے کہ لفظ اسمٰعیل کو اس لئے مؤخر کیا کہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام حقیقت میں خانہ کعبہ کے بانی نہیں بانی صرف حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں مگر چونکہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام تعمیر کعبہ میں گارا اور پتھر وغیرہ دے کر حضرت ابراہیم علیہ السلام کا تعاون کرتے تھے لہٰذا ان کا بھی تعمیر کعبہ میں دخل تھا اس لئے اصل بانی پر معاون کا عطف کر دیا گیا۔ (ترویح الارواح)

قولہ: یقولان. حضرت مفسر نے اس لفظ کو اس لئے مقدر مانا ہے کہ آنے والا جملہ انشائیہ کا ابراہیم واسمٰعیل سے حال واقع ہونا صحیح ہو جائے کیونکہ جملہ انشائیہ براہ راست حال واقع نہیں ہوتا، اور ماضی کی بجائے مضارع کا صیغہ حکایت حال ماضیہ کے لئے ہے۔ (صاوی)

قوله: منقادین. یہ مسلمین کا ترجمہ ہے۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ مسلمَیْنِ تثنیہ ہے مسلم کا، جو بنا ہے اسلام سے اور جس کا لغوی معنی ہے، سپرد کرنا، فرمانبرداری کرنا، محفوظ ہو جانا اصطلاح میں جب لفظ اسلام مطلق آتا ہے تو درستی اعتقاد کا معنی دیتا ہے اور جب لام کے ساتھ آتا ہے تو فرمانبرداری کا معنی دیتا ہے، یہاں چونکہ لام کے ساتھ ہے اس لئے دوسرے معنی میں ہے۔ البتہ اصل فرمانبرداری کی طلب مراد نہیں بلکہ فرمانبرداری میں استقامت یا طلب کمال مطلوب ہے۔ (تفسیر کبیر وصاوی ملخصا)

قولہ: جماعة. یہ لفظ امت کا معنی مراد ہے چونکہ اس کا اطلاق واحد پر بھی ہوتا ہے جیسے "ان ابراھیم کان امة اور جمع پر بھی ہوتا ہے جیسے: انا وجدنا آباء نا علی امة" مگر یہاں دوسرے معنی میں ہے اس لئے مفسر علام نے لفظ جماعت مقدر مانا۔

خیال رہے لفظ امۃ بنا ہے اُم سے جس کا لغوی معنی ہے ''اصل'' ماں کو بھی ام اسی لئے کہتے ہیں کہ وہ بچے کی اصل ہوتی ہے اور اصطلاح میں امت وہ جماعت ہے جو کسی ایک چیز میں باختیار یا بلا اختیار جمع ہو۔ اور شریعت میں وہ جماعت امت کہلاتی ہے جو کسی ایک دین میں متفق ہو، لہٰذا ایک باپ کی اولاد، ایک پیر کے مریدین اور ایک گھر کے لوگ لغۃً امت ہیں شرعاً نہیں کہ یہاں دین میں جمع ہونا ملحوظ نہیں۔ (تفسیر نعیمی)

قولہ: شرائع عبادتنا الخ یہ لفظ مناسک کے معنی مراد کا بیان ہے۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ لفظ مناسک جمع ہے منسک بفتح سین کی یا مَنْسِك بکسر سین کی اور یہ دونوں بنے ہیں نسک سے جس کا معنی ہے ''عبادت کرنا'' مگر عرف میں زیادہ تر حج کے افعال و مقامات کو مناسک کہتے ہیں یہاں مناسک سے یا تو مطلقاً عبادات کے طور طریقے مراد ہیں یا خصوصاً احکام حج مراد ہیں چونکہ مفسرین نے دونوں قول کیا ہے اس لئے حضرت مفسر نے دونوں کو ذکر فرمادیا۔

تفسیر عزیزی نے اس مقام پر تفسیر ابن جریر کے حوالہ سے حضرت علی اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی یہ روایت ذکر کی کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بارگاہ الٰہی میں یہ دعا کی تو اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام کو حکم دیا کہ میرے خلیل کو حج کا طریقہ بتادو، حضرت جبرئیل علیہ السلام نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حج کرایا اور احرام سے لے کر حلق تک جو کچھ ارکان حج اور سنن و مستحبات ہیں سب سکھادیا، اسی دوران تین دن دسویں، گیارہویں اور بارہویں کو تین جگہ شیطان ملا جسے دفع کرنے کے لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اسے تکبیر کہتے ہوئے سات سات کنکر مارے، پھر حضرت جبرئیل علیہ السلام نے عرض کیا کہ آئندہ آپ کی اولاد بھی اس جگہ کنکر مارا کرے گی۔ اس روایت سے ظاہر ہے کہ یہاں مناسک سے مراد احکام حج ہیں. و العلم عند الله.

قولہ: قد اجاب الله الخ یہ دعائے ابراہیمی کے مصداق کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو مبعوث فرما کر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی آخری دعا بھی قبول فرمالی۔ رہا یہ سوال کہ دعائے ابراہیمی کے مصداق حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہی کیوں ہیں، اولاد اسحٰق کیوں نہیں؟ تو اس کا جواب مذکورہ بالا آیت میں غور کرنے سے واضح ہو جاتا ہے، چنانچہ "و ابعث فیهم" اور "رسولا منهم" پر غور کیا جائے تو ظاہر ہوگا کہ ضمیر "هم" کا مرجع یا امة مسلمة ہے یا ذریتنا ہے، ان کے علاوہ کوئی اور لفظ نہیں جو کسی تاویل سے بھی هم کا مرجع بنایا جاسکتا ہو، اب دونوں لفظوں میں سے کسی ایک کو مرجع بنایا جائے تو پہلی صورت میں معنی یہ ہوگا کہ ''امت مسلمہ میں سے جو ہماری'' [ابراہیم و اسمٰعیل کی] اولاد میں سے ہو رسول مبعوث فرما، دوسری صورت میں یہ معنی ہوگا کہ ہماری اولاد میں سے ایک رسول مبعوث فرما، دونوں صورتوں میں یہی ثابت ہوتا ہے کہ اس دعا کا وہی مصداق ہے جو ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام دونوں کی نسل سے ہو، اور جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل سے تو ہیں مگر اسمٰعیل علیہ السلام کی نسل سے نہیں جیسے اولاد اسحاق علیہ السلام تو وہ اس دعاء کا مصداق نہیں بن سکتے اور چونکہ ان دونوں حضرات کی نسل سے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے علاوہ کوئی رسول مبعوث نہیں ہوا لہٰذا حضور ہی اس دعا کا مصداق ٹھہرے چنانچہ خود حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا "انا دعوة ابی ابراهیم" میں اپنے باپ ابراہیم کی دعا ہوں۔ (مسہلاً ما فی تفسیر ضیاء القرآن)

مکۃ المکرمہ کی آبادی:

تفسیر عزیزی اور حقانی وغیرہ نے نقل کیا کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے نمرود کے ہاتھ سے نجات پائی اور بابل

والوں کے ایمان سے مایوس ہوئے تو بحکم الٰہی وہاں سے ہجرت کر کے اپنے چچا ہاران کے گھر مقام حران آ گئے اور اپنے چچا ہاران کی لڑکی حضرت سارہ سے عقد کیا اور پھر کارِ تبلیغ میں مصروف ہو گئے مگر آپ کی بیوی اور بھتیجے حضرت لوط علیہ السلام کے علاوہ کسی نے آپ کی نبوت کا اقرار نہ کیا بلکہ اہل حران آپ کے دشمن ہو گئے، لہٰذا آپ اپنی بیوی اور بھتیجے کو لے کر حران سے مصر کی طرف ہجرت کر گئے مگر مصر کا بادشاہ ظالم تھا جس نے حضرت سارہ پر ظلم و تعدی کا ارادہ کیا مگر جب بھی وہ دست درازی کا قصد کرتا اس کے دونوں ہاتھ شل ہو جاتے اور اس پر بے ہوشی طاری ہو جاتی، ایسا تین مرتبہ ہوا جس سے شاہ مصر نے حضرت سارہ کو جن یا جادوگرنی سمجھا اور اپنے اہل کاروں کو بلا کر کہا کہ یہ کوئی جادوگرنی ہے، ایسی ہی ایک عورت اور ہے جسے میں نے قبطیوں سے حاصل کیا تھا اور میں اس پر بھی قابو نہ پاسکا اسے (حضرت ہاجرہ کو) بھی اس عورت کے ساتھ کر دو اور دونوں کو مصر سے نکال دو پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام تینوں اصحاب کو لے کر مصر پہنچے، یہاں کے لوگوں نے آپ کی بڑی خاطر و مدارات کی اور بہت ساری زمین نذر کی، اللہ تعالیٰ نے اس زمین میں بڑی برکت عطا فرمائی اور آپ کچھ ہی دنوں میں مالدار ہو گئے، یہیں آپ نے حضرت سارہ کی خواہش پر حضرت ہاجرہ سے عقد کیا جن سے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام پیدا ہوئے اور پھر آپ بحکم الٰہی حضرت ہاجرہ اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو لے کر اس مقام پر آئے جہاں آج خانۂ کعبہ ہے، یہاں زمزم کے مقام پر ایک درخت تھا اسی کے نیچے حضرت ہاجرہ اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو بیٹھایا اور ایک ٹوکری کھجور، کچھ روٹی کے ٹکڑے اور ایک مشکیزہ پانی حضرت ہاجرہ کے حوالے کر کے لوٹ آئے، یہاں جب توشہ اور پانی ختم ہوا اور پیاس نے ستایا تو حضرت اسمٰعیل علیہ السلام شدت پیاس سے اپنی ایڑیاں زمین پر رگڑنے لگے جس سے شیریں پانی کا چشمہ جاری ہوا حضرت ہاجرہ اس چشمہ کو دیکھ کر خوش ہوئیں اور اس کے گرد مٹی جمع کر کے فرمانے لگیں "یا ماء زمزم" اے پانی ٹھہر ٹھہر اسی لئے اس کا نام آب زمزم پڑ گیا کچھ دنوں تک صرف آب زمزم پر حضرت ہاجرہ اور حضرت اسمٰعیل کا گزر ہوتا رہا کیونکہ اس پانی میں غذائیت بھی ہے، اتفاقاً یمن کی ایک قوم جرہم کسی طرح اس طرف آ پہنچی جسے حضرت ہاجرہ نے اس شرط پر وہاں اقامت اختیار کرنے کی اجازت دے دی کہ آب زمزم پر میرے سوا کسی اور کا حق نہ ہوگا یعنی استعمال سب کریں مگر ملکیت میری رہے۔ اس شرط پر قوم جرہم نے وہاں رہائش اختیار کر لی اور اپنے عزیزوں کو بھی بلا لیا جس سے وہاں ایک اچھی خاصی بستی بس گئی، یہی بستی بعد میں مکہ کے نام سے موسوم ہو گئی۔

کعبہ معظّمہ کی مختصر تاریخ:

تاریخ کعبہ کے سلسلہ میں مختلف روایات کا نچوڑ یہ ہے کہ جب حضرت آدم علیہ السلام جنت سے زمین پر تشریف لائے تو وحشت تنہائی سے گھبرا کر عرض کی کہ خدایا! میں یہاں نہ تو ملائکہ کی تسبیح و تہلیل سنتا ہوں اور نہ کوئی عبادت گاہ دیکھتا ہوں، اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ جہاں ہم نشان بتائیں وہاں ایک عبادت گاہ بنا کر اس کے ارد گرد طواف کر لو اور اس کی طرف رخ کر کے نماز بھی ادا کرو، پھر حضرت جبرئیل علیہ السلام آئے اور حضرت آدم علیہ السلام کو اس مقام پر لے گئے جہاں اب خانۂ کعبہ ہے، وہاں حضرت جبرئیل امین نے اپنا پر مار کر ساتویں زمین تک بنیاد ڈال دی جس کو ملائکہ نے پانچ پہاڑوں کے پتھروں سے بھرا

کوہ لبنان، کوہ طور، کوہ جودی، کوہ حرا، اور طور زیتا، بنیاد بھر کر چاروں طرف کی دیواریں اٹھادیں، تفسیر حقانی وغیرہ نے بیان کیا کہ خود بیت المعمور اتار کر اس بنیاد پر رکھ دیا گیا۔ اس طرف رُخ کر کے حضرت آدم علیہ السلام نماز پڑھتے رہے اور اس کا طواف کرتے رہے۔ طوفان نوح تک کعبہ اسی حال پر رہا، اس طوفان کے وقت وہ عمارت تو آسمان پر اٹھالی گئی اور کعبہ کی جگہ ایک سرخ ٹیلہ کی شکل میں باقی رہ گئی یہاں تک کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دوبارہ عمارت کعبہ بنانے کا حکم ہوا اور حدود کعبہ کی مقدار اس طرح متعین کی گئی کہ اللہ تعالیٰ نے بادل کا ایک ٹکڑا بھیجا حضرت جبرئیل نے اس بادل کے سایہ کے مقدار خط کھینچا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس خط پر یہاں تک زمین کھودی کہ بنیاد حضرت آدم نمودار ہوگئی پھر حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو لے کر اسی بنیاد پر عمارت کعبہ بنائی حضرت ابراہیم علیہ السلام دیواریں چنتے تھے اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام گارا اور پتھر دیتے تھے، عمارت کعبہ کا نقشہ تفسیر حقانی کے مطابق یوں تھا کہ بلندی نو ہاتھ اور جانب شرق میں حجر اسود سے رکن یمانی تک کی دیوار ۲۰ رگز تھی، مغرب میں رکن یمانی سے رکن غربی تک کی دیوار ۲۲ رگز، طول میں جانب شمال کی دیوار حجر اسود سے رکن شامی تک ۳۲ رگز اور جنوب میں رکن غربی سے رکن یمانی تک کہ دیوار ۳۱ رگز تھی۔ گویا حضرت ابراہیم علیہ السلام کا بنایا ہوا کعبہ بشکل مستطیل تھا جس کا طول عرض سے زیادہ تھا مگر نہ عرض کے دونوں سرے برابر تھے نہ طول کی دونوں دیواریں برابر تھیں۔ زمین سے ملے ہوئے دو دروازے تھے ایک داخل ہونے کے لئے اور ایک نکلنے کے لئے۔ ایک مدت تک کعبہ اسی ہیئت پر رہا، ایک مرتبہ پہاڑی نالہ کے زور سے یہ عمارت گر گئی تو بنی جرہم نے دوبارہ پہلی ہیئت پر اسے تعمیر کیا، پھر ایک عرصہ کے بعد جب یہ عمارت بھی گر گئی تو بنی حمیر کا ایک قبیلہ عمالیق نے اسے تیسری مرتبہ تعمیر کیا یہ عمارت بھی پہلی ہیئت پر رہی پھر جب یہ عمارت بھی ایک مدت کے بعد ٹوٹ گئی تو قصی بن کلاب نے اسے بنایا مگر اس دفعہ چھت کو لکڑیوں سے پاٹ دیا اور عمارت کعبہ پر سیاہ غلاف ڈال دیا، یہاں تک کہ جب حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی عمر شریف ۲۵ رسال کی ہوئی تو پھر قریش کو اس کی تعمیر کرنی پڑی جس کی وجہ یہ ہوئی کہ ایک عورت خانہ کعبہ کے قریب خوشبو سلگا رہی تھی جس سے اچانک شعلہ اٹھا اور پردے میں آگ لگ گئی اور پھر پوری عمارت جل گئی، اس کے بعد قریش نے خانۂ کعبہ تو بنایا مگر مال حلال کی کمی کے سبب اس میں کچھ تصرف بھی کردیئے اولاً یہ کہ تعمیر ابراہیمی سے چند گز زمین چھوڑ کر اسے حطیم قرار دیا، ثانیاً یہ کہ بجائے دو کے ایک ہی دروازہ رکھا وہ بھی زمین سے تقریباً دو گز اونچا۔ ثالثاً یہ کہ خانۂ کعبہ کے اندر لکڑی کے ستونوں کی دو صفیں قائم کی ہر صف میں تین تین ستون رکھے چہارم یہ کہ اس کی بلندی ۹ رہاتھ کی بجائے ۱۸ رہاتھ کردیا، پنجم یہ کہ رکن شامی کے قریب کعبہ کی چھت پر چڑھنے کے لئے زینہ بھی بنایا، خانۂ کعبہ ایک عرصہ تک اسی حالت پر رہا پھر حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے ۶۴ھ میں کعبہ معظمہ کو از سر نو تعمیر ابراہیمی کی ہیئت پر بنایا پھر کچھ دنوں کے بعد جب بنی امیہ کا دور آیا تو مشہور ظالم حکمراں نائب عبد الملک بن مروان حجاج بن یوسف ثقفی نے ۷۴ھ میں خانۂ کعبہ کو گرا کر پھر بنیاد قریش پر بنا دیا، پھر بنی عباس کے عہد میں ہارون رشید نے قصد کیا کہ بنائے عبد اللہ بن زبیر پر کعبہ کو بنائے مگر علما نے منع کردیا کہ بار بار بنانا اور گرانا کھیل ہوجائے گا لیکن یہ عمارت جب بہت ہی کہنہ ہوگئی تو ۱۰۴۰ھ میں سلطان مراد بن احمد خان سلطان قسطنطنیہ نے سوائے اس گوشہ کے جس میں حجر اسود لگا ہے سب کو گرا کر پھر نئے سرے سے

بنیاد حجاج کے مطابق کعبہ کو بنایا جو آج تک موجود ہے۔

مذکورہ تفصیل سے واضح ہوا کہ خانہ کعبہ کو عمارتی شکل میں سب سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بنایا اور پھر سات مرتبہ خانہ کعبہ بنتا رہا اور موجودہ عمارت شاہ مراد کی بنائی ہوئی ہے جو ۳۹۰ رسال پرانی ہے کیونکہ ۱۰۴۰ھ میں بنی اور اب ۱۴۳۰ھ ہے۔ (تفسیر عزیزی، تفسیر حقانی، تفسیر نعیمی)

﴿وَمَنْ﴾ اَیْ لَا ﴿یَرْغَبُ عَنْ مِلَّةِ اِبْرَاهِیْمَ﴾ فَیَتْرُکُهَا ﴿اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ﴾ جَهِلَ اَنَّهَا مَخْلُوْقَةٌ لِلّٰهِ یَجِبُ عَلَیْهَا عِبَادَتُهٗ اَوْ اِسْتَخَفَّ بِهَا وَ امْتَهَنَهَا ﴿وَ لَقَدِ اصْطَفَیْنٰهُ﴾ اخْتَرْنَاهُ ﴿فِی الدُّنْیَا﴾ بِالرِّسَالَةِ وَ الْخُلَّةِ ﴿وَاِنَّهٗ فِی الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِیْنَ٥﴾ اَلَّذِیْنَ لَهُمُ الدَّرَجَاتُ الْعُلٰی وَ اذْکُرْ ﴿اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗ اَسْلِمْ﴾ اِنْقَدْ لِلّٰهِ وَاَخْلِصْ لَهٗ دِیْنَکَ ﴿قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ٥ وَ وَصّٰی﴾ وَ فِیْ قِرَاءَةٍ اَوْصٰی ﴿بِهَا﴾ بِالْمِلَّةِ ﴿اِبْرٰهِیْمُ بَنِیْهِ وَ یَعْقُوْبُ﴾ بَنِیْهِ قَالَ ﴿یٰبَنِیَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰی لَکُمُ الدِّیْنَ﴾ دِیْنَ الْاِسْلَامِ ﴿فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُسْلِمُوْنَ٥﴾ نَهْیٌ عَنْ تَرْکِ الْاِسْلَامِ وَ اَمْرٌ بِالثَّبَاتِ عَلَیْهِ اِلٰی مُصَادَفَةِ الْمَوْتِ وَ لَمَّا قَالَ الْیَهُوْدُ لِلنَّبِیِّ اَلَسْتَ تَعْلَمُ اَنَّ یَعْقُوْبَ یَوْمَ مَاتَ اَوْصٰی بَنِیْهِ بِالْیَهُوْدِیَّةِ نَزَلَ ﴿اَمْ کُنْتُمْ شُهَدَآءَ﴾ حُضُوْرًا ﴿اِذْ حَضَرَ یَعْقُوْبَ الْمَوْتُ اِذْ﴾ بَدَلٌ مِنْ اِذْ قَبْلَهٗ ﴿قَالَ لِبَنِیْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ بَعْدِیْ﴾ بَعْدَ مَوْتِیْ ﴿قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَکَ وَ اِلٰهَ اٰبَائِکَ اِبْرٰهِیْمَ وَاِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ﴾ عَدُّ اِسْمٰعِیْلَ مِنَ الْاٰبَاءِ تَغْلِیْبٌ لِاَنَّ الْعَمَّ بِمَنْزِلَةِ الْاَبِ ﴿اِلٰهًا وَاحِدًا﴾ بَدَلٌ مِنْ اِلٰهَکَ ﴿وَ نَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ٥﴾ وَ اَمْ بِمَعْنٰی هَمْزَةِ الْاِنْکَارِ اَیْ لَمْ تَحْضُرُوْهُ وَقْتَ مَوْتِهٖ فَکَیْفَ تَنْسِبُوْنَ اِلَیْهِ مَا لَایَلِیْقُ بِهٖ ﴿تِلْکَ﴾ مُبْتَدَأٌ وَ الْاِشَارَةُ اِلٰی اِبْرٰهِیْمَ وَ یَعْقُوْبَ وَ بَنِیْهِمَا وَ اُنِّثَ لِتَانِیْثِ خَبَرِهٖ ﴿اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ﴾ سَلَفَتْ ﴿لَهَا مَاکَسَبَتْ﴾ مِنَ الْعَمَلِ اَیْ جَزَاءُهٗ اِسْتِیْنَافٌ ﴿وَ لَکُمْ﴾ اَلْخِطَابُ لِلْیَهُوْدِ ﴿مَاکَسَبْتُمْ وَ لَا تُسْئَلُوْنَ عَمَّا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ٥﴾ کَمَا لَایُسْئَلُوْنَ عَنْ عَمَلِکُمْ وَ الْجُمْلَةُ تَاکِیْدٌ لِمَا قَبْلَهَا ﴿وَ قَالُوْا کُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰی تَهْتَدُوْا﴾ اَوْ لِلتَّفْصِیْلِ وَ قَائِلُ الْاَوَّلِ یَهُوْدُ الْمَدِیْنَةِ وَ الثَّانِیْ نَصٰرٰی نَجْرَانَ ﴿قُلْ﴾ لَهُمْ ﴿بَلْ﴾ نَتَّبِعُ ﴿مِلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا﴾ حَالٌ مِنْ اِبْرٰهِیْمَ مَائِلًا عَنِ الْاَدْیَانِ کُلِّهَا اِلَی الدِّیْنِ الْقَیِّمِ ﴿وَ مَاکَانَ مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ٥﴾

ترجمہ: ﴿اور کون﴾ یعنی کوئی نہیں ﴿روگردانی کرسکتا ہے دین ابراہیم سے﴾ کہ اسے چھوڑ دے ﴿سوا اس کے جو دل کا احمق ہو﴾ نہ جانتا ہو کہ وہ اللہ کی مخلوق ہے اور اس پر اللہ کی عبادت فرض ہے یا اس نے اپنے نفس کو ذلیل وحقیر کرلیا ہو ﴿اور بے شک ضرور ہم نے اسے چن لیا﴾ اسے منتخب کرلیا ﴿دنیا میں﴾ رسالت اور بے لاگ دوستی کے لئے ﴿اور بلاشبہ وہ آخرت میں ہمارے خاص قرب کی قابلیت والوں میں ہے﴾ جن کے لئے بلند درجات ہوں گے ﴿اور﴾ یاد کرو ﴿جبکہ اس سے اس کے رب نے فرمایا گردن رکھ﴾ اللہ کے لئے جھک جا اور اس کے لئے اپنے دین کو خالص کرلے ﴿عرض کی میں نے گردن رکھی اس کے لئے جو رب ہے سارے جہان کا اور وصیت کی﴾ ایک قرأۃ میں لفظ اوصیٰ ہے ﴿اسی کی﴾ اسی دین کی

﴿ابراہیم نے اپنے بیٹوں کو اور یعقوب نے اپنے بیٹوں کو اور کہا اے میرے بیٹو! بے شک اللہ نے یہ دین تمہارے لئے چن لیا ہے﴾ یعنی دین اسلام ﴿تو نہ مرنا مگر مسلمان﴾ ترک اسلام سے روکا اور آخری دن تک اسلام پر ثابت قدم رہنے کا حکم دیا اور جب یہود نے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے کہا کہ کیا آپ نہیں جانتے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے وفات کے دن اپنی اولاد کو یہودیت پر قائم رہنے کی وصیت کی تھی تب یہ آیت نازل ہوئی ﴿بھلا کیا تم موجود تھے﴾ حاضر تھے ﴿جب یعقوب کو موت آئی﴾ یہ اذ بدل ہے پہلے اذ سے ﴿اس نے اپنے بیٹوں سے فرمایا میرے بعد کس کی پوجا کروگے﴾ میری موت کے بعد ﴿بولے ہم پوجیں گے اسے جو خدا ہے آپ کا اور آپ کے آباء ابراہیم اور اسمٰعیل اور اسحٰق کا﴾ اسمٰعیل علیہ السلام کو آباء سے تغلیباً شمار کیا اور اس لئے کہ چچا باپ کے درجہ میں ہوتا ہے۔ ﴿جو خدائے وحدہ لاشریک ہے﴾ یہ الٰھك سے بدل ہے ﴿اور ہم اس کے حضور گردن رکھے ہیں﴾ ام کنتم میں ام ہمزۂ انکاری کے معنی میں ہے یعنی تم ان کی وفات کے وقت موجود نہیں تھے پھر ان کی طرف ایسی باتیں کیسے منسوب کرتے ہو جو ان کی شایان شان نہیں ﴿یہ﴾ یہ تلك مبتداء ہے جس سے اشارہ حضرت ابراہیم و یعقوب علیہما السلام اور ان کی اولاد کی طرف ہے اور اسے مؤنث لایا گیا خبر کے مؤنث ہونے کی وجہ سے ﴿ایک جماعت تھی جو گزر چکی﴾ جا چکی ﴿ان کے لئے ہے جو انھوں نے کیا﴾ عمل یعنی اس کا بدلہ یہ جملہ مستانفہ ہے ﴿تمہارے لئے ہے﴾ خطاب یہود سے ہے ﴿جو تم کماؤ اور ان کے کاموں کی تم سے پرسش نہ ہوگی﴾ جیسے کہ ان سے تمہارے عمل کے متعلق پرسش نہ ہوگی یہ جملہ ماقبل کی تاکید ہے ﴿اور کتابی بولے یہودی یا نصرانی ہو جاؤ راہ پاؤ گے﴾ او تفصیل کے لئے ہے پہلے جملہ کے قائل یہود مدینہ ہیں اور دوسرے جملہ کے قائل نجران کے نصاریٰ ﴿آپ فرمائیں﴾ ان سے ﴿بلکہ﴾ ہم پیروی کرتے ہیں۔

﴿ابراہیم کے دین کی جو ہر باطل سے جدا تھے﴾ حنیفا ابراہیم سے حال ہے یعنی تمام ادیان سے منہ موڑ کر دین حق کی طرف مائل ہوئے ﴿اور وہ مشرکوں سے نہ تھے﴾

توضیح و تشریح: قولہ: ای لا. اس لفظ کو مقدر مان کر مفسر علام نے اشارہ فرمایا ہے کہ یہاں استفہام انکاری بمعنی نفی ہے اسی لئے آگے استثناء مفرغ آرہا ہے کہ وہ نفی یا معنی نفی کے بعد ہی آتا ہے۔

قولہ: جھل انھا الخ یہ سَفِهَ کے لازمی معنی کا بیان ہے اور آگے استخف سے سَفِهَ کے لغوی معنی کی طرف اشارہ ہے، حاصل یہ ہے کہ سَفِهَ بنا ہے سَفُهَ سے جس کا لغوی معنی ہے "ہلکا پن" جاہل کو اسی لئے سفیہ کہتے ہیں کہ وہ عقل کا ہلکا ہوتا ہے، یہاں جاہل ہونے یا خود کو بیوقوف بنالینے سے مراد یہ ہے کہ جو سب کچھ جانتے ہوئے بھی غور و فکر نہ کرے اور عقل سلیم کے تقاضا کے خلاف عمل کرے تو ایسا ہی شخص ملت ابراہیم سے انحراف کرسکتا ہے۔

قولہ: انقد للہ الخ یہ لفظ اَسلِم کا معنی مراد ہے یعنی اَسلِم کا عرفی معنی "اسلام لاؤ" مراد نہیں کیونکہ انبیاء کرام ہمیشہ ہی سے مومن ہوتے ہیں بلکہ لغوی معنی "اللہ کے حضور اپنے سر کو جھکا دو اور اپنا دین اس کے لئے خالص کردو" مراد ہے۔ خیال رہے کہ یہاں قال سے وحی خفی یعنی الہام مراد ہے۔ کیونکہ اس وقت آپ کی نبوت ظاہر نہ تھی (عزیزی)

قولہ: و فی قراءۃ و اوصیٰ. یہ نافع اور ابن عامر کی قراءۃ ہے مگر پہلی قراءۃ ابلغ ہے، بہر صورت آیت کا معنی

ہے کہ حضرت ابراہیم و یعقوب علیہما السلام نے اپنے بیٹوں کو بتاکید حکم دیا، چونکہ وصّی و اوصی دونوں وصیت سے بنے ہیں جس کا لغوی معنی ہے "التقدم الى الغير بفعل فيه صلاح" یعنی کسی کے سامنے کوئی اچھی بات پیش کرنا، اور اصطلاح میں تاکیدی حکم کو وصیت کہا جاتا ہے، عام ازیں کہ وصیت موت کے وقت ہو یا اس سے قبل، قولاً ہو یا اشارةً اگرچہ مشہور یہی ہے کہ وصیت موت کے وقت مرنے والے کے آخری پیغام کو کہتے ہیں، کیونکہ اس کے پورا کرنے کی سخت تاکید ہے۔

قوله: بنيه اس لفظ سے اشارہ فرمایا کہ آیت میں لفظ یعقوب کا عطف ابراہیم پر ہے لہٰذا وہ بھی مرفوع ہے اور اس کا مفعول "بنيه" محذوف ہے، یعنی ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کو اور حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کو وصیت کی۔

خیال رہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تین بیویوں سے آٹھ بیٹے تھے، حضرت ہاجرہ کے شکم سے اسمٰعیل علیہ السلام جو سب سے بڑے تھے اور حضرت سارہ کے شکم سے حضرت اسحاق علیہ السلام جو حضرت اسمٰعیل علیہ السلام سے چودہ سال عمر میں چھوٹے تھے اور قنطورا بنت یقطن کنعانیہ کے شکم سے چھ بیٹے، مدین، مدائن، زمران، یقشان، یشبق، نوح (روح البیان)

اور حضرت یعقوب علیہ السلام کی دو بیویوں اور چند لونڈیوں کے بطن سے بارہ بیٹے تھے، آپ کی بیوی "لایان" کے بطن سے چار بیٹے، روبیل، شمعون، لاوی، یہودا پیدا ہوئے اور دوسری بیوی "راحیل" سے دو بیٹے حضرت یوسف علیہ السلام اور بنیامین پیدا ہوئے باقی چھ بیٹے زیتون، یشاخر، وان، نفتالی، کاد، اشر کہ آپ کی لونڈیوں "بلہ، زلفہ" وغیرہ سے پیدا ہوئے۔ (عزیزی)

قوله: نهى عن ترك الاسلام الخ یہ دفع دخل مقدر ہے، سوال یہ پیدا ہوا کہ موت غیر اختیاری چیز ہے پھر یہاں نهى عن الموت کا کیا مطلب؟ جواب یہ ہے کہ یہاں موت سے نہی نہیں ہے بلکہ ترک اسلام سے نہی ہے اور ظاہر ہے کہ اسلام پر قائم رہنا یا اسلام کو ترک کرنا اختیاری چیز ہے۔ اور وہ اس لئے کہ چونکہ موت کا وقت آدمی کو معلوم نہیں ہے، کبھی بھی آسکتی ہے۔ لہٰذا کسی خاص حالت پر ہی مرنے کا حکم دینا اس پر ثابت قدم رہنے کا حکم دینا ہے۔

قوله: عد اسمعيل الخ یہ بھی ایک اعتراض کا جواب ہے، اعتراض یہ ہے کہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام حضرت یعقوب علیہ السلام کے باپ یا دادا نہیں تھے پھر ان کا شمار آباء میں کیوں ہوا؟ جواب یہ ہے کہ اگرچہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام حضرت یعقوب کے حقیقی باپ یا دادا تو نہیں تھے مگر چونکہ حقیقی چچا تھے اور چچا باپ کے درجہ میں ہوتا ہے اس لئے تغلیباً ان کا شمار آباء میں ہوا۔

خیال رہے کہ جب حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنی اولاد سے پوچھا کہ "میرے بعد کس کی عبادت کروگے؟" تو انھوں نے بجائے اس کے کہ کہتے اللہ کی، یا جس نے آسمان و زمین پیدا کیا ہے اس کی، کہا کہ آپ اور آپ کے آباء کے خدا کی عبادت کریں گے، اس طرز جواب میں نکتہ یہ ہے کہ اہل مصر عناصر اور ستاروں کو خالق جانتے اور ان کو خدا کہتے تھے، اگر یہ بھی مطلقاً خدا یا آسمان و زمین کا پیدا کرنے والا کہتے تو جواب مبہم رہتا اور اہل مصر کے بت پرستوں سے امتیاز نہ ہو پاتا، مگر جب کہا آپ اور آپ کے آباء و اجداد کے خدا کی، تو جواب واضح ہو گیا اور بت پرستوں سے امتیاز بھی پیدا ہو گیا۔ (حقانی)

قوله: بدل من الٰهك یہ الٰهاً واحداً کے مفہوم کا بیان ہے چونکہ الٰهك و اله آبائك سے تعدد الٰہ کا وہم پیدا ہوتا تھا اس لئے یہاں اس کا بدل الکل الٰهاً واحداً لاکر اس وہم کو دور کیا گیا۔

قوله: و ام بمعنی الخ یہ "ام کنتم" میں ام کے معنی مراد کا بیان ہے، چونکہ لفظ اَم تین معانی میں مستعمل ہے۔ (۱) کبھی صرف ہمزۂ استفہام کے معنی میں ہوتا ہے۔ (۲) کبھی صرف بل کے معنی میں (۳) کبھی دونوں کے معنی میں، مفسر علام نے یہاں پہلا معنی مراد لیا ہے یعنی یہاں ام منقطعہ استفہام انکاری کے معنی میں ہے، معنی ہوگا کیا تم یعقوب کی موت کے وقت موجود تھے؟ یعنی نہیں تھے۔ مگر بعض مفسرین نے یہاں ام کو متصلہ قرار دیا ہے، اس صورت میں ام بمعنی بل ہوگا اور معنی ہوگا بلکہ تم یعقوب کی وفات کے وقت موجود تھے یعنی تمہارے آباء واجداد یعقوب علیہ السلام کی وفات کے وقت ان کے پاس تھے ان کو علم ہے کہ یعقوب علیہ السلام نے وہی وصیت کی تھی جو ہم نے بیان کی پھر تم دیدہ ودانستہ ان پر کیوں اتہام باندھتے ہو۔ (تفسیر کبیر)

قوله: و انث لتأنیث خبره. یہ ایک شبہ کا جواب ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ یہاں تلك سے اشارہ حضرت ابراہیم و یعقوب علیہما السلام اور ان کی اولاد کی طرف ہے جس کا تقاضا تھا کہ اسم اشارہ مونث کی بجائے مذکر لایا جاتا، جواب یہ ہے کہ یہاں لفظ تلك ترکیب میں مبتداء واقع ہے جس کی خبر لفظ "امة" مونث ہے، لہٰذا خبر کی رعایت کرتے ہوئے مبتداء کو مونث لایا گیا، ترکیب یوں ہوگی تلك مبتداء "امة" موصوف، قد خلت مراد اللفظ ہو کر صفت اول اور لها ما کسبت الخ صفت ثانیہ، موصوف اپنی دونوں صفتوں سے مل کر خبر، مبتداء اپنی خبر سے مل کر جملہ اسمیہ خبریہ ہوا۔

قوله: او للتفصیل الخ یہ اشارہ اس امر کی طرف ہے کہ آیت میں لفظ او جمع کے لئے نہیں کیونکہ ایک جماعت کے لوگ دو دین کی دعوت نہیں دے سکتے بلکہ یہاں او تفصیل کے لئے ہے یعنی قالوا کے فاعل یہودی اور نصرانی دونوں ہی ہیں اور "کونوا هودا تهتدوا" یہود مدینہ کا قول ہے۔ اسی طرح "کونوا نصاریٰ تهتدوا" نجران کے عیسائیوں کا قول ہے۔

قوله: نتبع. یہ لفظ ملة کے عامل محذوف کی طرف اشارہ ہے، آگے حال الخ سے لفظ حنیفاً کے منصوب ہونے کی وجہ بیان فرمائی ہے کہ وہ لفظ ابراہیم سے حال واقع ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ لہٰذا آیت کا معنی ہوگا کہ ''ہم ان ابراہیم علیہ السلام کی پیروی کرتے ہیں جو تمام ادیان باطلہ سے منہ موڑ کر صرف خدا کی عبادت کرتے تھے۔''

فائدہ: مذکورہ بالا آیت میں تلك امة آیا ہے جس میں لفظ امت کا لغوی معنی ''جماعت'' مراد ہے کسی پیغمبر کی امت مراد نہیں، کیونکہ ابراہیم و یعقوب علیہما السلام امت والے نبی ہیں، کسی اور نبی کی امت نہیں، چونکہ یہ سارے حضرات توحید و اطاعت الٰہی اور نسب میں شریک تھے اس لئے ان سب کو ایک امت فرمایا۔ (تفسیر نعیمی)

﴿قُوْلُوْا﴾ خِطَابٌ لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا﴾ مِنَ الْقُرْاٰنِ ﴿وَ مَآ اُنْزِلَ اِلٰى اِبْرٰهِيْمَ﴾ مِنَ الصُّحُفِ الْعَشَرِ ﴿وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ وَ الْاَسْبَاطِ﴾ اَوْلَادِهٖ ﴿وَ مَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى﴾ مِنَ التَّوْرَاةِ ﴿وَ عِيْسٰى﴾ مِنَ الْاِنْجِيْلِ ﴿وَ مَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ﴾ مِنَ الْكُتُبِ وَ الْاٰيَاتِ ﴿لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ﴾ فَنُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَ نَكْفُرُ بِبَعْضٍ كَالْيَهُوْدِ وَ النَّصَارٰى ﴿وَ نَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ﴾ ۝

فَاِنْ اٰمَنُوا﴾ اَیِ الْیَهُوْدُ وَ النَّصَارٰی ﴿بِمِثْلِ﴾ مِثْلُ زَائِدَةٌ ﴿مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا وَ اِنْ تَوَلَّوْا﴾ عَنِ الْاِیْمَانِ بِهٖ ﴿فَاِنَّمَا هُمْ فِیْ شِقَاقٍ﴾ خِلَافٍ مَعَكُمْ ﴿فَسَیَكْفِیْكَهُمُ اللّٰهُ﴾ یَا مُحَمَّدُ شِقَاقَهُمْ ﴿وَ هُوَ السَّمِیْعُ﴾ لِاَقْوَالِهِمْ ﴿الْعَلِیْمُ ۝﴾ بِاَحْوَالِهِمْ قَدْ كَفَاهُ اللّٰهُ اِیَّاهُمْ بِقَتْلِ قُرَیْظَةَ وَ نَفْیِ النَّضِیْرِ وَ ضَرْبِ الْجِزْیَةِ عَلَیْهِمْ ﴿صِبْغَةَ اللّٰهِ﴾ مَصْدَرٌ مُؤَكِّدٌ لِاٰمَنَّا وَ نَصْبُهٗ بِفِعْلٍ مُقَدَّرٍ اَیْ صَبَغَنَا اللّٰهُ وَ الْمُرَادُ بِهَا دِیْنُهُ الَّذِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهِ لِظُهُوْرِ اَثَرِهٖ عَلٰی صَاحِبِهٖ كَالصَّبْغِ فِی الثَّوْبِ ﴿وَ مَنْ﴾ اَیْ لَا اَحَدَ ﴿اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً﴾ تَمْیِیْزٌ ﴿وَ نَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ ۝﴾

ترجمہ: ﴿کہہ دو﴾ یہ خطاب مؤمنین سے ہے ﴿ہم ایمان لائے اللہ پر اور اس پر جو ہماری طرف اترا﴾ یعنی قرآن پر ﴿اور جو اتارا گیا ابراہیم﴾ یعنی دسوں صحیفوں پر ﴿اور اسمٰعیل و اسحٰق و یعقوب اور ان کی اولاد کی طرف اور جو عطا کیا گیا موسیٰ کو﴾ یعنی توریت ﴿اور عیسیٰ کو﴾ یعنی انجیل ﴿اور جو عطا کئے گئے باقی انبیاء اپنے رب کے پاس سے﴾ کتابیں اور آیات ﴿ہم ان میں کسی پر ایمان میں فرق نہیں کرتے﴾ کہ یہود و نصاریٰ کی طرح بعض پر ایمان لائیں اور بعض کا انکار کردیں ﴿اور ہم اللہ کے حضور گردن رکھے ہیں تو اگر یہ بھی ایمان لائیں﴾ یعنی یہود و نصاریٰ ﴿جس طرح﴾ لفظ مثل زائد ہے ﴿تم ایمان لائے ہو جب تو وہ ہدایت پاگئے اور اگر منہ پھیریں﴾ ایمان سے ﴿تو وہ نری ضد میں ہیں﴾ تمہارے ساتھ مخالفت میں ﴿تو اے محبوب عنقریب اللہ ان کی طرف سے تمہیں کفایت کرے گا﴾ ان کی ضد کے معاملہ میں ﴿اور وہ سننے والا ہے﴾ ان کے اقوال کا ﴿جاننے والا ہے﴾ ان کے احوال کا، بے شک اللہ تعالیٰ نے ان کے معاملہ میں بنی قریظہ کے قتل اور بنی نضیر کے جلا وطن اور ان پر جزیہ مسلط کرنے کے ذریعہ حضور کی کفایت فرمائی ﴿[ہم پر] اللہ کا رنگ [چڑھا ہے]﴾ یہ مصدر ہے اٰمنا کی تاکید کے لئے اور اس کا نصب فعل مقدر کی وجہ سے ہے دراصل صبغنا اللہ ہے اس سے مراد دین فطرت ہے جس پر لوگ پیدا ہوئے کیونکہ اس کا اثر صاحب دین پر ایسے ہی ہوتا ہے جیسے کپڑے میں رنگ کا اثر ﴿اور کس کا رنگ﴾ یعنی کسی کا نہیں ﴿خوبصورت ہے اللہ کے رنگ سے﴾ لفظ صبغۃ تمیز ہے ﴿اور ہم اسی کو پوجتے ہیں﴾

توضیح و تشریح: قوله: اولاده. یہ لفظ الاسباط کا معنی مراد ہے، اس کی قدرے تفصیل یہ ہے کہ یہ سِبط کی جمع ہے جس کے لغوی معنی ہیں ''شاخوں والا درخت'' اصطلاح مین خاندان اور قبیلہ کو سبط کہتے ہیں کہ وہ بھی ایک شخص سے پھیلتا ہے، پھر سبط اس کو کہنے لگے جو قبیلہ کا اصل ہو اور قبیلہ اسی کی نسل سے ہو، قرآن کریم کی اصطلاح میں سبط کا اطلاق حضرت یعقوب علیہ السلام کے بیٹوں پر ہوتا ہے کیونکہ ان میں سے ہر ایک سے ایک قبیلہ بنا، ان میں حضرت یوسف علیہ السلام کی نبوت قطعی اور یقینی ہے، باقی کی نبوت میں اختلاف اور صحیح یہ ہے کہ وہ پیغمبر نہ تھے، لہٰذا ان کی طرف صحیفوں کے اترنے کی نسبت ایسی ہی ہے جیسے ہم مسلمانوں پر قرآن اترنے کی نسبت۔ (تفسیر کبیر، حقانی، عزیزی، تفسیر نعیمی)

قوله: مثل زائدة. چونکہ لفظ مثل سے یہ وہم پیدا ہوتا ہے کہ یہود و نصاریٰ، اللہ جل جلالہ اور رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے مثل پر ایمان لانے پر مامور تھے حالانکہ اللہ و رسول جل جلالہ و صلی اللہ علیہ وسلم اسی طرح قرآن پاک اور خود دین

اسلام بے مثل و بے مثال ہیں، اسی وہم کو دور کرنے کے لئے حضرت مفسر قدس سرہ نے لفظ مثل کو زائد قرار دیا ہے۔ لہٰذا معنی یہ ہوا کہ ''اس پر ایمان لائیں جس پر تم لائے ہو یعنی تمہاری طرح اللہ تعالیٰ کو، قرآن مقدس کو اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مانیں۔

قولہ: خلاف معکم. یہ لفظ شقاق کا التزامی معنی ہے، لغت میں شقاق کا معنی ہے ''شگاف، علیحدگی'' مشقت، مخالف چونکہ اپنے مقابل کو مشقت میں ڈالنے کی فکر کرتا ہے اس لئے مخالفت اور عداوت کو بھی شقاق کہتے ہیں، یہاں معنی ہوگا کہ ''وہ دین میں تمہارے مخالف ہیں یعنی تمہیں مشقت میں ڈالنا چاہتے ہیں۔

قولہ: کالصبغ فی الثوب. اس سے مفسر علام نے اشارہ فرمایا ہے کہ یہاں آیت میں استعارہ تصریحیہ اصلیہ ہے اس طرح کہ آثار ایمان جو ذات مومن کے ساتھ قائم ہیں ان کو تشبیہ دی گئی ہے اس پختہ رنگ سے جو کپڑے کے ساتھ قائم ہوتا ہے، وجہ شبہ ٹھہراؤ اور ظہور ہے، پھر مشبہ بہ (پختہ رنگ) کا استعارہ کرلیا گیا مشبہ (آثار ایمان) کے لئے۔

دراصل اس استعارہ کا پس منظر یہ ہے کہ یہود کی رسم تھی کہ جب کوئی ان کے دین میں داخل ہوتا تو اسے رنگین پانی سے غسل دیتے پھر عیسائیوں نے بھی اسے اختیار کرلیا کہ جب ان کے یہاں کوئی بچہ پیدا ہوتا تو اسے زرد رنگ کے پانی سے غسل دیتے جسے اصطباغ یا بپتسمہ کہا جاتا تھا اور اس پانی کا نام ماء معمودیہ تھا، غسل دینے کے بعد وہ سمجھتے کہ اب اس پر یہودیت اور عیسائیت کا رنگ چڑھ گیا ہے، لہٰذا قرآن مقدس ان کی تردید میں فرماتا ہے کہ رنگ چڑھانا ہے تو اللہ کا رنگ چڑھاؤ جو نہ پانی سے دھلے نہ دھوپ سے اڑے اور نہ وقت گزرنے پر پھیکا پڑے بھلا یہ ناپائیدار رنگ بھی کوئی رنگ ہے جس پر تم اترا رہے ہو، اور اللہ کا رنگ دین اسلام ہے لہٰذا تم اسلام قبول کرکے اللہ کے رنگ میں رنگ جاؤ کہ یہی مدار نجات ہے۔ (ضیاء القرآن ملخصاً)

قَالَ الْيَهُوْدُ لِلْمُسْلِمِيْنَ نَحْنُ اَهْلُ الْكِتَابِ الْاَوَّلِ وَ قِبْلَتُنَا اَقْدَمُ وَ لَمْ يَكُنِ الْاَنْبِيَاءُ مِنَ الْعَرَبِ وَ لَوْكَانَ مُحَمَّدٌ نَبِيًّا لَكَانَ مِنَّا فَنَزَلَ ﴿قُلْ﴾ لَهُمْ ﴿اَتُحَاجُّوْنَنَا﴾ تُخَاصِمُوْنَنَا ﴿فِی اللّٰهِ﴾ اَنِ اصْطَفٰی نَبِيًّا مِنَ الْعَرَبِ ﴿وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ﴾ فَلَهُ اَنْ يَّصْطَفِیَ مِنْ عِبَادِهٖ مَنْ يَّشَاءُ ﴿لَنَا اَعْمَالُنَا﴾ نُجَازٰی بِهَا ﴿وَ لَكُمْ اَعْمَالُكُمْ﴾ تُجَازُوْنَ بِهَا فَلَا يَبْعُدُ اَنْ يَّكُوْنَ فِیْ اَعْمَالِنَا مَا نَسْتَحِقُّ بِهِ الْاِكْرَامِ ﴿وَ نَحْنُ لَهٗ مُخْلِصُوْنَ ٥﴾ اَلدِّيْنَ وَ الْعَمَلَ دُوْنَكُمْ فَنَحْنُ اَوْلٰی بِالْاِصْطِفَاءِ وَ الْهَمْزَةُ لِلْاِنْكَارِ وَ الْجُمَلُ الثَّلٰثُ اَحْوَالٌ ﴿اَمْ﴾ بَلْ ﴿يَقُوْلُوْنَ﴾ بِالْيَاءِ وَ التَّاءِ ﴿اِنَّ اِبْرَاهِيْمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ يَعْقُوْبَ وَ الْاَسْبَاطَ كَانُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰی قُلْ لَهُمْ ءَ اَنْتُمْ اَعْلَمُ اَمِ اللّٰهُ﴾ اَیِ اللّٰهُ اَعْلَمُ وَ قَدْ بَرَّاَ مِنْهُمَا اِبْرَاهِيْمَ بِقَوْلِهٖ مَاكَانَ اِبْرَاهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَلَا نَصْرَانِيًّا وَ الْمَذْكُوْرُوْنَ مَعَهٗ تَبَعٌ لَهُمْ ﴿وَ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ﴾ اَخْفٰی مِنَ النَّاسِ ﴿شَهَادَةً عِنْدَهٗ كَائِنَةً ﴿مِنَ اللّٰهِ﴾ اَیْ لَا اَحَدَ اَظْلَمُ مِنْهُ وَهُمُ الْيَهُوْدُ كَتَمُوْا شَهَادَةَ اللّٰهِ فِی التَّوْرَاةِ لِاِبْرَاهِيْمَ بِالْحَنْفِيَّةِ ﴿وَ مَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ٥﴾ تَهْدِيْدٌ لَهُمْ ﴿تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَاكَسَبَتْ وَلَكُمْ مَاكَسَبْتُمْ وَ لَا تُسْئَلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴾ تَقَدَّمَ مِثْلُهٗ.

ترجمہ: یہود نے مسلمانوں سے کہا کہ ہم پہلے اہل کتاب ہیں اور ہمارا قبلہ بھی زیادہ پرانا ہے اور انبیاء میں سے

کوئی بھی عربوں میں سے نہ ہوا اگر محمد (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) نبی ہوتے تو ہم میں سے ہوتے اس پر یہ آیت نازل ہوئی ﴿آپ فرمایئے﴾ ان سے ﴿کیا تم جھگڑتے ہو ہمارے ساتھ﴾ ہم سے حجت بازی کرتے ہو ﴿اللہ کے بارے میں﴾ اگر اس نے ایک نبی عرب سے منتخب کرلیا ﴿حالانکہ وہ ہمارا بھی مالک ہے اور تمہارا بھی﴾ تو اسے اختیار ہے اپنے بندوں میں سے جس کا چاہے انتخاب کرے ﴿اور ہمارے اعمال ہمارے ساتھ﴾ ہمیں اس کا بدلہ ملے گا ﴿اور تمہارے اعمال تمہارے ساتھ﴾ تمہیں اس کا بدلہ دیا جائے گا تو بعید نہیں کہ ہمارے بعض اعمال ایسے ہوں جن کی وجہ سے ہم اکرام کے مستحق ٹھہرے ﴿ہم تو نرے اسی کے ہیں﴾ دین اور عمل میں نہ کہ تم لہٰذا انتخاب کے مستحق ہم ہی ہیں اور ہمزہ انکار کے لئے ہے اور تینوں جملے حالیہ ہیں ﴿بلکہ﴾ ام بمعنی بل ہے ﴿یوں کہتے ہو﴾ تقولون تا اور یا کے ساتھ ہے ﴿کہ ابراہیم واسمٰعیل، اسحاق، یعقوب اور ان کے بیٹے یہودی یا نصرانی تھے آپ فرمادیجئے﴾ ان سے ﴿کیا تمہیں علم زیادہ ہے یا اللہ کو﴾ یعنی اللہ زیادہ جاننے والا ہے اور بے شک اللہ تعالیٰ نے یہودیت ونصرانیت سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اپنے اس قول کے ذریعہ نفی فرمادی کہ ابراہیم یہودی اور نصرانی نہیں تھے اور ان کے ساتھ جو مذکور ہوئے وہ انھیں کے تابع ہیں ﴿اور اس سے بڑھ کر ظالم کون جو چھپاتا ہے﴾ لوگوں سے ﴿گواہی جو اللہ کی طرف سے اس کے پاس ہے﴾ یعنی اس سے بڑھ کر ظالم کوئی نہیں اور وہ یہود ہیں جنھوں نے اللہ کی شہادت کو توریت میں چھپایا ابراہیم علیہ السلام کی حقانیت کے متعلق ﴿اور اللہ بے خبر نہیں ہے جو تم کررہے ہو﴾ یہ بطور دھمکی ہے ﴿وہ ایک گروہ ہے کہ گزرگیا ان کے لئے ان کی کمائی اور تمہارے لئے تمہاری کمائی اور ان کے کاموں کی تم سے پرسش نہ ہوگی﴾ اس کے مثل آیت گزرچکی۔

توضیح و تشریح: قولہ: ای اللہ اعلم الخ یہ استفہام کے جواب مقدر کی طرف اشارہ ہے، آگے و المذکورون الخ سے حضرت مفسر نے ایک شبہ کا جواب دیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ مذکورہ آیت ماکان ابراھیم الخ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہودیت ونصرانیت سے براءت صرف حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لئے فرمائی ہے کیونکہ آیت میں ان کی اولاد کا ذکر نہیں، جس سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام تو یہودی یا نصرانی نہیں تھے مگر ان کی اولاد جن میں انبیاء بنی اسرائیل بھی داخل ہیں وہ یہودی یا نصرانی تھے، جواب کا حاصل یہ ہے کہ حضرت اسمٰعیل واسحاق اور یعقوب علیہم السلام اور ان کی اولاد حضرت ابراہیم علیہ السلام کے تابع ہیں، لہٰذا وہ بھی یہودی یا نصرانی نہیں تھے۔ (صاوی)

قولہ: کائنۃ اس سے حضرت مفسر نے اشارہ فرمایا ہے کہ آیت میں لفظ "عندہ" شھادۃ کی صفت اول ہے اور لفظ "من اللہ" کائنۃ محذوف کے متعلق ہوکر شھادۃ کی دوسری صفت ہے۔

قولہ: و ھم الیھود الخ یہ آیت کے ایک ترجیحی مفہوم کا بیان ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ یہاں مفہوم آیت کے سلسلہ میں مفسرین کے دو قول ہیں۔ اولاً یہ کہ اس سے مراد حضرت ابراہیم علیہ السلام کی حنفیت کا چھپانا ہے یعنی اگلی کتابوں میں اللہ تعالیٰ کی یہ گواہی موجود ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام یہودی یا نصرانی نہیں تھے مگر یہودیوں نے لوگوں سے یہ گواہی چھپائی اور مشہور کرنے لگے کہ وہ یہودی یا عیسائی تھے۔ ثانیاً یہ کہ اس سے مراد حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے وہ اوصاف ہیں جو اگلی